

تنظیم اللآلی

لشرح

عقیدۃ الطحاوی

امام اہلسنت حافظ ابو جعفر طحاوی ؒ کے رسالہ عقیدہ کی مکمل تشریح

اس میں بیان کیے ہوئے عقائد پر امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ
امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور علماء اسلام کا اتفاق ہے

تالیف

مولانا سید محمد غیاث الدین صاحب مظاہری الہ آبادی



قدیمی کتب خانہ
آرام باغ

نام کتاب: تنظیم اللآلی لشرح عقیدۃ الطحاوی

مؤلف: مولانا سید محمد غیاث الدین صاحب مظاہری الہ آبادی

کمپوزنگ: مولانا شمس الحق

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ کراچی

فون: 021-32212220
021-32212221

فہرست مضامین

تنظیم اللآلی لشرح عقیدۃ الطحاوی

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
تقریظ	9	شیوخ واساتذہ	23
پیش لفظ	12	اصحاب وتلامذہ	23
مقدمہ	15	امام طحاوی کا مسلک	23
لغوی معنی	15	علوشان وعلمی مقام	24
اصطلاحی تعریف	15	طحاوی کا مرتبہ ارباب حکومت کے یہاں	24
وجہ تسمیہ	16	امام طحاوی کے کمالات کا اعتراف	25
موضوع	16	وفات	26
غرض وغایت	16	کچھ عقیدۃ الطحاوی کے بارے میں	27
تدوین کلام	16	علم العقائد اور علم الکلام کی تعریف	32
کتب کلام وعقائد	17	اہل السنہ والجماعہ کی تعریف	32
ائمہ علم کلام وعقائد	18	امام ابوحنیفہؒ	33
امام ابوالحسن اشعریؒ	19	امام ابویوسفؒ	34
امام ابومنصور ماتریدیؒ	20	امام محمدؒ	35
حالات مصنفؒ	20	بحث توحید	36
نام ونسب	20	اقسام توحید	37
تحقیق طحا	21	قسم اول	38
سنہ پیدائش	21	قسم ثانی	38
تحصیل علم	22	مشرکین عرب وہندوغیرہ توحید ربوبیت	
سماع حدیث کے لئے سفر	22	کا اعتقاد رکھتے تھے	42

مضامین	صفحہ
قسمِ ثالث	45
الاوّل والآخر کے معنی	54
صفتِ ارادہ کا ثبوت	55
ارادہ کی دو قسمیں	56
فعل وخلق کی حقیقت	57
اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خاصہ	62
الحی القیوم کی ایک عمدہ اور نفیس تشریح	64
موت وجودی ہے یا عدمی؟	68
اللہ تعالیٰ مع اپنی صفات کے قدیم ہیں	69
صفات ذات اور صفاتِ فعل کی تعریف اور اس میں اختلاف	69
صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات	71
ایک دلچسپ مناظرہ	71
رد بر فرقہ جہمیہ ومعتزلہ	72
نوعِ حوادث کے امکان دوام میں تین اقوال ہیں	74
صفتِ علم سے متعلق ایک دلچسپ مناظرہ	80
اہل سنت کے نزدیک مقتول میت باجلہ ہے	82
صلہ رحمی درازی عمر کا سبب ہے	83
ماشاء اللہ کان ومالم یشأ لم یکن	85
نبوت کی بحث	90
نبی اور رسول کی تحقیق لغوی	92
نبی اور رسول میں فرق	92
اثباتِ نبوت	93
وحی اور رسول کی ضرورت	96
نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا اثبات	98
مسئلہ عصمتِ انبیاء	110
عصمت کی کیفیت	112
انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد	113
مسئلہ ختم نبوت	113
مسئلہ تفضیل بین الانبیاء	121
محبت کی تعریف اور اس کے درجات	124
کیا جنات میں رسول ہوئے ہیں؟	127
کیا آنحضرت ﷺ کے علاوہ اور بھی رسول جناتوں کی طرف مبعوث تھے	127
عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب	129
مسئلہ خلق قرآن	130
تنبیہ	137
مسئلہ رؤیت باری تعالیٰ	139
کیا اس دنیا میں کسی نے اللہ کو دیکھا ہے؟	141
عقل ونقل کا فرق	144
تین جماعتیں فساد کا سبب	146
منکرین رویت کا رد اور اہلِ سنت کی دلیل	149

مضامین	صفحہ
اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء جیسے الفاظ کے استعمال میں تین اقوال ہیں	151
معراج حق ہے	155
معراج روحانی تھی یا جسمانی؟	155
حوضِ کوثر حق ہے	157
شفاعت کی قسمیں	159
تقدیر ایک راز ہے	165
ایک قدری اور ایک مجوسی کا قصہ	167
ایک اور واقعہ	167
ایک سوال اور جواب	167
علم کی دو قسمیں: علم موجود اور علم مفقود	169
اوّل المخلوقات قلم ہے یا عرش؟	171
اول ما خلق اللہ القلم کی ترکیب نحوی	172
قلم چار ہیں	173
اللہ تعالیٰ کا علم کائنات پر سابق ہے	175
قلب کی بیماری دو طرح کی ہے	178
عرش و کرسی حق ہے	178
محبت اور خلت کے متعلق معتزلہ کا عقیدہ	182
جعد بن درہم کا واقعہ	183
ارکانِ ایمان	184
فلاسفہ کا مذہب	185
معتزلہ کے اصولِ خمسہ	186
شیعوں کے اصولِ اربعہ	187
اہل سنت کے نزدیک ارکانِ ایمان کی تفصیل	187
ملائکہ افضل ہیں یا انبیاء وصلحاء؟	188
انبیاء و مرسلین پر ایمان	189
انبیائے اُولوالعزم پانچ ہیں	189
آسمانی کتابوں پر ایمان	190
سب اہلِ قبلہ مسلمان ہیں	190
مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ	193
اہلِ بدعت اور اہلِ علم کا امتیازی وصف	197
ہر مومن پر رجاء لازم ہے	197
وہ امور جو رجاء کے لئے لازم ہیں	199
سزائے جہنم سے خلاصی کے گیارہ اسباب	199
توبہ اور استغفار کا فرق	200
خوف و رجاء	202
ایمان کی تعریف میں علماء کے اقوال	204
امام ابوحنیفہؒ اور ائمہ ثلاثہ کا اختلاف نزاع لفظی ہے	206
الایمان لا یزید ولا ینقص	206
ایمان اور اسلام ایک ہیں	208
استثناء فی الایمان کا مسئلہ	210
اخبارِ متواترہ و آحاد میں معتزلہ اور روافض کا اختلاف	211

مضامین	صفحہ
سب مومن اللہ کے ولی ہیں	212
ولایت کے درجات میں تفاوت ہے	213
متقی کی تعریف	214
متقین کی دو قسمیں	215
اثباتِ آخرت	216
کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف میں علماء کا اختلاف	221
نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ	223
ہمارے نزدیک نہ کسی کا ناحق خون جائز اور نہ امیر کے خلاف بغاوت جائز	225
اہلِ انصاف سے محبت اور ظالم وخائن سے بُغض کمال ایمان کی نشانی ہے	231
مسح علی الخفین اہلِ سنت کی نشانی ہے	231
ہر انسان پر چار فرشتے مامور ہیں	234
نفس اور روح کی حقیقت	235
نفس کی تین قسمیں: مطمئنہ۔ لوّامہ اور امّارہ	235
روح کی تعریف	236
روح قدیم ہے یا حادث؟ ایک سوال اور جواب	238
روح مرتی ہے یا نہیں؟	238
روح کا تعلق جسم کے ساتھ پانچ طریقہ پر ہے	239
عذاب قبر برحق ہے	240
قبر میں سوال روح اور بدن دونوں سے ہوگا	242
دار تین ہیں اور قبر عالم برزخ کو کہتے ہیں	242
سوال نکرین اس اُمت کے ساتھ خاص ہے یا نہیں؟	243
موت کے بعد قیامت تک ارواح کا مستقر کہاں ہے؟	243
بحث کی تفصیل	244
حساب اور پیشی	247
پُل صراط	248
میزان	249
میزان عمل حسی ترازو ہے	250
وزنِ اعمال کس طرح ہوگا؟	250
میزانِ پُلصراط سے پہلے ہوگی	252
افناء اور اعادہ کی کیفیت میں علماء کا اختلاف	253
جنت اور دوزخ پیدا ہوچکی ہیں	254
جنت اور جہنم کو فنا نہیں	256
ابدیت جنت	257
ابدیت جہنم	258
مسئلہ استطاعت	262

مضامین	صفحہ
افعالِ عباد، اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں	264
جبریہ کی دلیل	265
قدریہ کی دلیل	265
جبریہ کا جواب	266
قدریہ کا جواب	267
اہلِ حق کی دلیل	267
مسئلہ تکلیف	269
مسئلہ ایصالِ ثواب	272
قبروں کے پاس تلاوتِ قرآن	276
دُعا حصول منفعت اور دفع مضرت کا قوی ترین سبب ہے	277
حُبِ صحابہؓ	280
مسئلہ خلافت	288
نصب امام واجب ہے	288
شرائط امامت	289
خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ ہیں	289
خلافتِ صدیقی کا ثبوت نصوص سے	290
خلافت فاروقیؓ	292
خلافتِ عثمانی	293
حضرت علیؓ کی خلافت	295
حضرت امیر معاویہؓ اور ملوکیت (حاشیہ)	296

مضامین	صفحہ
فضائل عشرۂ مبشرہ	301
روافض کے بارہ امام	304
اصل واقعہ	304
مناقب اہلِ بیت	306
صحابہ، تابعین، محدثین اور فقہاء کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرنا واجب ہے	309
کسی بھی ولی کا مرتبہ کسی نبی سے نہیں بڑھ سکتا	311
اولیاء اللہ کی کرامات	312
معجزہ اور کرامت کی تعریف	313
خارق عادت کی تین قسمیں ہیں	314
فراست کی تین قسمیں ہیں	314
علامت قیامت پر ایمان	316
سحر کی تعریف اور اس کی حقیقت	320
سحر کی اقسام	320
سحر کے احکام شرعیہ	321
ساحر کا حکم	32
ہمارے نزدیک اجتماعیت ہی حق وصواب ہے	322
ائمہ اور مجتہدین کا اختلاف اور ان کا طرزِ عمل	324
دین صرف ایک ہے	325

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
فرقوں کا تعارف	328	جہمیہ	329
مشبہ	328	جبریہ	329
معتزلہ	328	قدریہ	329



تقریظ

حضرت مولانا سیّد صدیق احمد صاحب دامت برکاتہم

(ناظم جامعہ عربیہ ہتورا۔ باندہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم O حامداً ومصلّیاً ومسلماً

"العقیدۃ الطحاویۃ" تقریباً تمام مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہے لیکن اس کے مسائل کی جیسی وضاحت ہونی چاہئے عام طور پر لوگ ایسا نہیں کرتے نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو اہل سُنّت کے عقائد کا پورا علم نہیں ہو پاتا۔ فرقِ باطلہ کا رد تو کیا کرتے۔

اللہ پاک جزائے خیر عطا فرمائے جناب مولانا سیّد غیاث الدین الہ آبادی کو کہ انہوں نے اس ضرورت کو سامنے رکھ کر اس کی ایک بسیط شرح لکھی ہے جس میں مسائل کی توضیح اور فرقِ باطلہ کا رَد بھی کیا گیا ہے۔ اللہ پاک اس کو قبول فرمائے اور اس کی اشاعت کی غیب سے صورت پیدا فرمادے۔

احقر صدیق احمد عفی عنہ

خادم جامعہ عربیہ ہتورا۔ باندہ

تقـــریظ
حضرت مولانا محمد قمر الزمان صاحب مدظلہ

(صدر مدرس مدرسہ بیت المعارف الہ آباد)

باسمہ تعالیٰ۔ حامداً ومُصلّیاً

یہ امر محقق ہے کہ اسلام کی بنیاد صحیح عقائد پر ہے اگر یہ درست نہیں تو پھر جملہ اعمال خیر ضائع واکارت ہیں۔ اسی لئے علمائے ربانی نے تقریراً وتحریراً اس کی طرف برابر توجہ فرمائی ہے اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

بایں ہمہ مسلمانوں ہی کی ایک بڑی جماعت اس کی طرف بے اعتنائی کی شکار رہی اور کتاب وسنت کے خلاف عقائد کو گلے کا ہار بنائے رکھا اور علمائے محققین نے جب نکیر کیا تو انھیں کو متہم اور مطعون قرار دیا۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

اسی لئے مدارس اسلامیہ میں کتب عقائد کی مستقلاً تعلیم ہوتی ہے اور اس پر بحث وتحقیق ہوتی ہے ان میں سے ایک کتاب "العقیدۃ الطحاویۃ" ہے جو نصاب میں داخل ہے مگر طلبہ عموماً کم استعدادی کی بناء پر پوری طرح سمجھ نہیں پاتے۔ اشد ضرورت تھی کہ اس کا شگفتہ ترجمہ اور دلپذیر تشریح کردی جائے۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس ضرورت کو ہمارے مدرسہ بیت المعارف الہ آباد کے صدر مدرس عزیزی مولانا سید محمد غیاث الدین صاحب مظاہری نے پورا کردیا۔ بعض اہم مباحث کو سُنایا بھی جس سے پورا یقین ہے کہ یہ کتاب طلبہ ومدرّسین ہی کے لئے نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی ان شاء اللہ مؤثر ومفید ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مولانا سلمہ کو ہم سب کی طرف سے جزائے خیر دے اور اس قسم کی

مزید خدمات دینیہ انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ والسلام

محمد قمر الزمان

خادم مدرسہ بیت المعارف۔ الہ آباد۔ ۴ر صفر سنہ ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین۔

کچھ عرصہ سے مدارسِ عربیہ میں علم العقائد کی مشہور ومعروف اور مستند ومعتمد کتاب ''عقیدۃ الطحاوی'' شاملِ نصاب ہے، جوایک نہایت عمدہ متنِ متین اور اہل سنت والجماعت کے عقائدِ حقہ کے بیان پر مشتمل ہے۔اہل سنت کے تمام علماء اور بالخصوص علمائے مذاہبِ اربعہ اس پر متفق ہیں کما صرح بہ السبکی وسیاتی فی المقدمۃ۔

ہمارے مدرسہ عربیہ ''بیت المعارف'' میں بھی یہ کتاب نصاب میں داخل ہے اور ابتداء ہی سے احقر سے اس کا درس متعلق رہا، ہمیشہ اس کو پڑھاتے وقت یہ احساس رہا کہ اس کی کوئی شرح ہونی چاہئے جس میں اس کے بیان شدہ مسائل کی توضیح وتشریح مفصل اور مدلل طور پر ہو۔

عربی زبان میں اس کی ایک ضخیم شرح بلادِ عرب میں ''شرح العقیدۃ الطحاویۃ'' کے نام سے مطبوع ہے۔ اور وہاں کی جامعات میں پڑھائی بھی جاتی ہے، اس کے مصنف مشہور مفسر اور مؤرخ حافظ عمادالدین ابن کثیر (متوفی ۷۷۴ھ) کے شاگرد اور حنفی المسلک ہیں، ابھی تک ان کے نام کی صحیح تعیین نہیں ہوسکی ہے، اغلب یہ ہے کہ ان کا نام علی بن علی بن محمد ابی العز الحنفی ہے۔ نیز اس کے علاوہ بھی شروح وہاں پائی جاتی ہیں، لیکن ہندوستان میں ان میں سے کوئی بھی شرح دستیاب نہیں ہے، اس لئے بہت ضرورت تھی کہ اس کی کوئی ایسی شرح ہوجائے جو طلبہ کی ضرورت پوری کرسکے۔ اپنی علمی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے سبب خود اس کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب برسہا برس انتظار میں گذر گئے

اور باوجود اہلِ علم سے گزارش کرنے کے اب تک کوئی شرح سامنے نہ آئی تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کام کو خود ہی شروع کر دیا، اور بنیادی طور پر اسی ''شرح العقیدۃ الطحاویۃ'' کو سامنے رکھا جس کا ذکر اوپر آیا ہے اس کی وجہ سے ترتیبِ مضامین میں بہت سہولت ہوئی، اور اس کا بھی لحاظ رہا کہ عصرِ حاضر میں جو بعض فتنے پیدا ہو گئے ہیں ان کی طرف بھی اشارہ ہو جائے۔

اگر پوری تفصیل جو ذہن میں تھی لکھی جاتی تو یہ شرح موجودہ صفحات سے کم از کم دو چند ضرور ہو جاتی، لیکن اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے بقدرِ ضرورت ہی توضیح پر اکتفاء کیا گیا، اب اُمید ہے کہ ''عقیدۃ الطحاوی'' کے مسائل کے سمجھنے میں ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی دقت نہ ہوگی اور آسانی کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے عقائد ایک نظر میں سامنے آ جائیں گے۔

اگر اُردو خواں حضرات بھی ذرا توجہ کریں گے تو وہ بھی اس سے مکمل طور پر مستفید ہو سکتے ہیں، بلکہ اس دَورِ پُرفتن میں اگر اس کے سننے، سنانے کا اہتمام ہو جائے تو بہت کچھ عقائد کی اصلاح ہو جانے کی اُمید ہے۔ کیونکہ بہت سی خرابیاں اسی سبب سے پیدا ہو گئی ہیں کہ ان کے متعلق صحیح علم ہی نہیں ہے۔

بارگاہِ ربُّ العزت میں دُعا ہے کہ اس کو قبول فرمائیں اور مقبول و نافع بنائیں اور لغزشوں سے درگذر فرما کر اپنی رضا اور حصولِ نجات کا ذریعہ بنا دیں۔ (آمین)

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر یہ ذکر نہ کروں کہ احقر کے مخدوم و مربی حضرت مولانا شاہ سید حسین صاحب دامت برکاتہم [1] (آئی۔اے۔ایس مقیم علی گڑھ و ریٹائرڈ کمشنر و سابق ممبر ریونیو بورڈ حکومت یو۔پی و خلیفہ مجاز حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب شیروانی جلال آبادی و خویش حضرت مولانا سیّد سلیمان ندوی) کی نظر توجہ اور تعلیم و تربیت جس طرح ہر آن

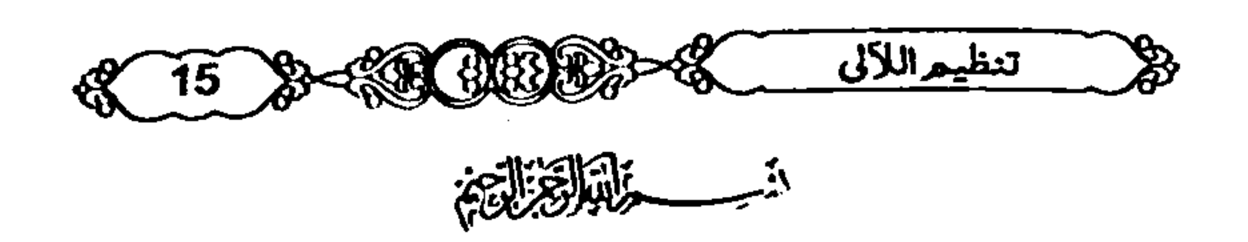
---

[1] بہت رنج و افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ابھی کتابت کے ابتدائی مراحل ہی تھے کہ حضرت سید صاحب ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ مطابق ۴ر دسمبر 1989ء دوشنبہ کی شام کو اس دارِ فانی سے دارِ باقی کی طرف رحلت فرما گئے۔

ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کرتی ہے اُسی طرح آں مخدوم ہی کی نگاہِ کرم اور مادی تعاون اس کاوشِ علمی کے زیورِ طباعت سے آراستگی کا سبب ہوئی، ورنہ بظاہر حال ابھی اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے کی کوئی صورت نہ تھی، اللہ تعالیٰ حضرت مخدوم کے سایہ کو تادیر صحت وعافیت کے ساتھ قائم رکھیں اور ان کے ذریعہ اصلاحِ اُمت کا کام دیر تک انجام پاتا رہے۔ **واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔**

نیز حضرت مولانا قاری حبیب احمد مدظلہ العالی (خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ؒ و مہتمم مدرسہ نعمانیہ الہ آباد) کا بھی ممنون ہوں کہ موصوف نے اپنے قیمتی اور مصروف وقت سے گنجائش نکال کر پورا مسودہ حرف بہ حرف نہایت توجہ کے ساتھ سنا اور اطمینان ظاہر فرمایا اور مفید مشورے بھی دیئے جس سے احقر کو بہت تقویت حاصل ہوئی، اسی طرح حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی مدظلہ العالی اور حضرت مولانا قمر الزمان صاحب مدظلہ نے اپنی رائے عالی سے تحریری طور پر مشرف فرما کر ممنون فرمایا۔ **والاجرُ عند اللہ تعالیٰ۔**

احقر سید محمد غیاث الدین مظاہری غفرلہ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ الطیبین واصحابہ الطاہرین امابعد!

احقر کا ارادہ تھا کہ علم عقائد وکلام سے متعلق ایک مبسوط مقدمہ اس شرح کے ساتھ شامل کرے لیکن اب جب کہ اس ارادہ کو قوت سے فعل میں لانے کا وقت آپہنچا تو حالات کچھ اس طرح سے درپیش ہیں کہ شاید اس کی تکمیل کی ایک مدت تک معرضِ تعویق والتواء میں رہنا پڑے، اس لئے فی الحال "مالایدرك كله لايترك كله" کے اصول کے مطابق مختصراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

اسلامی عقائد سے متعلقہ مباحث کا نام علم کلام ہے بشرطیکہ اصولِ شرعیہ سے استنباط کے ساتھ ادلہ عقلیہ سے بھی کام لیا جائے ورنہ صرف "علم العقائد" کہتے ہیں۔ علم کلام کو اصولِ دین اور علم احکام بھی کہتے ہیں۔

لغوی معنیٰ:۔

لغت میں کلام کے معنی بات، قول، گفتگو اور مضمون وغیرہ کے ہیں۔ عقائد عقیدہ کی جمع ہے دل میں جمائے ہوئے یقین اور اعتقاد کو کہتے ہیں۔

اصطلاحی تعریف:۔

قال ابوالخیر فی الموضوعات "ھو علم یقتدر بہ علی اثبات العقائد الدینیة بأیراد الحجج علیھا ودفع الشبھة عنھا" یعنی متقدمین علمائے متکلمین کی اصطلاح میں علم کلام وہ ہے جس سے ادلہ تفصیلیہ کے ساتھ عقائد دینیہ اسلامیہ کے اثبات اور ان سے دفع شکوک وشبہات پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ متاخرین کے یہاں علم کلام وہ

ہے جس میں معرفت عقائد دینیہ کے واسطے ذات وصفات باری تعالیٰ اور فلسفیات واقسام ممکنات سے بحث ہو۔

وجہ تسمیہ:۔

جس وقت اس علم کی تدوین ہوئی اُس وقت لوگوں کی عادت تھی کہ جب وہ اس فن میں گفتگو شروع کرتے تو اکثر "الکلام فی کذا و کذا" کہہ کر مسائل کے عنوانات قائم کرتے تھے اس لئے اس کا نام علم کلام ہو گیا۔ بعض حضرات نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ چونکہ اس علم کا متنازع فیہ مسئلہ کلام باری تعالیٰ کا مسئلہ تھا کہ وہ مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے؟ اس لئے اس کا نام علم کلام ہو گیا۔ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے شرح عقائد میں کچھ اور بھی وجوہ ذکر کی ہیں۔

موضوع:۔

قدماء متکلمین کے نزدیک اس علم کا موضوع صرف ذات وصفات باری تعالیٰ ہیں اور متأخرین کے نزدیک ذات وصفات سے اعم یعنی موجود و معلوم اس حیثیت سے کہ اس کا تعلق عقائد دینیہ کے ساتھ ہے۔

غرض وغایت:۔

سعادتِ دینیہ وسیادت سرمدیہ یا اصولِ شرعیہ کے موافق عقائد اسلامیہ کی صحیح معرفت حاصل کرنا۔

تدوینِ کلام:۔

جس طرح فقہ واصول فقہ میں اوّلیت کا سہرا امام اعظم ابوحنیفہؒ (متوفی سنہ ۱۵۰ھ) کے سر ہے اسی طرح علم کلام میں بھی شرفِ اولیت آپ ہی کو حاصل ہے چنانچہ آپ کی کتاب "الفقہ الاکبر" اس سلسلہ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد خلفائے عباسیہ کے تیسرے حکمران ابوعبداللہ مہدی کے دورِ خلافت (از ۱۵۵ھ تا ۱۶۹ھ) میں

کچھ کتابیں لکھی گئیں۔ پھر جب خلیفہ ہارون الرشید کے زمانہ میں بیت الحکمۃ کی وجہ سے مبتدعین اور زنادقہ نے سر اٹھایا اور غیر مسلموں نے بھی اسلام پر اعتراضات شروع کر دیئے تو اہلِ اسلام نے باضابطہ علم کلام کی تدوین اور تصنیف وتالیف شروع کر دی۔ اس دور کا سب سے پہلا مؤلف ابوالہذیل معتزلی (متوفی ۲۳۵ھ) بتایا جاتا ہے۔
(قرۃ العیون: ص: ۲۱۰۔۲۱۱)

کُتبِ کلام وعقائد:۔

بعد میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الفصل فی الملل والنحل للامام ابی محمد علی بن احمد معروف بابن حزم ظاہری متوفی ۴۵۶ھ۔

(۲) الملل والنحل للشیخ ابی الفتح محمد بن عبدالکریم شہرستانی متوفی ۵۴۷ھ۔

(۳) الرسالۃ القدسیہ بادلتہا البرہانیہ لحجۃ الاسلام ابی حامد محمد بن محمد الغزالی متوفی ۵۰۵ھ۔

(۴) محصل افکار المتقدمین والمتاخرین بین الحکماء والمتکلمین للامام فخرالدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ۔

(۵) الابانۃ عن اصول الدیانہ للشیخ ابی الحسن الاشعری متوفی ۳۲۴ھ۔

ائمہ علم کلام وعقائد

امام ابومنصور القاہر بن طاہر تمیمی بغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) نے کتاب ''اصول الدین'' میں لکھا ہے کہ اہل سنت کے سب سے پہلے متکلم صحابہؓ میں سے حضرت علی بن ابی طالبؓ ہیں۔انہوں نے خوارج سے وعدووعید کے مسائل پر اور قدریہ سے قدروقضاء اور مشیت واستطاعت کے مسائل پر مناظرہ فرمایا۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قدریہ پر کلام فرمایا۔اور طبقہ تابعین میں سے اہل سنت کے اولین متکلم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں،قدریہ کی تردید میں ان کا ایک بلیغ رسالہ ہے۔ پھر حضرت زید بن علیؒ بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب نے قدریہ پر کلام فرمایا،قدریہ کے رد میں ان کی ایک کتاب بھی ہے ،پھر حضرت حسن بصریؒ نے قدریہ پر کلام فرمایا اور ان کی مذمت پر مشتمل عمر بن العزیزؒ کو ایک خط لکھا اور جب واصل بن عطاء نے اپنی بدعت ظاہر کی تو اس کو اپنی مجلس سے برخاست کردیا۔ پھر امام شعبیؒ ہیں جو قدریہ کے معاملہ میں بہت سخت گیر تھے، پھر امام زہریؒ ہیں جنہوں نے قدریہ کے خون کے حلال ہونے کے بابت عبدالملک بن مروان کو فتویٰ دیا تھا اور اس طبقہ کے بعد حضرت جعفر بن محمد الصادقؒ کا نام ہے،ان کی ایک کتاب قدریہ کے رد میں ہے اور ایک کتاب خوارج کے رد میں اور ایک رسالہ غالی روافض کے رد میں۔ اور انہیں نے فرمایا تھا کہ ''ارادت المعتزلة اَن تُوَحِّدُ ربها فالحدت وارادت التعديل فنسبت البخل الى ربها'' (معتزلہ نے اپنے رب کی توحید ثابت کرنی چاہی تو ملحد ہو گئے اور اس کا عدل ثابت کرنا چاہا تو اپنے رب کی طرف بخل کی نسبت کردی)۔

فقہاء اور اہلِ مذاہب میں سے اہل سنت کے سب سے پہلے متکلم ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ ہیں،قدریہ کی تردید میں امام ابوحنیفہؒ کی ایک کتاب ہے جس کا نام ''الفقہ الاکبر'' ہے،اسی

طرح ان کا املاء کرایا ہوا ایک رسالہ اہل سنت کے اس قول کی نصرت میں ہے کہ استطاعت فعل کے ساتھ ہوتی ہے۔ان کے شاگرد امام ابو یوسف معتزلہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''انهم زنادقة ''(معتزلہ بے دین ہیں)اور امام شافعی کی علم کلام میں دو کتابیں ہیں: ایک کا موضوع تصحیح نبوت اور برہمنوں پر رد ہے۔اور دوسرے میں اہل اہواء کی تردید فرمائی ہے۔

(اصول الدین: ص: ۳۰۷۔۳۰۸،مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ لاہور)

اور آخر میں دو بزرگ ایسے گزرے ہیں جو عقائد میں اہل سنت والجماعت کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک امام ابوالحسن الاشعریؒ ہیں اکثر شوافع ان کے متبع ہیں۔اور دوسرے امام ابومنصور ماتریدیؒ ہیں احناف ان کے متبع ہیں۔بہت اختصار کے ساتھ ان دونوں حضرات کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

امام ابوالحسن اشعریؒ:۔

علی بن اسماعیل بن اسحاق بن اسماعیل بن عبداللہ بن بلال بن ابی بردہ بن ابی موسیٰ الاشعری جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہے۔صحابی رسول حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اولاد میں سے ہیں،اسی لئے اشعری کہلاتے ہیں،۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۴ھ میں وفات پائی۔معتزلہ کے مشہور امام ابوعلی جُبائی سے علم حاصل کیا،کہا جاتا ہے کہ چالیس سال تک معتزلہ کے امام رہے۔آخر میں ماہِ رمضان المبارک میں تین دفعہ آنحضرت ﷺ کی خواب میں زیارت نصیب ہوئی اور ہر بار آپ نے فرمایا:''اے ابوالحسن ان عقائد کی تائید کرو جو مجھ سے مروی ہیں،چنانچہ انہوں نے بتوفیقِ الٰہی اعتزال سے توبہ کر لی اور عقائد اہل سنت کی پُرزور تائید کی۔اور توبہ بھی اس شان کے ساتھ کی کہ جمعہ کے روز بصرہ کی مسجد میں منبر پر چڑھ کر بآواز بلند اعلان کیا کہ جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے اور جو نہیں پہچانتا تو وہ جان لے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں،میں خلق قرآن کا اور دنیا میں آنکھوں سے اللہ کے عدم رویت کا اور اس کا قائل تھا کہ بندے اپنے افعال کے خالق ہیں۔اور اب ان

لو کہ میں اعتزال سے توبہ کرتا ہوں۔اس کے بعد معتزلہ کے عقائد کی تردید میں سعی بلیغ فرمائی۔عقائد اہل سنت میں آپ کی مشہور کتاب ’’الابانۃ عن اصول الدیانۃ‘‘ ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی:۔

ابو منصور محمد بن محمود سمرقندی ماتریدی سنہ ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۳۳۵ھ میں وفات پائی،مقام ماترید میں پیدا ہوئے جو علاقہ سمرقند میں ایک قصبہ تھا،عَلَم الہُدیٰ (یعنی نشانِ ہدایت) ان کا لقب تھا،ماوراء النہر کے علاقہ میں اہل سنت والجماعۃ کے امام تھے،فقہ میں حنفی مسلک رکھتے تھے۔اور امام ابونصر عیاض سے شرف تلمذ حاصل تھا جو امام ابوبکر جوزجانی کے شاگرد تھے،اور ان کو امام محمد بن حسن شیبانیؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو امام اعظم ابو حنیفہؒ کے ارشد و اشہر تلامذہ میں سے ہیں بلکہ فقہ حنفی کے محافظ و امین ہیں۔
اشاعرہ اور ماتریدیہ کا کل بارہ یا تیرہ مسائل میں اختلاف ہے،لیکن اگر ان مسائل کا بغائر نظر جائزہ لیا جائے تو ان اختلافات کی حیثیت نزاع لفظی سے زیادہ نہیں رہ جاتی ہے جس سے اہل سنت کے اصول پر کوئی زد نہیں پڑتی جیسا کہ امام سبکیؒ کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے جو آئندہ سطور میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

حالاتِ مصنف

نام ونسب:۔

احمد نام،ابوجعفر کنیت،ازدی طحاوی نسبت اور والد کا نام محمد ہے۔شجرۂ نسب یہ ہے:ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ۔یہاں تک جمہور محدثین ومؤرخین کا اتفاق ہے،مؤرخ ابن خلکان نے سلمہ کے والد عبدالملک کی اور حافظ ابن عساکر نے عبدالملک کے والد سلمہ اور ان کے دادا سلیم کی بھی تصریح کی ہے۔مسلمہ بن قاسم قرطبی نے ان کے بعد کچھ اور پشتوں کا تذکرہ کیا ہے۔پورے کو ملا کر سلسلہ نسب کی تفصیل حسب ذیل ہے:
ابوجعفر احمد بن محمد بن سلام بن عبدالملک بن سلمہ بن سلیمان بن جواب الازدی الحجری

المصری الحنفی۔ازدیمن کاایک طویل الذیل قبیلہ ہےاورحجراس کی ایک شاخ ہے۔ایک دوسرے قبیلہ ازدشنوءۃ سے ممتاز کرنے کے لئے ازدحجر بولا جاتا ہے چونکہ امام طحاویؒ کاتعلق یمن کے مشہورقبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھااس لئے اس کی طرف منسوب ہوکرازدی حجری کہلاتے ہیں۔نیز آپ کے آباؤاجدادفتح اسلام کے بعدمصر میں فروکش ہوگئے تھے اس لئے مصری بھی کہلاتے ہیں۔آپ کے والدعالم اوردیندارآدمی تھے،طحاوی نے ان سے سماعت بھی کی ہے۔جس سال طحاوی کے ماموں اسماعیل مزنی کاوصال ہوایعنی ۲۶۴ھ میں تواسی سال ان کے والد نے بھی داعئ اجل کولبیک کہا۔

تحقیق طحا:۔

طحاصعیدمصر کے دیہات میں سے ایک گاؤں کانام ہے جس کی طرف منسوب ہوکرطحاوی کہلاتے ہیں،لیکن صاحب معجم البلدان کی تحقیق یہ ہے کہ امام موصوف طحاکے باشندے نہیں تھے بلکہ اس کے قریب ہی ایک مختصری آبادی جوتقریباًدس مکانات پرمشتمل تھی جس کوطحطوط کہتے ہیں اس کوامام صاحب کے وطن عزیز ہونے کاشرف حاصل ہے۔مگرآپ نے طحطوطی نسبت کوپسندنہیں فرمایابلکہ اپنے وطن سے قریبی آبادی طحاکی طرف نسبت کی۔

سنہ پیدائش:۔

سنہ پیدائش میں قدرے اختلاف ہے مورخ ابن خلکان ۲۳۸ھ اورحافظ ابن عساکر بروایت ابن یونس ۲۳۹ھ بیان فرماتے ہیں،علامہ ذہبی نے دوسرے قول کی تصحیح کی ہےاورابوالمحاسن بھی اسی طرف گئے ہیں،مگر"نخب الافکار"میں علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ سمعانی نے کہاہے کہ امام طحاویؒ کی ولادت ۲۲۹ھ میں ہوئی ہے یہی درست معلوم ہوتاہے۔ابوسعیدبن یونس کابیان ہے کہ امام طحاویؒ نے فرمایاکہ میری ولادت کاسال ۲۲۹ھ ہے۔یہ بیان حافظ ابن عساکر کے مذکورہ بالاقول سے مختلف ہے جس کووہ بھی

بروایت ابن یونس نقل کر رہے ہیں، مگر یہ اس لئے راجح معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف کے اپنے قلم سے قلمبند ہوا ہے، حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کی تائید کی ہے، حافظ ابن نقطہ نے بھی "التقلید لمعرفۃ رواۃ المسانید" میں یہی سال (۲۲۹ھ) بیان کیا ہے۔ دوسرے حضرات نے اتنی وضاحت اور کی ہے کہ ربیع الاول کی دس تاریخ اور شب یکشنبہ تھی۔

تحصیلِ علم :۔

امام طحاویؒ علم کی طلب میں اپنے مسکن سے مصر آئے اور یہاں اپنے ماموں ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی جو امام شافعیؒ کے اجل تلامذہ اور سربرآوردہ اصحاب میں تھے ان سے پڑھتے رہے اور اسی لئے ابتداء میں امام شافعیؒ کے مذہب پر رہے، مگر چند سالوں کے بعد فقہ شافعی کے بجائے فقہ حنفی کے متبع ہو گئے تھے۔

سماعِ حدیث کے لئے سفر :۔

امام طحاویؒ نے امام مزنی کے علاوہ مصر کے دیگر محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فقہ و حدیث کو حاصل کیا، بلکہ مصر میں ہر وارد ہونے والے محدث و عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کے بعد ۲۶۸ھ میں ملک شام کا رخ کیا بیت المقدس، غزہ اور عسقلان کے شیوخ سے سماعت کی۔ دمشق میں ابوحازم عبدالحمید قاضی دمشق سے ملاقات کی اور ان سے فقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد ۲۶۹ھ میں مصر واپس تشریف لائے۔ علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ جو شخص امام طحاوی کے شیوخ پر نظر ڈالے گا اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ ان کے شیوخ میں مصری، مغاربہ، یمنی، کوفی، حجازی، شامی اور خراسانی مختلف ممالک کے حضرات ہیں جن سے آپ نے اخبار و آثار کا علم حاصل کیا۔ مصر اور اس کے علاوہ دیگر شہروں کے شیوخ سے تحصیلِ علم کے لئے صحرا نوردی کی یہاں تک کہ وہ علوم جو مختلف اشخاص کے پاس پراگندہ تھے ان سب کو امام موصوف نے سمیٹ لیا اور بالآخر ایک وقت وہ آیا کہ اپنے زمانہ میں تحقیق مسائل اور دقتِ نظر کے لحاظ سے طحاوی کا کوئی مثیل نہ رہا۔

شیوخ واساتذہ:۔

آپ کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہیں۔بعض حضرات نے ان کے شیوخ کو مستقل تصنیف میں جگہ دی ہے، چنانچہ حافظ عبدالعزیز بن ابی طاہر تمیمی نے اپنی ایک تالیف میں آپ کے اساتذہ کو یکجا جمع کیا ہے۔

اصحاب وتلامذہ:۔

امام طحاویؒ کے علمی کمالات نے آپ کی ذات گرامی کو طالبانِ حدیث وفقہ کا مرجع بنادیا تھا، اختلاف ملک ومشرب کے باوجود دور دراز ملکوں سے طالبانِ علوم سفر کی صعوبتیں اُٹھا اُٹھا کر علمی استفادہ کے لئے آپ کے پاس آتے تھے۔

امام طحاویؒ کا مسلک:۔

امام طحاویؒ نے ابتدائی نشوونما کے زمانہ میں اپنے ماموں ابوابراہیم اسماعیل بن یحییٰ مزنی ہی سے فقہ حاصل کرنا شروع کیا تھا، اس لئے ابتداءً آپ امام شافعیؒ کے مقلد تھے، پھر تفقہ میں جتنا آگے بڑھتے رہے اتنا ہی انقلاب سے دوچار ہوتے رہے، اصل وفرع میں مدّوجزر کی مدافعت، اقسام واحجام کا معاملہ، نقص وابرام کی صورت، قدیم وجدید کی تقسیم ایک عجیب کیفیت تھی۔ادھر ماموں کے پاس وہ سامان نہ تھا جس سے طحاوی کی تشنگی دور ہوسکتی، آخر اس کی جستجو ہوئی کہ مسائلِ خلافیہ میں ماموں جان کیا کرتے ہیں۔معلوم ہوا کہ کثرت سے فقہ حنفی کا مطالعہ کرتے ہیں اور بہت سے مسائل میں امام شافعیؒ کے مسلک سے الگ امام اعظمؒ کے ارشاد سے ملتا جلتا فیصلہ صادر کردیتے ہیں، اور اس طرح کے تمام مسائل ایک ذاتی یادداشت (مختصر) میں جمع کرلیتے ہیں۔اب طحاوی نے بطور خود عراقی اسلوبِ فقہ کا مطالعہ شروع کیا، دل کو بھا گیا، اس کے بعد امام طحاوی نے باقاعدہ احمد بن ابی عمران سے فقہ حنفی حاصل کرنا شروع کیا جو عراق سے تشریف لائے تھے۔اس سے پہلے طحاوی بکار بن قتیبہ کی وہ تردید بھی ملاحظہ کرچکے تھے جو امام مزنی کے سلسلہ میں کی گئی تھی۔یہی وہ موڑ ہے

جہاں سے امام طحاوی پرانی راہ مسلک شافعی کو خیر باد کہتے ہوئے نئی راہ مسلک حنفی پر گامزن ہوئے۔ تبدیلی مسلک کے سلسلہ میں جو واقعہ صادقہ اوپر مذکور ہوا یہ امام طحاویؒ کا خود اپنا بیان ہے، جس کو محمد بن احمد شروطی نے آپ کی زبانی نقل کیا ہے، اس لئے یہی صحیح و معتبر اور قابلِ پذیرائی ہے۔ اس سلسلہ میں اور جو واقعات نقل کئے گئے ہیں وہ سب بے سند خلافِ درایت اور بعید از عقل ہیں۔

علوشان و علمی مقام:۔

امام طحاویؒ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ فقہ و اجتہاد میں بہت بلند مقام رکھتے تھے، قافلہ علم میں بہت کم ایسے حضرات نکلیں گے جو بیک وقت حدیث و فقہ اور اصولِ فقہ میں امام طحاوی کے کمال ہمہ دانی کی ہمسری کرسکیں۔ آپ کا شمار اعاظم مجتہدین میں ہوتا ہے، چنانچہ مُلّا علی قاری نے آپ کو طبقہ ثالثہ کے مجتہدین میں شمار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ :"اس سے مُراد وہ مجتہدین ہیں جو ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی روایت منقول نہ ہو، جیسے خصاف، ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی، شمس الائمہ سرخسی، فخر الاسلام بزدوی، فخر الدین قاضی خان وغیرہ۔ یہ لوگ امام صاحب سے اصول وفروع مخالفت نہیں کرتے، البتہ حسبِ اصول و قواعد ان مسائل کے احکام کا استنباط کرتے ہیں جن میں صاحب مذہب سے کوئی نص نہ ہو، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "مختصر طحاوی" اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ امام طحاوی مجتہد منتسب تھے محض امام ابوحنیفہ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ بہت سے مسائل میں ان کے مذہب سے اختلاف کیا ہے" اسی لئے مولانا عبدالحیٔ صاحب نے امام ابویوسف اور امام محمد کے طبقہ میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کا مرتبہ ان دونوں سے کم نہیں تھا۔

طحاوی کا مرتبہ اربابِ حکومت کے یہاں:۔

حسین بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ابوعثمان احمد بن ابراہیم اپنے زمانہ قضا میں

ہمیشہ طحاوی کو اپنے ساتھ رکھتے تھے اور سماع حدیث کا مشغلہ رہتا تھا۔ عبدالرحمن بن اسحاق جوہری کو قضاء مصر کا منصب تفویض ہوا تو ہمیشہ سواری کے موقع پر یہ معمول رہا کہ طحاوی کے بعد سوار ہونا اور بعد میں اُترنا۔ لوگوں نے کہا بھی کہ آپ قاضی وقت ہو کر ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ ہم پر یہی ضروری ہے کیونکہ طحاوی عالم اور پیشوا ہیں نیز یہ کہ وہ مجھ سے گیارہ برس بڑے ہیں، گیارہ برس تو خیر بڑی مدت ہوتی ہے اگر وہ مجھ سے گیارہ گھنٹے بھی بڑے ہوتے تب بھی محض عہدۂ قضا کی وجہ سے ان پر بڑائی جتانا مناسب نہ ہوتا۔ ایک بار طحاوی احمد بن طولون کی مجلس میں حاضر ہوئے، مجلس میں پہلے نکاح کی رسم ادا ہوئی، نکاح کے بعد خادم ایک سینی میں سو دینار اور خوشبو لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یہ تحفہ قاضی صاحب کے لئے ہے، قاضی نے طحاوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حق طحاوی کا ہے، اس کے بعد دس سینیاں گواہوں کے لئے آئیں، مگر قاضی برابر یہی کہتا رہا کہ یہ طحاوی کا حق ہے، آخر میں خود طحاوی کا ذاتی تحفہ بھی آ گیا۔ اس طرح طحاوی ایک ہی مجلس سے بارہ ہزار دینار اور خوشبو لے کر اٹھے۔

امام طحاوی کے کمالات کا اعتراف :۔

امام طحاوی کے فضل و کمال، ثقاہت و دیانت کا اعتراف ہر دَور کے محدثین و مؤرخین نے کیا ہے، ملامہ عینی ''نخب الافکار'' میں فرماتے ہیں:

> ''امام طحاوی کی ثقاہت، دیانت، امانت، فضیلت کاملہ اور علم حدیث میں
> ید طولیٰ اور حدیث کے ناسخ و منسوخ کی مہارت پر اجماع ہو چکا ہے۔
> امام طحاوی کے بعد کوئی ان کا مقام پُر نہ کر سکا''۔

ابو سعید بن یونس تاریخ علمائے مصر میں امام طحاوی کے حالات ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

> ''طحاوی صاحب ثقاہت و فقہ ہونے کے ساتھ بلا کی نظر بھی رکھتے تھے،

ان کے بعد کوئی ان جیسا نہیں ہوا"۔

مسلمہ بن قاسم قرطبی "الصلہ" میں فرماتے ہیں کہ:

"امام طحاوی ثقہ، جلیل القدر فقیہ، علماء کے اختلافی مسائل اور تصنیف وتالیف میں صاحب بصیرت تھے"۔

حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ:

"طحاوی حنفی المسلک ہونے کے باوجود تمام فقہی مذاہب پر نظر رکھتے تھے"۔

ابن جوزی "منتظم" میں فرماتے ہیں کہ: "طحاوی ثقہ، ثبت، فہیم وفقیہ تھے"۔

سبط بن الجوزی "مرآۃ الزمان" میں مذکورہ بالا جملہ دُہرانے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"طحاوی کے فضل، صدق، زہد، ورع پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے"۔

علامہ ذہبی کے الفاظ "تاریخ کبیر" میں یہ ہیں:

"فقیہ، محدث، حافظ، زبردست امام، ثقہ، ثبت اور ذی فہم"۔

علامہ سیوطی کے الفاظ ہیں:

"الامام، العلامہ، الحافظ، صاحب تصانیف، ثقہ، ثبت، فقیہ ان کے بعد کوئی ان جیسا نہ ہوا"۔

علامہ عینی نے بہت سے علماء کے اقوال نقل کئے ہیں، بہر حال یہ واقعہ ہے کہ امام طحاوی قرآن وحدیث سے استنباط وفقہ میں اپنے معاصرین ومابعد کے علماء میں نظیر نہیں رکھتے۔ انہیں "اعلم الناس بمذہب ابی حنیفہ" کہا گیا ہے۔

وفات:۔

ابن خلکان "وفیات الاعیان" میں امام طحاوی کے حالات بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: ذیقعدہ کی چاندرات تھی، جمعرات کی شب تھی کہ ۳۲۱ھ میں طحاوی نے وفات پائی

اورقرافہ میں تدفین ہوئی،قبرعام طور پر مشہور ہے،آپ کی تاریخ پیدائش مصطفیٰ (۲۲۹)، مدت عمر محمد (۹۲)اورتاریخ وفات محمد مصطفیٰ (۳۲۱) ہے۔علامہ سمعانی،ابن کثیراور حافظ سیوطی وغیرہ نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(ماخوذازظفرالمحصلین مع اختصار)

کچھ رسالہ عقیدۃ الطحاوی کے بارے میں:۔

علامہ تاج الدین سبکی شافعی (متوفی ۷۷۱ھ)فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والدالشیخ الامام عبدالکافی السبکی (متوفی ۷۵۶ھ) سے سُنا ہے وہ فرماتے تھے:

"ماتضمّنه عقيدة الطحاوى هومايعتقده الاشعرى لايخالفه الافى ثلث مسائل،قلت اناأعلم ان المالكية كلهم اشاعرة لااستثنیٰ احداً والشافعية غالبهم اشاعرة لااستثنیٰ الامن لحق منهم تجسيم اواعتزال ممن لايعبأالله به.والحنفية اكثرهم اشاعرة اعنى يعتقدون عُقَد الاشعرى لايخرج منهم الامن لحق منهم بالمعتزلة والحنابلة اكثر فضلاء متقدميهم اشاعرة لم يخرج منهم عن عقيدة الاشعرى الّامن لحق بأهل التجسيم وهم فى هذه الفرقة من الحنابلة اكثرمن غيرهم .وقدتأمّلت عقيدة ابى جعفرالطحاوى فوجدت علىٰ ماقال الشيخ الامام ،وعقيدة الطحاوى زعم انها الذى عليه ابوحنيفة وابويوسف ومحمد ولقد جوّد فيها، ثم تصفحت كتب الحنفية فوجدت جميع المسائل التى بينناوبين الحنفية خلاف فيهاثلاث عشرة مسئلة

منهامعنوی ست مسائل والباقی لفظی وتلك الستة المعنوية لاتقتضي مخالفتهم لنا ولا مخالفتنا لهم فيها تكفيراً ولاتبديعاً ،صرح بذلك الاستاذ ابومنصور البغدادي وغيره من ائمتناوائمتهم وهوغني عن التصريح لظهوره"۔

(طبقات الشافعیۃ الکبریٰ:ج:۲ص:۲۶۱و۲۶۲منقول ازترجمہ عقیدۃ الطحاوی مترجمہ مولاناعبدالحمیدسواتی)

کہ عقیدۃ الطحاوی جن عقائد پر مشتمل ہے یہ وہ عقائد ہیں جن پر امام اشعریؒ کا اعتقاد ہے ان میں سے صرف تین مسائل میں امام اشعری کا اختلاف ہے (امام سبکیؒ فرماتے ہیں کہ) میں جانتا ہوں کہ امام مالکؒ کے مقلدین سب اشاعرہ ہیں اوراس سلسلہ میں میں کسی کومستثنیٰ قرارنہیں دیتا اورامام شافعیؒ کے مقلدین کی غالب اکثریت اشاعرہ ہے بجزان کے جومجسمہ فرقہ اورمعتزلہ فرقہ سے مل گئے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کوکچھ پرواہ نہیں۔اورامام ابوحنیفہؒ کے مقلدین بھی اکثراشاعرہ ہیں بجزان کے جومعتزلہ کے ساتھ مل گئے ہیں اورامام احمد بن حنبلؒ کے مقلدین میں سے اکثرمتقدمین فضلاء اشعری العقیدہ ہیں بجزان کے جومجسمہ سے مل گئے ہیں اوران کی تعداددوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے،اورمیں نے عقیدۃ الطحاوی کوغورسے دیکھاتومعاملہ اسی طرح پایاجس طرح والد بزرگوار نے فرمایاہے اورطحاوی کاعقیدہ ان کے قول کے مطابق یہی عقیدہ ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہؒ،امام ابویوسفؒ،امام محمدؒ کاعقیدہ ہے،اورامام طحاوی نے اس رسالہ میں عقائدکوبہت ہی عمدہ طریق پرپیش کیاہے پھر میں نے علمائے احناف کے کتابوں کی ورق گردانی کی تومیں نے پایاکہ

تمام وہ مسائل جو ہمارے درمیان اور احناف کے درمیان مختلف فیہا ہیں
ان کی تعداد صرف تیرہ (۱۳) ہے،ان میں سے چھ (۶) حقیقی اور سات
(۷) صرف لفظی اختلاف پر مشتمل ہیں اور یہ جو حقیقی اختلافی مسائل ہیں
ان میں ہماری مخالفت یا ان کی مخالفت نہ تو تکفیر کا حکم لگاتی ہے اور نہ کسی
فریق پر بدعت کا حکم لگانے کا باعث ہے اس کی تصریح امام ابو منصور
بغدادی اور دوسرے علماء نے کی ہے جس میں احناف اور شوافع دونوں
کے علماء شامل ہیں اور یہ تصریح سے بے نیاز بھی ہے کیونکہ یہ بات خود
بہت ظاہر ہے۔

امام تاج الدین سبکیؒ ایک اور مقام پر ''عقیدۂ طحاویہ'' کے متعلق اپنی رائے کا اظہار
اس طرح فرماتے ہیں:

"وهذه المذاهب الاربعة ولله الحمد فى العقائد واحدة
إلّامن لَحِق منها باهل الاعتزال والتجسيم والا جمهورها
على الحق ،يقرؤون عقيدة ابى جعفر الطحاوى التى تلقاها
العلماء سلفاً وخلفاً بالقبول ويدينون الله تعالىٰ برأى
شيخ السنة ابى الحسن الاشعرى الذى لم يعارضه الا
مبتدع". (معید النعم ومبید النقم :ص: ۳۲ منقول از حوالہ بالا)

اور یہ مذاہب اربعہ بحمد اللہ تعالیٰ عقیدہ میں متفق ہیں بجز ان کے جو ان میں
سے معتزلہ یا مجسمہ کے ساتھ مل گئے ہیں ورنہ جمہور اہل مذاہب اربعہ حق
پر ہیں، یہ حضرات عقیدۂ ابی جعفر طحاوی پڑھتے ہیں جس کو علماء نے سلفا
وخلفا قبول کیا ہے، اور اسی عقیدہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے
ہیں، شیخ ابو الحسن اشعری کے رائے کے مطابق، کیونکہ ان کی مخالفت
بجز مبتدع کے کسی نے نہیں کی۔

مذکورہ بالا بیان سے ''عقیدۃ الطحاوی'' کے نہ صرف موثوق بہا اور معتمد علیہا ہونے کی شہادت ملتی ہے بلکہ اس کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہر زمانہ میں علماء نے اس کی طرف خاص اعتناء کیا ہے اور عقائد اہل سنت والجماعت کی بابت اس کتاب کو عظیم اور باوثوق ماخذ کی حیثیت دی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"قال الشیخ الامام الفقیہ علم الانام حجۃ الاسلام ابوجعفر الوراق الطحاوی المصری"۔

ترجمہ: شیخ، امام، فقیہ، علَم الانام، حجۃ الاسلام ابوجعفر وراق طحاوی مصریؒ نے فرمایا (یہ عبارت امام طحاویؒ کی کسی شاگرد یا کسی اور شخص کی جانب سے اضافہ ہے)۔

تشریح:۔ الشیخ: بڈھا، جمع شیوخ واشیاخ و مَشیخۃ، جمع الجمع مَشائخ واَشَاییخ۔ شیخ المرأۃ، شوہر، نیز شیخ کا اطلاق اُستاد، عالم، سردارِ قوم اور ہر اُس شخص پر ہوتا ہے جو لوگوں کے نزدیک علم، فضیلت اور مرتبہ کے لحاظ سے بڑا ہوتا ہے۔ الامام: (مذکر و مؤنث دونوں کے لئے) پیش امام، جس کی اقتداء کی جائے، پیشوا، واضح راستہ، امیر لشکر، خلیفہ، مصلح اور منتظم جمع ائمہ۔ الفقیہ: بہت سمجھدار، ذکی عالم، علم فقہ کا جاننے والا، جمع فقہاء۔ العَلَم: جھنڈا، اونچا پہاڑ، کپڑے کا نقش، قوم کا سردار، جمع اعلام۔ الأنام والأُنام: مخلوق۔ حُجۃ: دلیل، برہان، جمع حُجج، حِجاج۔ حجۃ الاسلام لقب تعظیمی ہے۔ الوراق: روپے، پیسے والا، کاغذ کا بیچنے والا، کاغذ بنانے والا، کاتب۔ الطحاوی: طحا کی طرف نسبت ہے، جو صعید مصر میں ایک گاؤں ہے۔

"ھذا ذکر بیان عقیدۃ اھل السنۃ والجماعۃ علی مذھب فقھاء الملّۃ ابی حنیفۃ النعمان بن ثابت الکوفی وابی یوسف یعقوب بن ابراھیم الانصاری وابی عبداللہ محمد بن الحسن الشیبانی رضوان اللہ علیھم اجمعین۔ وما یعتقدون من اصول الدین ویدینون بہ لرب العالمین"۔

ترجمہ:۔ یہ فقہائے ملت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی، ابو یوسف

یعقوب بن ابراہیم انصاری اور ابوعبداللہ محمد بن حسن شیبانی رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مذہب کے مطابق اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کا، اور دین کے جو اصول وعقائد اور پروردگار عالم کے حضور جو دین ان حضرات نے اختیار کیا تھا اس کا بیان ہے۔

علم العقائد اور علم الکلام کی تعریف:۔

تشریح:۔ العقیدۃ: جس پر پختہ یقین کیا جائے، جمع عقائد، اور اصطلاح میں اسلامی عقائد سے متعلقہ مباحث کا نام "علم العقائد" ہے۔ اور اگر اصول شرعیہ سے ان کے استنباط کے ساتھ دلائلِ عقلیہ سے بھی کام لیا جائے تو اس کو "علم الکلام" کہتے ہیں نیز علم کلام کو اصول دین، علم احکام اور "علم توحید وصفات" بھی کہتے ہیں۔ اہل السنہ والجماعۃ: سنت سے ہے۔

اہل السنہ والجماعۃ کی تعریف:۔

مُراد وہ طریقہ ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا اور جماعت سے مراد اس اُمت کے سلف صالحین یعنی صحابہ اور تابعین ہیں جو اسی حق صریح پر قائم اور مجتمع تھے جو کتاب اللہ اور سُنتِ رسول ﷺ سے ثابت ہے (شرح العقیدۃ الواسطیہ: ص:١٦) پس اہل سنت والجماعت سے مراد وہ جماعت ہے جو اس طریقہ پر قائم ہو جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان بنی اسرائیل تفرقت علی اثنتی وسبعین ملة وستفرق امتی علی ثلث واسبعین ملة کلهم فی النار الاملة واحدة قالوا من هی یارسول الله! قال ما انا علیه واصحابی رواه الترمذی وفی روایة احمد وابی داؤد وهی

الجماعة وفی روایة من کان علی السنة والجماعة۔

بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹے اور میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹے گی سوائے ایک فرقہ کے سب کے سب دوزخ میں جائیں گے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ فرقہ کون سا ہے؟ فرمایا، وہ کہ جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں (ترمذی) اور احمد کی اور ابوداؤد کی روایت میں (اس کے بجائے یہ ہے کہ) وہ جماعت ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ لوگ جو سنت اور جماعت پر ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت کا لقب حدیث شریف سے ماخوذ ہے، جو دو اجزاء سے مرکب ہے ایک سنت اور دوسرے جماعت، اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حق کا معیار دونوں اجزاء یعنی سنت اور جماعت کا مجموعہ ہے، صرف ایک جزء یعنی محض سنت یا محض جماعت حق کا معیار نہیں ہے، "معیار حق" ہونے کے لئے سنت اور جماعت میں تلازم ہے۔

(حاشیہ عقیدۃ الطحاوی: ص: ۸ از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب)

مذہب: روش، طریقہ، اعتقاد اور اصل۔ الملۃ: مذہب، شریعت۔

امام ابوحنیفہؒ:۔

ابی حنیفہ النعمان بن ثابت الکوفی": امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن مرزبان شرفائے فارس کی اولاد میں سے تھے، ۸۰ھ میں پیدا ہوئے، امام مالکؒ سے بڑے ہیں کیونکہ وہ ۹۵ھ میں پیدا ہوئے ہیں، امام اعظمؒ کی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی ہے۔ ۸۷ھ میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے اور صحابی رسول حضرت عبداللہ بن الحارثؓ کی زیارت وملاقات کا شرف حاصل کیا، ابن حجر عسقلانیؒ وغیرہ کبار محدثین کہتے ہیں کہ امام صاحب نے حضرت انس بن مالکؓ کو بھی دیکھا ہے۔ آپ اجلہ تابعین میں سے ہیں اور یہ آپ کا وہ شرف ہے جو اصحاب مذاہب اہل

اجتہاد میں سے کسی کو حاصل نہیں۔آپ نے بچپن میں خواب دیکھا تھا کہ نبی کریم ﷺ کی قبر کھود کر آپ کی ہڈیاں نکال رہے ہیں، جس کی تعبیر امام المعبرین حضرت محمد بن سیرینؒ نے یہ دی تھی کہ جس شخص نے یہ خواب دیکھا ہے اس کے ہاتھوں سنتِ نبوی کی حفاظت اور نشرواشاعت کی خدمت سارے عالم میں انجام پائے گی۔علامہ جلال الدین سیوطی شافعی کہتے ہیں کہ حدیث پاک ''لوکان العلم بالثریالتناله رجال من ابناء فارس'' (یعنی اگر علم ثریا پر ہوگا تو فرزندانِ فارس میں سے کچھ لوگ ضرور اس کو پالیں گے) کے مصداق امام ابوحنیفہؒ ہی ہیں۔آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔جن میں امام ابویوسف، امام محمد بن حسن، امام حسن بن زیاد اور امام وکیع بن الجراح وغیرہ جیسے آسمانِ علم واجتہاد کے آفتاب وماہتاب شامل ہیں۔

امام ابویوسفؒ:۔

ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاریؒ:ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے یعقوب بن ابراہیم بن حبیب بن سعد بن بجیر بن معاویہ سنہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔یہ امام ابوحنیفہؒ کے اخص اور اقرب تلامذہ اور اصحاب میں سے ہیں،ان کے پردادا سعد بن بجیر صحابی رسول تھے،غزوۂ احد میں شرکت کی آرزو رکھتے تھے لیکن جب رافع بن خدیج اور ابن عمر کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں پیش ہوئے تو آپ نے کم سنی کے سبب واپس فرمادیا،بعد میں غزوۂ خندق اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے۔رسول اللہ ﷺ نے جب سعد کو دیکھا کہ باوجود کم سنی کے نہایت شجاعت اور بہادری کے ساتھ قتال کررہے ہیں تو آپ نے تعجب کے ساتھ استفسار فرمایا کہ تم کون ہو؟عرض کیا کہ سعد ہوں،آپ نے ان کے لئے خیروبرکت کی دُعا فرمائی اور فرمایا کہ میرے قریب آؤ،وہ قریب آئے تو آپ نے اپنا دستِ مبارک ان کے سر پر رکھا،امام ابویوسف فرمایا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک کی برکت کا مشاہدہ ہم کررہے ہیں،یہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بعد میں کوفہ میں اقامت پذیر ہوگئے تھے، اور وہیں وفات پائی،ان کی نماز جنازہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔امام ابویوسفؒ

امام مالکؒ سے دو سال بڑے تھے، اسی واسطے وہ ان کے ساتھ معاصرانہ برتاؤ رکھتے تھے۔ یہ اسلام میں سب سے پہلے شخص ہیں جو قاضی القضاۃ کے لقب سے ملقب ہوئے، ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ ابو یوسف کے سوا کوئی قاضی نہیں جس کا حکم مشرق سے مغرب تک نافذ ہو۔ ابراہیم بن الجراحؒ کہتے ہیں کہ میں ان کے مرض الموت میں عیادت کے لئے حاضر ہوا تو دیکھا کہ اس وقت بھی مجلس میں علمی مباحث جاری ہیں، اتنے میں ان پر غشی طاری ہوگئی، پھر ہوش آیا تو مجھ سے کہا، ابراہیم! رمی (جمار) سوار ہو کر افضل ہے یا پیدل؟ میں نے عرض کیا کہ پیدل، فرمایا کہ نہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ اس حالت میں بھی مسائلِ علمیہ میں مشغول ہیں تو فرمایا کہ کیا مضائقہ ہے؟ ممکن ہے کہ یہی نجات کا ذریعہ بن جائے، ابراہیم کہتے ہیں کہ میں ان کی مجلس سے اُٹھ کر دروازہ ہی تک پہنچا تھا کہ معلوم ہوا کہ ان کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات ۱۸۲ھ میں ہوئی۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ شہرت کتاب الخراج کو ہے۔

امام محمدؒ:۔

ابوعبداللہ محمد بن الحسن الشیبانیؒ: ابوعبداللہ محمد بن حسن بن فرقد، ان کی نسبت شیبانی اور اصل وطن ملک شام ہے۔ آپ کی ولادت واسط میں ۱۳۲ھ میں ہوئی، آپ کے والدین مستقل طور پر کوفہ منتقل ہو گئے تھے یہیں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی، چودہ سال کی عمر میں امام اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر چار سال تک آپ سے اکتساب فیض کرتے رہے، اور امام صاحب کے انتقال کے بعد امام ابو یوسفؒ سے تکمیل کی، ان کے علاوہ امام مسعر، اوزاعی، سفیان ثوری اور امام مالکؒ سے بھی علم حدیث وغیرہ میں استفادہ کیا، آپ نے بیس سال کی عمر میں درس دینا شروع کیا، جب آپ کوفہ میں مؤطا کا درس دیتے تھے تو اس کثرت سے لوگ آتے کہ راستے بند ہو جاتے تھے، آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر خصوصی شاگردوں میں اسد بن الفراتؒ اور امام شافعیؒ ہیں، آپ کی تصانیف کی تعداد ایک ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے، امام محمد نے اپنی رات کو تین حصوں

میں تقسیم فرمایا تھا ایک حصہ سونے کے لئے، ایک حصہ نماز کے لئے اور ایک حصہ مطالعہ کے لئے، ستاون (۵۷) سال کی عمر پا کر ۱۸۹ھ میں بمقام شہر رے وفات پائی۔

قولہ: "نقول فی توحید الله معتقدین بتوفیق الله ان الله واحد لاشریك له"۔

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، عقیدۂ توحید کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں۔

تشریح: بحث توحید:۔

توحید اسلام کا رُکن اعظم، تمام انبیاء ورُسل کی اوّلین دعوت اور دین کی اساس اور بنیاد ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ"۔ (النحل:۳٦)

(اور ہم ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور شیطان کے رستہ سے بچتے رہو)۔

نیز فرمایا:

"وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ"۔ (الانبیاء:۲۵)

(اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، پس میری (ہی) عبادت کیا کرو)۔

اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"اُمِرتُ ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لا اله الا الله وان

محمداً رسول الله"۔

(مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک قتال کروں کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں)۔ بخاری و مسلم

چنانچہ تمام ائمہ سلف ؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ مکلف بندہ پر جو چیز سب سے پہلے واجب ہوتی ہے وہ "لا اله الا الله محمد رسول الله" کی شہادت ہے، جو شخص بالغ ہونے سے پہلے شہادتین کہہ چکا ہو تو بالغ ہونے کے بعد اس کو تجدید شہادت کا حکم نہ دیا جائے گا، یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے، بلکہ بلوغ کے بعد یا سن تمیز کو پہنچنے کے بعد علی اختلاف الاقوال اس کو طہارت اور نماز کا حکم کیا جائے گا۔ ایک شخص نماز پڑھتا ہے یا شعائر اور خصائص اسلام میں سے جو احکام اور عبادات ہیں ان کو بجالاتا ہے لیکن اس نے زبان سے شہادتین نہیں پڑھا تو کیا وہ مسلمان ہوگا؟ صحیح یہ ہے کہ ہر اُس چیز کے ادا کرنے سے وہ مسلمان ہو جائے گا جو اسلام کے خصائص میں سے ہے۔ توحید وہ پہلی چیز ہے جس سے انسان حریم اسلام میں داخل ہوتا ہے اور وہ آخری چیز ہے جس کو لے کر دُنیا سے رُخصت ہوتا ہے، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من کان اٰخر کلامه لا اله الا الله دخل الجنة"۔ رواه الحاکم

(جس کا آخری کلام لا اله الا الله ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا)۔

پس توحید واجبات میں سے اوّل بھی ہے اور آخر بھی، البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس سے مراد "توحید اُلوہیت" ہے۔ (از شرح العقیدة الطحاویہ)

اقسامِ توحید:۔

توحید کی تین قسمیں ہیں: (۱) الکلام فی الصفات (۲) توحید ربوبیت یعنی یہ کہ اللہ ایک ہے اور ہر چیز کا خالق ہے (۳) توحید اُلوہیت یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا اس کے مستحق ہیں کہ انہی کی عبادت کی جائے ان کا کوئی شریک نہیں۔

قسم اوّل:۔

(الکلام فی الصفات) منکرین صفات مثلاً جہم بن صفوان اوراس کے متبعین نے صفات باری تعالیٰ کا انکار کیا ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے لئے صفات ثابت کرنے سے ذات واجب کا تعدد لازم آتا ہے اور ذاتِ واجب کا تعدد محال ہے اس لئے اس کے لئے صفات کا اثبات بھی محال ہے، لیکن ان لوگوں کا یہ قول بالبداہۃ فاسد ہے کیونکہ خارج میں کسی ایسی ذات کا وجود ہی نہیں ہوسکتا جو تمام صفات سے مجرد اور خالی ہو، البتہ ذہن کبھی محال کو بھی فرض کرلیتا ہے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی ذات معطل محض ہوگی۔ انکارِ صفات کے اس عقیدہ کا اثر یہ ہوا کہ ایک فرقہ حلول اور اتحاد کا قائل ہوگیا حالانکہ یہ نصاریٰ کے کفر سے بھی بڑا کفر ہے کیونکہ نصاریٰ تو صرف مسیح علیہ السلام ہی کے حلول کے قائل ہیں اور یہ لوگ تمام مخلوق میں اس کے قائل ہیں پھر اسی انکار صفات کے عقیدہ کے نتیجہ میں یہ لوگ اس کے بھی قائل ہوئے کہ فرعون اور اس کی قوم درحقیقت مومنین کاملین اور عارفین باللہ تھے۔ اور بُت پرست راہ حق پر ہیں کیونکہ وہ بُت پرستی کرکے دراصل اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں، نیز یہ کہ ماں، بہن اور اجنبیہ، پانی اور شراب، زنا اور نکاح میں کچھ فرق نہیں ہے، کیونکہ سب ایک ہی ذات سے ہیں بلکہ سب ایک ہی ذات ہیں۔ نیز یہ کہ انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو تنگی میں ڈالا ہے، معاذ اللہ! ''وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا''۔

قسم ثانی:۔

(توحید ربوبیت) مثلاً اس کا اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا خالق ہے، اور یہ کہ دنیا کے دو صانع نہیں ہیں جو صفات اور افعال میں متساوی ہوں، کوئی بھی معروف مذہب یا فرقہ ایسا نہیں ہے جو توحید کی اس قسم کا منکر ہو، بلکہ قلوب انسانی فطرۃً اس کا اقرار کرتے ہیں۔ توحید ربوبیت کا سب سے بڑا منکر فرعون ہے لیکن وہ بھی دل میں اللہ تعالیٰ کے

وجود پر یقین رکھتا تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

"وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا". (النمل:۱۴)

(اور وہ لوگ یعنی فرعون اور اس کے ساتھی ظلم اور تکبر کی راہ سے ان (معجزات) کے (بالکل) منکر ہو گئے حالانکہ ان کے دلوں نے ان کا یقین کر لیا تھا)۔

البتہ اس زمانہ میں جدید فراعنہ کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے جو اس قدیم فرعون سے بھی جحود و تمرد میں آگے بڑھا ہوا ہے ان میں سے اکثر کا تعلق فلسفہء شیوعیت واشترا کیت (کمیونزم و سوشلزم) سے ہے، چنانچہ خُدا کا انکار کرتے ہوئے نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگرس (اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں لینن نے کہا تھا:

"یقیناً ہم خُدا کو نہیں مانتے، ہم خوب جانتے ہیں کہ ارباب کلیسا، زمیندار اور بورژوا طبقہ جو خُدا کے حوالہ سے کلام کرتے ہیں وہ محض استحصال کرنے والے کی حیثیت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ ہم ایسے تمام اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں جو انسانوں سے ماوراء کسی مافوق طاقت سے اخذ کئے گئے ہوں"۔

(لینن سلکٹڈ ورکس ماسکو ۱۹۴۷ء جلد:۲ ص:۶۶۷ بحوالہ علم جدید کا چیلنج: ص:۲۷)

ان منکرینِ خدا و مذہب کے تمرد، عناد اور مادہ پرستی نے انہیں حقیقت سے ایسا اندھا کر دیا کہ انہوں نے بدیہی کو نظری سے بھی زیادہ مشکل سمجھا اور جس میں کوئی گرہ نہ تھی اس کی اپنی طرف سے مفروضہ گرہوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ فلاسفہ کے ایک نہایت مختصر گروہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے وجود ہی میں شک کرتا ہے کہ ان کے نزدیک نہ یہاں کوئی انسان ہے اور نہ کوئی کائنات بس ایک عدم محض ہے، عام اہل علم بلکہ سارے ہی انسان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک وجود ہے اور کائنات بھی اپنا وجود رکھتی ہے، پھر جب ایک کائنات ہے تو لازماً اس کا ایک خُدا بھی ہونا چاہئے، کیونکہ یہ بالکل بے معنی بات ہے کہ ہم مخلوق کو مانیں

مگر خالق کا وجود تسلیم نہ کریں، ہمیں کسی بھی ایسی چیز کا علم نہیں جو پیدا کئے بغیر وجود میں آگئی ہو، ہر چھوٹی بڑی چیز لازمی طور پر اپنا ایک سبب رکھتی ہے۔ یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی کائنات یوں ہی وجود میں آگئی ہو، اس کا کوئی خالق نہیں۔ منکرینِ خدا کا ایک بہت پُرانا استدلال یہ ہے کہ یہ سوال کہ مجھے کس نے پیدا کیا؟ خُدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد فوراً دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ خُدا کو کس نے پیدا کیا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا اگر کوئی خالق مانیں تو اس خالق کو لازمی طور پر ازلی ماننا پڑے گا، پھر جب خُدا کو ازلی ماننا ہے تو کائنات ہی کو کیوں نہ ازلی مان لیا جائے لیکن یہ بالکل بے معنی بات ہے کیونکہ کائنات کی کوئی ایسی صفت ہمارے علم میں نہیں آئی ہے جس کی بناء پر اس کو خود اپنا خالق فرض کیا جا سکے۔ مگر اب سائنس کے حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (second law of thermoby namies) کے انکشافات کے بعد تو یہ دلیل بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکی ہے۔ یہ قانون جسے ضابطۂ ناکارگی (law of entropy) کہا جاتا ہے ثابت کرتا ہے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتی، ضابطۂ ناکارگی بتاتا ہے کہ حرارت مسلسل باحرارت وجود سے بے حرارت وجود منتقل ہوتی رہتی ہے مگر اس چکر کو اُلٹا چلایا نہیں جا سکتا کہ خود بخود یہ حرارت، کم حرارت کے وجود میں منتقل ہونے لگے، ناکارگی، دستیاب توانائی (available energy) اور غیر دستیاب توانائی (unavailable energy) کے درمیان تناسب کا نام ہے، اور اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کائنات کی ناکارگی برابر بڑھ رہی ہے اور ایک وقت ایسا آنا مقدر ہے جب تمام موجودات کی حرارت یکساں ہو جائے گی اور کوئی کارآمد توانائی باقی نہ رہے گی، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کیمیائی اور طبعی عمل کا خاتمہ ہو جائے گا اور زندگی بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جائے گی لیکن اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ کیمیائی اور طبعی عمل جاری اور زندگی کے ہنگامے قائم ہیں، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ازل سے موجود نہیں ہے، ورنہ اخراجِ حرارت کے لازمی قانون کی وجہ سے اس کی توانائی کبھی ختم ہو چکی ہوتی

اور یہاں زندگی کی ہلکی سی رمق بھی موجود نہ ہوتی۔ اسی جدید تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے ایک امریکی عالمِ حیوانات (Edward Luther Kessel) لکھتا ہے:

"اس طرح غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کائنات اپنا ایک آغاز رکھتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس نے خدا کی صداقت کو ثابت کر دیا ہے کیونکہ جو چیز اپنا ایک آغاز رکھتی ہے وہ اپنے آپ شروع نہیں ہو سکتی، یقیناً وہ ایک محرک اول، ایک خالق، ایک خدا کی محتاج ہے"۔

(The Evidence of God.p,51)

مناسب ہے کہ اس موقع پر امریکی عالم طبیعیات جارج ارل ڈیوس کے الفاظ بھی سنتے چلیں وہ کہتا ہے:

"اگر کائنات خود اپنے آپ کو پیدا کر سکتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے اندر خالق کے اوصاف رکھتی ہے، ایسی صورت میں ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ کائنات خود خُدا ہے، اس طرح اگرچہ ہم خدا کے وجود کو تو تسلیم کر لیں گے لیکن وہ نرالا خدا ہوگا جو بیک وقت مافوق الفطرت بھی ہوگا اور مادّی بھی، میں اس طرح کے کسی مہمل تصور کو اپنانے کے بجائے ایک ایسے خُدا پر عقیدہ کو ترجیح دیتا ہوں جس نے عالمِ مادّی کی تخلیق کی ہے اور اس عالم کا وہ خود کوئی جزو نہیں، بلکہ اس کا فرمانروا اور ناظم و مدبر ہے"۔

(The Evidence of God.p,71)

(ملخص از علم جدید کا چیلنج مؤلفہ وحید الدین خان تفصیل کے لئے دیکھئے اسی کتاب کو)

یہاں پر یہ واقعہ نقل کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے پاس کچھ ملحدین اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق بحث کرنے کے لئے گئے، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ

بحث سے پہلے یہ بتاؤ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ دریائے دجلہ میں ایک کشتی ہو جو خود ہی غلہ وغیرہ سامان بلا دلے، پھر خود ہی اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردے اور خود ہی آنے جانے کا سارا کام بغیر کسی چلانے والے کے انجام دے لے، ان لوگوں نے کہا کہ یہ تو قطعاً ممکن ہی نہیں، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ جب ایک معمولی کشتی کے بارے میں یہ ممکن نہیں تو اس سارے عالم اور پوری کائنات کے نظام کے بارے میں بھلا کس طرح ممکن ہے؟ اس پر وہ سب کے سب خاموش رہ گئے، سچ فرمایا مولائے حق نے: اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ والارض "۔(ابراہیم:۱۰)

مشرکین عرب وہند وغیرہ توحید ربوبیت کا اعتقاد رکھتے تھے:۔

اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کرتے چلے کہ مشرکین عرب نیز ہندوستان وغیرہ کے مشرکین توحید ربوبیت کا عقیدہ رکھتے تھے اور اس زمانہ میں بھی ہندوستان وغیرہ ممالک میں جو مشرکین ہیں ان کا عقیدہ یہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے منکر نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے مشرکینِ عرب کا عقیدہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

"وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ"۔(لقمان:۲۵)

(اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور یہی جواب دیں گے کہ اللہ نے)۔

اور فرمایا:

"قُل لِّمَنِ الارضُ وَمَن فِيهَا اِن كُنتُم تَعلَمُونَ ٥ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ قُل اَفَلَا تَذَكَّرُونَ"(المومنون:۸۵،۸۴)

آپ کہئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) یہ زمین اور جو اس پر رہتے ہیں یہ کس کے ہیں؟ اگر تم کو کچھ خبر ہے، وہ ضرور یہی کہیں گے کہ اللہ کی ہیں (تو) ان سے یہ کہئے کہ پھر کیوں نہیں غور کرتے)۔

ان کا عقیدہ یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ بُت اوران کے معبودانِ باطل خالقیت میں اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے اور اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ گزشتہ انبیاء، اور بزرگوں کے مجسمے ہیں جن کو وہ بارگاہِ الٰہی میں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھتے تھے، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے روایت ہے کہ یہ سواع، یغوث ویعوق وغیرہ نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگوں کے نام تھے، جب ان لوگوں کا انتقال ہوگیا تو ان کے ماننے والوں نے ان کی قبروں کی مجاوری اختیار کی پھر کچھ دنوں کے بعد ان کے مجسمے گھڑ لئے، اور جب اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا تو ان کی عبادت کرنے لگے اور بعد میں بعینہ یہی بُت عرب کے قبیلوں میں پھیل گئے۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے وفات سے پانچ دن پہلے ارشاد فرمایا:

"ان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبور انبیاءھم وصالحیھم مساجد الا فلاتتخذوا القبور مساجد فانی انھا کم عن ذالك"۔

(تم سے پہلے جو لوگ تھے وہ انبیاء اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیتے تھے، سن لو! تم لوگ قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا اس لئے کہ میں تم کو اس سے روکتا ہوں)۔

یہ سارے مشرکین اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے اور اس کے بھی قائل تھے کہ صانع عالم اور خالقِ کائنات دو نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ ان بتوں اور معبودانِ باطل کو بارگاہِ الٰہی میں شفیع اور سفارشی قرار دیتے تھے، قرآن کریم میں ان کے متعلق یہ بیان موجود ہے:

"وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ"۔ (الزمر:۳)

(اور جن لوگوں نے خدا کے سوا اور شرکاء تجویز کر رکھے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا

مقرب بنادیں)۔

دوسری جگہ ہے:

"وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ"۔ (یونس:۱۸)

(اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم خدا تعالیٰ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف توحید ربوبیت کے اعتقاد سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ توحید الوہیت پر بھی کامل ایمان اور اعتقاد نہ ہو، لیکن افسوس ہے کہ جس عقیدہ اور عمل کا شرک ہونا اس قدر واضح طور پر نصوص شرعیہ کے اندر موجود ہے اور جس کی اصلاح کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام اور خود سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے آج مسلمانوں کی ایک جماعت اس میں مبتلا ہے اور وہ سب کچھ اولیاء صلحاء اور بزرگوں کے مزارات کے ساتھ کر رہی ہے جو پچھلے مشرکین گذشتہ اولیاء اور صلحاء کے ساتھ کرتے تھے، مگر بقول حالی ؎

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کہے آگ کو اپنا قبلہ تو کافر
کواکب میں مانے کرشمہ تو کافر

مگر مؤمنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں

قسم ثالث:۔

(توحید الوہیت) یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی تنہا اس کے مستحق ہیں کہ انہی کی عبادت کی جائے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ توحید الوہیت ہی وہ توحید ہے جس کو لے کر انبیاء ﷺ مبعوث ہوئے اور اسی کی دعوت دی اور آسمانی کتابوں میں اسی توحید الوہیت کی تعلیم نازل ہوئی۔ جاننا چاہئے کہ توحید ربوبیت توحید الوہیت کے ضمن میں پائی جاتی ہے اس کے برعکس نہیں ہے کہ توحید الوہیت، توحید ربوبیت کے ضمن میں متحقق ہو۔ کیونکہ جو ذات مخلوق کو پیدا کرنے پر قادر نہ ہوگی تو ظاہر ہے کہ وہ عاجز ہوگی اور جو عاجز ہو وہ معبود نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ شَیۡئًا وَّ ھُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ. (الاعراف: ۱۹۱)
کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو نہ بناسکیں اور وہ خود ہی بنائے جاتے ہوں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

اَفَمَنۡ یَّخۡلُقُ کَمَنۡ لَّا یَخۡلُقُ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ. (النحل: ۱۷)
سو کیا جو پیدا کرتا ہو وہ اس جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کرسکتا پھر کیا تم (اتنا بھی نہیں سمجھتے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر کوئی توحید ربوبیت کا اقرار کرتا ہو اور توحید الوہیت کے متعلق اس کے عقیدہ میں فساد ہو، وہ صرف اللہ واحد ہی کی عبادت نہ کرتا ہو اور ماسوا اللہ کی عبادت سے بیزار نہ ہو تو وہ مشرک ہوگا۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ توحید ربوبیت کو توحید الوہیت کی دلیل کے طور پر بیان

فرماتے ہیں، کیونکہ مشرکین توحید ربوبیت کا تو اقرار کرتے تھے لیکن توحید الوہیت میں اختلاف کرتے تھے۔ اس لئے قرآن کا طرزِ استدلال یہ ہے کہ جب تم اس کا اقرار کرتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اس کے سوا نفع وضرر کا کوئی مالک نہیں کوئی اور نہ اس میں کوئی اس کا شریک ہے تو تم اس کے علاوہ دوسروں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ اور دوسرے معبود کیوں قرار دیتے ہو؟ فرماتے ہیں:

"قُلِ الْحمدُ لِله وَسَلامٌ علىٰ عِبَادِهِ الذِينَ اصطفىٰ آللهُ خيرٌ اَمّا يُشرِكُونَ اَمَّن خَلَقَ السّمواتِ والارضَ وَانزَلَ لَكُم مِن السماء مَاءً فَانبَتنَا به حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهجَةٍ مَّا كَانَ لَكُم اَن تُنبِتُوا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَعَ اللهِ بَل هُم قَومٌ يَعدِلُونَ"۔

(النمل:۵۹،۶۰)

(آپ کہئے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے سزاوار ہیں اور اس کے ان بندوں پر سلام (نازل) ہو جن کو اس نے منتخب فرمایا ہے، کیا اللہ بہتر ہیں یا وہ چیزیں جن کو شریک ٹھہراتے یا وہ (بہتر ہے) جس نے آسمان اور زمین کو بنایا اور اس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس (پانی) کے ذریعہ سے ہم نے رونق دار باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ تم ان (باغوں) کے درختوں کو اُگا سکو (یہ سُن کر بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت میں شریک ہونے کے لائق) کوئی اور معبود ہے (مگر مشرکین پھر بھی نہیں مانتے) بلکہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ (دوسروں) کو خدا کے برابر ٹھہراتے ہیں)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"قُل اَرَءَيتُم اِن اَخَذَ اللهُ سَمعَكُم وَاَبصَارَكُم وَخَتَمَ علىٰ قُلُوبِكُم مَن اِلٰه غَيرُ اللهِ يَأتِيكُم بِهِ"۔ (الانعام:۴۶)

(آپ کہئے کہ یہ بتلاؤ کہ اگراللہ تعالیٰ تمہاری شنوائی اور بینائی بالکل لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر کردے تو اللہ تعالیٰ کے سوااور کوئی معبود ہے کہ یہ تم کو پھر دے دے)۔

ایک اور مقام پر اس طرح خطاب فرماتے ہیں:

"یاَیُّھا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُم الذی خَلَقَکُم والَّذِینَ مِن قَبلِکُم لعلّکم تَتَّقُونَ"۔ (البقرۃ:۲۱)

(اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے (اس) پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، عجب نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ)۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ امر واضح ہو گیا کہ شرک فی الربوبیت تمام لوگوں کے نزدیک بالبداہۃ ممتنع ہے لیکن بایں اعتبار کہ دو یا دو سے زیادہ ایسے خالقوں کا اثبات ممتنع ہے جو تمام صفات وافعال میں متماثل اور متساوی ہوں اور بعض مشرکین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی بعض خالق ہیں جنہوں نے بعض اشیاء پیدا کی ہیں مثلاً مجوس یزداں کو خالقِ خیر اور اہرمن کو خالق شر اور فرقہ قدریہ کے لوگ تمام حیوانات کو اپنے افعال کا خالق کہتے ہیں، اور جس طرح ملحدین فلاسفہ افلاک کو متحرک بالحرکۃ الذاتیہ مانتے ہیں، یا جس طرح بعض مشرکین عرب اپنے جھوٹے معبودوں کو نفع وضرر کا مالک تصور کرتے تھے اور بہت سے مشرکینِ ہند اپنے بُتوں کے ساتھ اور بعض کلمہ گو مُردہ یا زندہ پیروں اور مزارات کے ساتھ ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اس طرح توحید ربوبیت میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس شرک پر تنبیہ کرتے ہوئے اس کے بطلان کو نہایت بلیغ اسلوب سے واضح فرمایا، ارشاد فرماتے ہیں:

"مَا اتَّخَذَ اللهُ مِن وَّلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَه مِن اِلٰہٍ اذاً لَّذَھَبَ کُلُّ اِلٰہٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعضُھُم علی بَعضٍ"۔ (المومنون:۹۱)

(اللہ تعالیٰ نے کسی کو اولاد نہیں قرار دیا اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو (تقسیم کر کے) جدا کر لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا)۔

اس لئے کہ معبود حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ خالق بھی ہو اور فاعل بھی اپنی عبادت کرنے والے کو نفع پہنچانے اور اس سے ضرر دور کرنے پر قادر ہو۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی معبود ہوتا جو اس کے ملک میں شریک ہوتا تو وہ بھی ضرور خالق اور فاعل ہوتا اور ان دونوں میں سے ہر ایک شرکت کو گوارا نہ کرتا، بلکہ اگر اس دوسرے کو مغلوب کرنے پر قدرت رکھتا تو اسے مغلوب کر لیتا اور اگر مغلوب نہ کر سکتا تو اپنی مخلوق کو لے کر علیحدہ ہو جاتا جس طرح دُنیا کے بادشاہوں کا دستور ہے کہ یا تو دوسرے بادشاہ کو مغلوب کر کے اپنی رعیت میں شامل کر لیتے ہیں یا پھر اپنے حصہ ملک کو لے کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ تین حال سے خالی نہیں (۱) یا تو یہ کہ ہر "الٰہ" اپنی مخلوق اور ملک کو لے کر علیحدہ ہو جائے (۲) یا ایک دوسرے پر چڑھائی کرے (۳) یا سب کے سب ایک ہی ذات کے ملک و تصرف کے تحت ہوں وہی ایک جس طرح چاہے ان کے اندر تصرف کرے اور باقی سب اس کے سامنے بے بس اور عاجز ہوں، وہ ذات تنہا الٰہ، معبود اور رب ہو اور باقی سب اس کے بندے، مربوب اور تابع فرمان ہوں۔

جب یہ بات ہے تو ساری کائنات کا یہ مستقل نظام جو بغیر کسی اختلال و فساد کے چل رہا ہے اور سارے عالم کے لوگ بھی مل کر جس کے اندر کسی ادنیٰ تغیر و تبدیلی کرنے پر قادر نہیں ہیں، اس امر کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح دلیل ہے کہ اس عالم کا نظام چلانے والا صرف ایک ہی ذات ہے، وہی اس کا مالک، خالق اور رب ہے، پس جس طرح یہ ناممکن اور محال ہے کہ عالم کے دو خالق اور دو رب ہوں اسی طرح یہ بھی محال ہے کہ اس میں دو معبود ہوں جن کی پرستش کی جائے، کیونکہ اوپر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مستحق عبادت صرف وہی ہے جو خالق اور رب ہو اور جب خالق اور رب دو نہیں ہو سکتے

تو معبود بھی دو نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا". (الانبیاء:۲۲)

(زمین (یا) آسمان میں اگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے)۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

وفی کل شیء له آیةٌ
تدل علی انه واحدٌ

ترجمہ: کائنات کی ہر ہر چیز میں اس کی نشانی موجود ہے کہ اللہ واحد ہے۔

قوله: "ولاشئ مثله".

ترجمہ: اور کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

تشریح:۔ اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے مثل نہیں، نہ ذات میں نہ صفات میں اور نہ افعال میں، قرآن کریم اور عقلِ سلیم اس کی نفی کرتی ہے کہ کوئی بھی مخلوق اللہ تعالیٰ کے خصائص میں سے کسی کے ساتھ متصف ہو یا اس کی کسی صفت میں اس کے مثل ہو۔ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" (شوریٰ:۱۱) (کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات سُننے والا دیکھنے والا ہے) "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شئ" میں تو فرقہ مُشبہ پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے، اور "هُوَ السميع العليم" میں فرقہ معطلہ پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے کسی صفت کے قائل ہی نہیں ان کے نزدیک بندے جن صفات کے ساتھ متصف ہیں وہ صفات اللہ کے لئے ثابت نہیں ہیں، چنانچہ اس فرقہ معطلہ جہمیہ کا زعم باطل (معاذ اللہ!) یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے علم، قدرت، حیات، سمع اور بصر نہیں ہے، جس سے یہ صراحۃً لازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم، قادر، حی، سمیع اور بصیر نہیں ہے "تعالی الله عن ذالك علواً كبيراً" لیکن انہوں نے صاف صاف یہی بات اس نے نہیں کہی کہ حکومتِ اسلامیہ کی

4

طرف سے سخت نکال وعذاب کا خوف دامنگیر تھا، بڑے مزہ کی بات ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ کا تو انکار کرتے ہیں لیکن اسمائے حسنیٰ عالم، سمیع وبصیر وغیرہ کا اقرار کرتے ہیں اور وجہ وہی ہے کہ صاف طور پر ان کا انکار کرنے سے خوف شمشیر مانع تھا، چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ مثلاً عالم وغیرہ ہونے کے منکر نہیں تھے اس لئے ان سے کہا جائے گا کہ جب تمہارے نزدیک اللہ کے لئے علم وغیرہ صفات ثابت نہیں ہیں تو تم نے یہ کیسے جانا کہ اللہ عالم ہے اُس کا جواب اُن کی طرف سے یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت "إِنَّه بِكُلِّ شيءٍ عَلِيم" (الشوریٰ:۱۲) سے معلوم ہوا اس کا جواب اہل سنت کی طرف سے یہ ہے کہ اسی قرآن کی آیت یہ بھی ہے کہ: "أَنْزَلَه بِعِلْمِه" (النساء:۱۶۶) جس سے اللہ کے لئے صفت علم کا ثبوت ہوتا ہے، اور قرآن ہی میں یہ بھی ہے "أَوَلَم يَرَوا أَنَّ اللهَ الذى خَلَقَهُم هُوَ أَشَدُّ مِنهُم قُوَّةً" (حٰم سجدہ:۱۵) (کیا ان کو یہ نظر نہ آیا کہ جس خدا نے ان کو پیدا کیا وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ ہے) جس سے اللہ کے لئے قوت کا ثبوت ہوتا ہے، پس جب تم اسمائے حسنیٰ کا انکار اس لئے نہیں کرتے کہ کتاب اللہ میں ان کا ذکر ہے تو ان صفات کا انکار کس طرح کرتے ہو جبکہ ان کا ذکر بھی کتاب اللہ میں موجود ہے۔

دراصل ان کی غلط فہمی کا منشاء ان کا یہ وہم ہے کہ ان سارے اسمائے عامہ کا مسمیٰ مطلق کُلی ہے یعنی علم وقدرت وحیات وغیرہ اسماء کے مسمیات مطلق کلی ہیں لہٰذا جب یہ ایک شخصِ معین میں پائے جائیں گے تو دوسرے شخص معین میں بھی بعینہ وہی پائے جائیں گے، حالانکہ ان کا یہ وہم صحیح نہیں ہے، کیونکہ جو چیز خارج میں پائی جاتی ہے وہ مطلق کلی نہیں ہوتی، بلکہ وہ ایک معین خاص ہوکر ہی پائی جاتی ہے، پس جب اللہ تعالیٰ نے یہ نام رکھا تو ان کے مسمیٰ معین اور خاص ہوں گے، جب بندہ کا نام رکھیں گے تو اس کا مسمیٰ بندہ کے ساتھ خاص ہوگا اور جب اللہ کے لئے ہوگا تو اس کا مسمیٰ اللہ کے ساتھ خاص ہوگا پس اللہ کے وجود وحیات وغیرہ میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوگا، بلکہ اس موجود معین کے وجود میں بھی جو مخلوق ہے کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوسکتا، تا بہ وجود خالق چہ رسد؟

قولہ: "ولا شیء یُعجزہ"۔

ترجمہ: اور کوئی چیز اس کو عاجز نہیں کرسکتی۔

تشریح:۔ کیونکہ عجز مستلزم ہے نقص فی القدرت کو اور اللہ تعالیٰ کامل القدرت ہیں، ارشاد ربانی ہے:

"وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعجِزَہ مِن شيءٍ فی السَّمٰوٰت وَلَافِي الارضِ اِنّه كَانَ عَلِيماً قَدِيراً"۔(فاطر:۴۴)

(اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو عاجز کردے نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑا علم والا (اور) بڑی قدرت والا ہے)۔

نیز فرمایا:

"اِنَّ اللهَ علىٰ كُلِّ شيءٍ قَدِيرٌ"۔(البقرۃ:۲۰)

(بلاشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں)۔

اور ارشاد فرماتے ہیں:

"وَسِعَ كُرسِيُّهُ السمٰوٰت وَالارضَ وَلَايَئُودُه حِفظُهُمَا وَهُوَ العَلِيُّ العَظِيمُ"۔(البقرۃ:۲۵۵)

(اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی اور وہ عالی شان اور عظیم الشان ہے)۔

کتاب وسنت میں جہاں کہیں صفات باری تعالیٰ کی نفی آئی ہوئی ہے درحقیقت اس سے نفی صفات مقصود نہیں ہے بلکہ ان صفات منفیہ کی ضد جو صفات ہیں ان کو بدرجہ کمال ثابت کرنا مقصود ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَلَا يَظلِمُ رَبُّكَ اَحَداً"۔(الکہف:۴۹)

(اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا)۔

اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے کمالِ عدل کا اثبات ہے، اسی طرح فرماتے ہیں:

"لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ"۔ (البقرہ:۲۵۵)

(نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے نہ نیند)۔

اس سے مقصود کمال صفت حیات اور کمال صفت قیومیت کا اثبات ہے وقس علی ذالک۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اثباتِ صفات کا بیان تو تفصیل کے ساتھ ہے لیکن نفیِ کا بیان اجمال اور اختصار کے ساتھ ہے۔ البتہ اہلِ کلام معتزلہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ نفیِ صفات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور اثبات صفات کو اجمال کے ساتھ، مثلاً یہ کہتے ہیں کہ اللہ جسم نہیں ہے، صورت نہیں ہے، گوشت نہیں ہے، خون نہیں ہے، عرض نہیں ہے، اور طول وعرض وعمق والا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن تنزیہ باری تعالیٰ کا یہ اسلوب جس میں نفی محض ہو مدح کا طریقہ نہیں ہے بلکہ اس میں اساءتِ ادب اور بے ادبی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہئے: کوئی شخص بادشاہ سے یہ کہے کہ آپ موچی نہیں ہیں، آپ قلی نہیں ہیں، آپ مزدور نہیں ہیں، آپ چور نہیں ہیں اور آپ رکشہ چلانے والے نہیں ہیں تو اگر چہ یہ کہنے والا اپنی ان تمام باتوں میں سچا ہے اور یقیناً بادشاہ ان تمام صفات سے خالی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا یہ طریقِ گفتگو مدح کے بجائے گستاخی اور بے ادبی سمجھا جائے گا، ایسے موقع پر ادب وتہذیب کی بات یہ ہے کہ اجمال کے ساتھ ان صفات کی نفی کی جائے اور یوں کہا جائے کہ بادشاہ سلامت کوئی رعایا تھوڑا ہی ہیں بلکہ سلطنت کے مالک اور صاحب اقتدار واختیار ہیں کیونکہ یہ موقع ایسا ہی ہے کہ یہاں نفیِ صفات میں اجمال ہی مقتضائے ادب ہے۔ پس اسی طرح اللہ تعالیٰ سے صفات کی نفی میں اجمال ہی اختیار کرنا مقتضائے ادب ہے اور اس کے خلاف کرنا بے ادبی اور بد تہذیبی۔ اب یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ امام طحاویؒ کا قول "ولا شئ یعجزہ" بھی تو اسی نفی صفات کے قبیل سے ہے، اس

کا جواب یہ ہے کہ مصنف امامؒ کی یہ نفی نفی مذموم نہیں ہے، کیونکہ بالکل اسی طرح کی نفی خود کتاب اللہ کے اندر موجود ہے چنانچہ اوپر آیت گزر چکی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعۡجِزَهٗ مِنۡ شَىۡءٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيۡمًا قَدِيۡرًا"۔(فاطر:۴۴)

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے عاجز نہ ہونے کی دلیل بھی بیان فرمادی کہ چونکہ اللہ علیم، قدیر، کمال علم وقدرت والا ہے اس لئے وہ جو کچھ کرنا چاہے اس کے نفاذ سے عاجز نہیں ہے، کیونکہ عجز یا تو ضعف و کمزوری کے سبب ہوتا ہے یا بے علمی اور کم علمی کے سبب اور جب یہ دونوں صفات بدرجہ کمال ثابت ہیں تو اس کی ضد عجز کی نفی ہوجائے گی ورنہ اجتماعِ ضدّین لازم آئے گا۔

قولہ:"ولا الٰہ غیرہ"۔

ترجمہ: اور اس کے سوا کوئی معبود (عبادت کئے جانے کے لائق) نہیں۔

تشریح:۔یہی وہ کلمہ توحید ہے جس کی دعوت تمام پیغمبروں نے دی ہے، نفی واثبات کے ساتھ بطریق حصر توحید کا اثبات اس لئے کیا گیا کہ اثبات مجرد میں دوسرے کا بھی احتمال راہ پاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حق تعالیٰ نے فرمایا:

"وَاِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ"۔(البقرۃ:۱۶۳)

(اور جو تم سب کا معبود بننے کا مستحق ہے وہ تو ایک ہی معبود ہے)۔

تو اس کے بعد ہی یہ بھی فرمایا:

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِيۡمُ"۔(البقرۃ:۱۶۳)

(اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی رحمٰن ہے اور رحیم ہے)۔

قولہ:"قدیم بلا ابتداء، دائم بلا انتہاء"۔

ترجمہ: ہمیشہ سے ہے جس کی کوئی ابتداء نہیں اور ہمیشہ رہے گا جس کی

کوئی انتہاء نہیں)۔

تشریح: الاول والآخر کے معنیٰ:۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "هُوَ الاوَّلُ وَالاٰخِرُ" (الحدید: ۳) (وہی اول ہے اور وہی آخر) یعنی نہ اس پر عدم سابق طاری ہوا ہے اور نہ عدم لاحق طاری ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک ہے:

"اللّٰهم انت الاول فليس قبلك شئ وانت الاٰخر فليس بعدك شئ"۔ رواه مسلم

(اے اللہ! تو ہی اوّل ہے تجھ سے پہلے کچھ نہیں اور تو ہی آخر ہے تیرے بعد کچھ نہیں)۔

امام طحاویؒ کا قول "قديم بلا ابتداء دائم بلا انتهاء" درحقیقت اسمائے حسنیٰ "الاوّل" اور "الآخر" کے معنیٰ کی وضاحت ہے، کیونکہ اوّلیت مطلقہ اس کو کہتے ہیں جس کے ابتداء کی کوئی حد نہ ہو جس کو "ازل" کہتے ہیں اور اصطلاح اہل کلام میں اسی کو "قدیم" کہتے ہیں اور آخریتِ مطلقہ سے مُراد وہ ہے جس کے انتہاء کی کوئی حد نہ ہو جس کو "ابد" کہتے ہیں اور اصطلاح میں اس پر اسم "دائم" کا اطلاق ہوتا ہے۔ "قدیم" اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے نہیں ہے، بلکہ اہلِ کلام نے اس کو اللہ تعالیٰ کے اسماء میں داخل کیا ہے، شریعت میں حق تعالیٰ کا نام "الاوّل" آیا ہے اور یہ قدیم کی بہ نسبت اولیٰ وانسب ہے، کیونکہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ سب اسی کی طرف راجع اور اس کے تابع ہیں برخلاف قدیم کے کہ اس میں اس کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا۔

قوله: "لايفنى ولايبيد"۔

ترجمہ: وہ فنا اور ہلاک نہیں ہوگا۔

تشریح:۔ یہ جملہ، جملہ سابقہ "دائم بلا انتهاء" کی تاکید ہے اسی طرح "فنا اور بَید" دونوں ہی کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں یعنی ہلاک ہونا تاہم تاکید کے لئے دونوں

الفاظ کو ذکر فرمایا۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

-کُلُّ مَن عَلَيهَا فَانٍ وَيَبقىٰ وَجهُ رَبِّك ذُوالجَلا لِ والاکرَامِ-۔ (الرحمن:۲۶،۲۷)

(جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی)۔

اور فرمایا:

-کُلُّ شيءٍ هَالِكٌ اِلاّ وَجههٗ-۔ (القصص:۸۸)

(سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے)۔

اور اس لئے کہ حق تعالیٰ واجب الوجود ممتنع العدم ہیں لہذا وجود کا حق تعالیٰ کی ذات سے منفک اور علیحدہ ہونا ممتنع اور محال ہے اس لئے اس کے لئے بقاء ابدی واجب ہے اور ایک آن کے لئے بھی اس کا فنا ممکن نہیں۔

قولہ:-ولایکون الامایرید۔

ترجمہ: وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

تشریح: صفت ارادہ کا ثبوت:۔

یہ معتزلہ کا رد ہے، ان کا زعم باطل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سارے لوگوں سے ایمان کا ارادہ کیا اور کافر نے کفر کا ارادہ کیا اللہ کا ارادہ نہ ہوا اور کافر کا ارادہ ہو گیا، تعالی اللہ عن ذالك علواً کبیراً، معتزلہ کا یہ قول کتاب وسنت اور عقل سلیم کے خلاف ہے۔ اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ ہر چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور اگرچہ کفر ومعصیت کا بھی ارادہ کرتے ہیں لیکن یہ ارادہ تقدیری وتکوینی ہوتا ہے نہ کہ تشریعی، چنانچہ نہ اس کو پسند فرماتے ہیں، نہ اس سے راضی ہوتے ہیں اور نہ اس کا حکم دیتے ہیں بلکہ اس کو ناپسند فرماتے ہیں اور اس پر ناراض ہوتے ہیں، اور یہی تمام سلف کا مذہب ہے کہ: "ماشاء اللہ کان ومالم یشاء لم یکن" (یعنی جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا)۔

ارادہ کی دو قسمیں ہیں:

محققین علمائے اہل سنت فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ میں جو ''ارادہ'' آیا ہوا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں: (۱) ارادۂ تکوینیہ (۲) ارادۂ شرعیہ۔ ارادۂ تکوینیہ سے مُراد وہ مشیت ہے جو تمام موجودات کو شامل اور عام ہے خواہ وہ حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہو یا ناپسندیدہ مثلاً آیت کریمہ:

"فَمَن يُرِدُ اللهُ اَن يَهدِيَه يَشرَح صَدرَه لِلاسلامِ وَمَن يُرِد اَن يُضِلَّه يَجعَل صَدرَه ضَيِّقاً حَرَجاً كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السماء". (الانعام:۱۲۵)

(سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کے لئے کُشادہ کر دیتے ہیں اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں جیسے کوئی آسمان میں چڑھتا ہے)۔

اور مثلاً فرمایا: "وَلٰكِنَّ اللهَ يَفعَلُ مَا يُرِيدُ". (البقرہ:۲۵۳)

(لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں)۔

اور ارادۂ شرعیہ سے مراد وہ ہے جو حق تعالیٰ کے نزدیک محبوب، مرضی اور پسندیدہ ہے مثلاً آیت کریمہ:

يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ اليُسرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ العُسرَ". (البقرہ:۱۸۵)

(اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دُشواری منظور نہیں)۔

اور فرمایا:

"يُرِيدُ اللهُ لِيُبَيِّنَ لَكُم وَيَهدِيَكُم سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبلِكُم وَيَتُوبَ عَلَيكُم وَاللهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ وَاللهُ يُرِيدُ اَن يَتُوبَ

عَلَیکُم وَیُرِیدُ الذین یَتَّبِعُونَ الشَّھَواتِ اَن تَمِیلُوامَیلاً عظیماً ○ یُرِیدُ اللهُ اَن یُخَفِّفَ عَنکُم وَخُلِقَ الانسانُ ضَعیفاً"۔(نساء:۲۸،۲۷،۲۶)

(اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم سے بیان کردے اور تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتادے اور تم پر توجہ فرمادے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں، بڑے حکمت والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو تو تمہارے حال پر توجہ فرمانا منظور ہے اور جو لوگ کہ شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ، اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ تخفیف منظور ہے اور آدمی کمزور پیدا کیا گیا ہے)۔

فعل وخلق کی حقیقت:۔

چونکہ مسئلہ زیر بحث کا تعلق مسئلہ تقدیر سے ہے جس کا سمجھنا فعل وخلق کی حقیقت سمجھنے پر موقوف ہے اس لئے بہت مناسب ہے کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۳۶۲ھ) کی ایک عبارت نقل کردی جائے جس سے امکانی حد تک یہ مسئلہ بے غبار ہوجاتا ہے، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"فعل وخلق کی حقیقت اور ان میں جو فرق ہے اس کو دریافت کرنا ضروری ہے، اس کو ایک محسوس مثال میں سمجھو کہ ایک بڑا بھاری پتھر ہے کہ زید جو کہ آقا ہے اس کو تنہا آسانی سے اُٹھا سکتا ہے، مگر عمرو جو کہ غلام ہے اس سے ہلتا تک بھی نہیں۔ زید نے عمرو سے کہا کہ اس پتھر کا اُٹھانا ہمارے قانون میں جرم ہے اور گو اس کو کوئی اُٹھا نہیں سکتا مگر ہم نے امتحان کے لئے اپنا معمول مقرر کیا ہے کہ جو اس کے اُٹھانے کے ارادہ سے اس کو ہاتھ لگاتا ہے ہم اُٹھوا دیتے ہیں، مگر یہ اُٹھانا اس کی طرف بایں وجہ منسوب کیا جاتا ہے کہ اس نے ارادہ کیوں کیا جس پر ہمارا اُٹھانا مرتب

ہوا، اگر وہ ارادہ نہ کرتا تو ہم اس پتھر کو نہ اُٹھاتے اور وہ مجرم قرار نہ دیا جاتا۔ غرض زید کے اس قانون اور معمول پر مطلع ہونے کے بعد عمرو نے پتھر کے پاس پہنچ کر اس کو بارادہ اُٹھانے کے ہاتھ لگایا اور اُٹھانے پر آمادہ ہوا، زید نے حسبِ اپنے معمول کے فوراً وہ پتھر اُٹھوادیا۔ اب ظاہر ہے کہ ہر عاقل اس صورت میں عمرو ہی کو مجرم قرار دے گا زید پر کسی قسم کا الزام نہیں رکھ سکتا، بس اسی طرح حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندے کو ارادہ وکسب عطا فرمائی ہے مگر وہ ایجادِ فعل کے لئے کافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا معمول مقرر کیا ہے کہ جب بندہ کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا کر دیتا ہے، پس مطابق مثال مذکور کے جو کچھ اعتراض ہے بندہ پر ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ منزہ و پاک ہے، اگر یہ شبہ ہو کہ قبیح کا فاعل ہونا اگر قبیح ہے تو خالق ہونا بھی قبیح ہونا چاہئے، اس کا حل یہ ہے کہ یہ قیاس غلط ہے، فعل قبیح اس لئے قبیح ہے کہ اس میں مفاسد غالب ہیں اور اس کے فعل میں کوئی حکمتِ واقعیہ صحیحہ نہیں بخلاف خلق قبیح کے کہ اس میں ہزاروں مصلحتیں اور حکمتیں ہوتی ہیں۔ البتہ ان حکمتوں کا مفصلاً علم ہر ایک کو نہیں ہوتا، مگر کسی شے کے علم نہ ہونے سے اس کا معدوم ہونا لازم نہیں آتا۔ فعل قبیح میں حکمت نہ ہونے اور خلق قبیح میں حکمت ہونے کے لئے صرف یہ اجمالی دلیل کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ باتفاق اہلِ عقل ونقل حکیم ہے اور حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا اور فعل قبیح کو اس نے منع کیا ہے تو ضرور فعل قبیح خالی از حکمت ہے اسی واسطے حکیم نے منع کر دیا اور خلق قبیح خود ان کا فعل ہے تو ضرور اس خلق میں کوئی حکمت ہوگی اسی لئے اُس کو اختیار کیا۔ اس فرق کو دریافت کرنے سے بہت سے شبہات بآسانی دفع ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ شبہ ہو کہ اگرچہ خلق قبیح ارادہ عبد پر مرتب ہے

اور اس لئے خالق پر الزام نہیں مگر اس فعل کے ساتھ جو ارادۂ خداوندی کا تعلق ہے وہ تو ارادۂ عبد پر مرتب نہیں بلکہ ارادۂ عبد خود اس پر مرتب ہے تو اب اشکال پھر عود کر آوے گا، سو یہ شبہ بھی اس تقریر بالا سے جو عنقریب مذکور ہوئی زائل ہو گیا، کیونکہ وہ ارادۂ خداوندی مشتمل ہزاراں ہزار مصالح پر ہے۔ اس لئے وہ قبیح نہیں بخلاف فعل عبد کے کہ بوجہ مفاسد کے قبیح ہے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ گو ارادہ وخلق خداوندی میں کوئی قباحت لازم نہیں آئی مگر بندہ کا غیر مختار ہونا تو لازم آ گیا تو اس کا دفعیہ یہ ہے کہ ارادہ خداوندی خاص اس طریقہ سے متعلق ہوا ہے کہ بندہ باختیار خود یہ فعل کرے گا سو اختیار عبد تو زیادہ مؤکد وثابت الوجود ہو گیا یہ نہیں کہ مسلوب ومعدوم ہو گیا ہو، جیسا خود ارادۂ خداوندی افعال خداوندی کے ساتھ یقیناً متعلق ہے اور پھر بھی باتفاق اہلِ ملت اللہ تعالی اپنے افعال میں غیر مختار نہیں ہے، پس بفضلہٖ تعالی سب اشکالات متعلق تقدیر کے رفع دفع ہو گئے مگر فہم وانصاف وطلب حق شرط ہے"۔

(بیان القرآن: ج:۱ص:۱۳، ۱۴)

قوله: "لاتبلغه الاوهام ولاتدركه الافهام"۔

ترجمہ: اس تک وہم کی رسائی نہیں اور نہ عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ وہم وخیال اور گمان وعقل وغیرہ مدرکات طبعیہ ذات باری تعالی کا ادراک کرنے سے قاصر اور عاجز ہیں، کیونکہ ان کی رسائی تو صرف اجسام ومحسوسات مادیہ ہی تک مقصود ہے، اجسام لطیفہ نورانیہ تک کے ادراک سے یہ قاصر ہیں، چنانچہ رسول اللہ ﷺ جنت کی نعمتوں کے بارے میں فرماتے ہیں: "مالاعين رأت ولااذن سمعت ولاخطر على قلب بشر" یعنی وہ نعمتیں ایسی ہیں کہ نہ آنکھوں نے انہیں دیکھا، نہ کانوں نے انہیں سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال ہی گزرا تو جب

جنت کی نعمتوں کے ادراک سے یہ مدرکات قاصر ہیں حالانکہ وہ بھی اجسام ہیں اور مخلوق ہیں تو اس ذات کا ادراک ان کو کیسے ہوسکتا ہے؟ جو ان سب کا خالق ہے، لطیف وخبیر اور نور مطلق ہے۔ارشاد ربانی ہے:

''وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْماً''۔(طٰہٰ:۱۱۰)

(اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا)۔

بالکل سچ کہا شیخ سعدی شیرازیؒ نے ؎

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر
ما ہمچناں دراوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی ذات کی کنہ وحقیقت سے ہم نہیں کرسکتے، اس کی معرفت ہمیں صرف اس کی صفات ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک ہے، بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، وہ زندہ ہے، سارے عالم کا نظام بلا کسی تعب کے سنبھالے ہوئے ہے، نہ اس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند، آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اسی کی ملکیت ہیں، اسی طرح حق تعالیٰ کی صفات میں ہم جس قدر غور کریں گے ہمارے علم ومعرفت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

قولہ:"ولا یُشبھہ الانام"۔

ترجمہ: اور مخلوق اس کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتی۔

تشریح:۔ یہ فرقہ مشبہ کا رد ہے، وہ لوگ خالق جل شانہ کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السمِيعُ البَصِيرُ"۔(الشوریٰ:۱۱)

(کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سُننے والا دیکھنے والا ہے)۔

علمائے اہل سنت کے نزدیک نفی تشبیہ سے مراد نفی صفات نہیں ہے، جیسا کہ منکرین صفات جہمیہ، معتزلہ اور روافض وغیرہ نفی تشبیہ کا سہارا لے کر صفات باری تعالی ہی کی نفی کر دیتے ہیں بلکہ حضرات اہل سنت کی مراد یہ ہے کہ حق تعالی اپنے اسماء صفات اور افعال میں مخلوق کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا، اور یہی اس آیت کا مطلب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) ''الفقہ الاکبر'' میں فرماتے ہیں:

"لایُشبه شیئاً من خلقه ولا یشبهه شئ من خلقه"۔

(وہ اپنی مخلوق میں کسی کے مشابہ نہیں اور نہ مخلوق میں سے کوئی اس کے مشابہ ہے)۔

آگے فرمایا:

"وصفاته کلها خلاف صفات المخلوقین یعلم لا کعلمنا ویقدر لا کقدرتنا ویری لا کرویتنا"۔

(اس کی تمام صفات مخلوق کی صفات کے ضد ہیں وہ علم رکھتا ہے لیکن اس کا علم ہمارے علم کے مشابہ نہیں اور وہ قدرت رکھتا ہے لیکن اس کی قدرت ہماری قدرت کے مشابہ نہیں اور وہ دیکھتا ہے لیکن اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کے مشابہ نہیں)۔

تنبیہ:۔ چونکہ مصنفؒ کا قول: ''لایُشبهه الانام'' مستلزم ہے ''لایُشبهه شیئاً من خلقه'' کو اس لئے مصنفؒ نے اسی پر اکتفاء فرمایا اور آگے والے جملے کا اضافہ نہیں فرمایا۔ حضرت نعیم بن حمادؒ متوفی ۲۲۸ھ فرماتے ہیں:

''جس نے اللہ کو اس کی کسی مخلوق کے ساتھ مشابہ قرار دیا تو اس نے کفر کیا اور جس نے ان صفات کا انکار کیا جن کو اللہ نے اپنے لئے بیان کیا ہے تو اس نے کفر کیا اور اللہ نے جن صفات کے ساتھ اپنے کو موصوف

کیا ہے اور اس کے رسول نے جن صفات کے ساتھ اس کو موصوف کیا ہے
اس میں تشبیہ نہیں ہے"۔

امام اسحاق بن راہویہ" فرماتے ہیں:

"جس نے اللہ کی صفت بیان کی اور اس کی صفات کو اللہ کی مخلوق میں سے
کسی کی صفات کے ساتھ تشبیہ دی تو وہ اللہ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے"۔

انتباہ! یہ معلوم رہے کہ بہت سے ائمہ سلف" سے منقول ہے کہ منکرین اسماء وصفات باری تعالی مثلاً قرامطہ اور فلاسفہ جو اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی کو عالم اور قادر وغیرہ کہنا جائز نہیں ہے اور جہمیہ جو اسماء الہی کے تو قائل ہیں لیکن اس کو مجاز پر محمول کرتے ہیں اور منکرین صفات معتزلہ وغیرہ جو اس کے قائل ہیں کہ اللہ کے لئے علم وقدرت، کلام ومحبت اور ارادہ وغیرہ کی صفات نہیں ثابت ہیں، اہل سنت والجماعت کو مشبہ اور مجسمہ کا لقب دیتے ہیں یہاں تک کہ زمخشری وغیرہ جو مفسر قرآن ہیں اپنے اعتزال کی بناء پر قائلین اسماء وصفات کو مشبہ کہنے سے نہیں چوکتے۔

قوله: "حي لا يموت، قيوم لا ينام".

ترجمہ: وہ زندہ ہے اس کو موت نہیں، وہ خود قائم ہے اور تمام عالم کا سنبھالنے والا ہے وہ سوتا نہیں۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کی صفات خاصہ:۔

اوپر مصنف" نے اللہ تعالی اور مخلوق کے درمیان تشبیہ کی نفی کی ہے اب آگے ان ان صفات کو بیان فرماتے ہیں جو حق سبحانہ وتعالی کے ساتھ خاص ہیں وہی ان صفات کے ساتھ متصف ہے مخلوق ان صفات سے متصف نہیں، تاکہ خالق ومخلوق کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا کہ: "وہ زندہ ہے اس کو موت نہیں" اس لئے کہ وہ صفت حیات جو باقی اور دائم رہنے والی ہے اللہ تعالی ہی کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ہر مخلوق کو بہر حال کسی نہ کسی وقت موت آنی ہے اور فنا ہونا ہے۔ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ۔

(الفرقان:۵۸)

(اور اسی ذات پر توکل رکھئے جو زندہ ہے جس کو موت نہیں اور اس کی تسبیح وتحمید میں لگے رہئے)۔

نیز فرمایا:ـ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ۔ (المومن:۶۵)

(وہی (ازلی ابدی) زندہ رہنے والا ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں)۔

اور اس کی ایک صفت یہ ہے کہ "خود قائم ہے اور تمام عالم کا سنبھالنے والا ہے وہ سوتا نہیں، نیند اور اونگھ کا نہ آنا اسی کے ساتھ خاص ہے کیونکہ مخلوق سوتی ہے اور نیند اور اونگھ سے متاثر ہوتی ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ۔

(البقرۃ:۲۵۵)

(اللہ تعالی (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں، زندہ ہے سنبھالنے والا (تمام عالم کا) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند)۔

اس آیت حق تعالی نے اپنی ذات سے اونگھ اور نیند کی نفی فرمائی ہے جو کمال حیات اور کمال قیومیت کی دلیل ہے۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان اللہ لا ینام ولا ینبغی لہ ان ینام۔ رواہ مسلم وابن ماجہ

(بے شک اللہ سوتا نہیں اور سونا اس کے شایان شان بھی نہیں)۔

کیونکہ سونا کمال حیات اور کمال قیومیت کے منافی ہے۔ مصنفؒ نے نفی تشبیہ کے صفات کا بیان شروع کر کے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تشبیہ کے انکار سے صفات کا انکار مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ حق سبحانہ وتعالی تمام صفات کمال کے ساتھ موصوف ہیں کہ ذات حق تعالی تمام کمالات کی جامع ہے وہ ذات جو حیات باقیہ دائمہ کے ساتھ زندہ ہے اس

کے مشابہ نہیں ہوسکتی ہے جو حیاتِ فانیہ زائلہ کے ساتھ زندہ ہے پس حق یہ ہے کہ خالق کی صفات حیات، علم اور قدرت وغیرہ اس کی ذات کے شایان شان ہیں اور مخلوق کی حیات، علم اور قدرت وغیرہ اس کی ذات کے لائق اور مناسب ہیں، دونوں میں کچھ مناسبت اور مشابہت نہیں کہ ایک قدیم، ازلی اور ابدی ہے اور دوسری حادث اور فانی ہے۔

الحی القیوم کی ایک عمدہ اور نفیس تشریح:۔

اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں اسماء (حی اور قیوم) قرآن شریف کی تین سورتوں میں ایک ساتھ آئے ہیں (۱) سورۂ بقرہ کی آیۃ الکرسی ہیں۔ (۲) سورۂ آل عمران کی دوسری آیت میں "الٓمٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" (اللہ تعالیٰ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں وہ زندہ (جاوید) ہیں سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں (۳) اور سورۂ طٰہ کی اس آیت میں "وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْم" (طٰہ:۱۱۱) (اور اس روز تمام چہرے اس حی وقیوم کے سامنے جھکے ہوں گے) بہت سے علماء کے نزدیک یہی دونوں اسماء "اسم اعظم" ہیں کیونکہ یہ دونوں نام حق تعالیٰ کی صفات کمال کو بدرجہ اتم واکمل شامل ہیں، چنانچہ اسم "قیوم" "ازلیت اور ابدیت" کے معنی پر جس طرح دلالت کرتا ہے لفظ "قدیم" میں وہ بات اور قوت نہیں ہے، نیز اسم "قیوم" اللہ تعالیٰ کے موجود بنفسہ ہونے کے معنی پر جس طرح دلالت کرتا ہے بعینہ وہی "واجب الوجود" کے معنی ہیں۔ اور "قیوم" کا صیغہ قیام سے ابلغ ہے کیونکہ واؤ الف سے اقوی ہے، باتفاق اہل لغت اور مفسرین اس کے معنی یہ ہیں کہ جو خود قائم ہو۔ لیکن کیا اس کے معنی دوسرے کو قائم کرنے والے اور سنبھالنے والے کے بھی ہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں، اصح یہی ہے کہ اس کے معنی یہ بھی ہیں اور اسی تفسیر کے مطابق متن کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ نیز اسمِ "قیوم" سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دائم القیام اور کامل القیام ہیں کیونکہ یہ صیغہ مبالغہ ہے۔ اور پھر "القیوم" کا "الحی" کے ساتھ مل کر آنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ تمام صفات کمال کے ساتھ دائم اور باقی ہیں اور ازل وابد میں نقص وعدم ان کی ذات سے منتفی ہے، پس حقیقت یہ ہے کہ انہیں

دونوں اسماء پر تمام اسمائے حسنیٰ کا مدار ہے اور انہی کی طرف تمام اسماء الٰہیہ کے معانی راجع ہوتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ صفت حیات تمام صفات کمال کو مستلزم ہے، جب بھی کوئی صفت تخلف کرتی ہے تو درحقیقت وہ ضعفِ حیات کی وجہ سے تخلف کرتی ہے، تو جب حق تعالی کی حیات، حیاتِ اکمل واتم ہے تو اس سے لازم آیا کہ ذاتِ حق ان تمام صفات کمال سے متصف ہے جن کی نفی سے کمالِ حیات کی نفی لازم آئے۔ اسی طرح صفتِ ''قیومیت'' کمالِ غنا اور کمال قدرت کو مستلزم ہے کیونکہ حق تعالی بذاتِ خود قائم ہیں دوسرے کے محتاج نہیں اور دوسروں کو بھی قائم کرنے اور قائم رکھنے والے ہیں بغیر ان کے قائم کئے ہوئے کوئی قائم نہیں رہ سکتا، پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں اسم جمیع صفاتِ کمال کو پوری طرح حاوی ہیں۔

قوله: "خالق بلا حاجة، رازق بلا مؤنة".

ترجمہ: وہ (اپنی) کسی ضرورت کے بغیر پیدا کرنے والا ہے اور بلا کسی مشقت کے روزی دینے والا ہے۔

تشریح:۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اللهُ خَالِقُ كُلِّ شيءٍ'' (الزمر:٦٢) (اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا) اللہ تعالی ہی تنہا خالق ہیں اس میں اس کا کوئی شریک نہیں کیونکہ خالقیت الوہیت کی خصوصیات میں سے ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مخلوق بھی کوئی چیز پیدا کر سکے کیونکہ خلق (پیدا کرنا) کہتے ہیں اعطائے وجود کو اور اعطائے وجود صرف اسی سے ممکن ہے جس کا وجود لذاتہ ہو، اور مخلوق کا وجود لذاتہ ہے نہیں، پس وہ دوسرے کو کس طرح وجود دے سکتا ہے۔ نیز ارشاد فرمایا:

"وَمَا خَلَقْتُ الجِنَّ والانْسَ اِلّا لِيَعْبُدُون مَا أُرِيدُ مِنهم من رزقٍ ومَا أُرِيدُ أن يُطعِمُون اِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو القُوَّةِ المَتِين". (الذاریات:٥٦،٥٧،٥٨)

(اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں، میں ان سے رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ

5

درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں، اللہ خود ہی سب کو رزق
پہنچانے والا قوت والا نہایت قوت والا ہے)۔

کھانا مانگنے کی نفی سے تمام اغراض کی نفی مراد ہے کیونکہ کھانا ہی اصل اور اوّل ضرورت وغرض ہے جب اس کی نفی ہوگئی تو تمام اغراض کی نفی ہوگئی، رہا عبادت کا معاملہ تو یہ بھی بندوں ہی کی مصلحت سے ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ"۔
(فاطر:۱۵)

(اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز (اور خود تمام) خوبیوں والا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ غنی اور مخلوق محتاج ہے اس لئے یہ محال ہے کہ جو غنی ہو وہ اپنی ضروریات میں محتاج کا محتاج ہو۔ اور رزق بلا مشقت کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ"۔(الذاریات:۵۸)

''ذُو القوۃ المتین'' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رزق رسانی میں اللہ تعالیٰ کو کوئی مشقت اور گرانی نہیں ہوتی، کیونکہ مشقت اور گرانی کا منشاء ضعف اور کمزوری ہے اور اللہ تعالیٰ نہایت قوت والا ضعف سے منزہ ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! اگر تم میں کے اول وآخر انسان وجنات ایک زمین پر کھڑے ہو جائیں اور مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کے سوال کو پورا کردوں تو یہ اس میں سے جو میرے پاس ہے کم نہ کرے گا، مگر ویسا ہی جیسا کہ سوئی کم کرتی ہے جبکہ سمندر میں ڈالی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی دادودہش سے اس کے خزانہ غیب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

قولہ: "ممیت بلا مخافة باعث بلا مشقة"۔
ترجمہ: وہ بغیر کسی خوف کے موت دینے والا اور بغیر کسی دشواری کے

دوبارہ زندہ کرنے والا ہے۔

تشریح:۔اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

"فَدَ مدَ مَ عَلَیهِم رَبُّهُم بِذَ نبِهِم فَسَوّٰها وَ لَا یَخَافُ عُقُبٰهَا"۔ (الشمس:۱۴،۱۵)

(توان کے پروردگار نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت نازل فرمائی پھر اس (ہلاکت) کو (تمام قوم کے لئے) عام فرمایا اور اللہ تعالی کو اس ہلاکت کے اخیر میں کسی خرابی کے نکلنے کا (کسی سے) اندیشہ نہیں ہوا)۔

یعنی جس طرح دُنیا کے بادشاہوں کو بعض اوقات کسی قوم کو سزا دینے کے بعد احتمال ہوتا ہے کہ اس پر کوئی شورشِ ملکی برپا نہ ہوجائے۔اور ارشاد فرمایا:

"له مُلكُ السمٰوٰتِ والارضِ یُحیی وَیُمیتُ وَهُوَ علی کُلِّ شیءٍ قَدِیرٌ"۔(الحدید:۲)

(اسی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی وہی حیات دیتا ہے اور (وہی) موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے)۔

اور جب اللہ تعالی ہر چیز پر کمال قدرت رکھتا ہے تو یہی اس امر کی دلیل ہے کہ وہ کسی کو زندہ کرنے اور موت دینے سے ڈرتا نہیں، کیونکہ خوف کا منشاء عجز اور ضعف ہے اور حق سبحانہ وتعالی کامل القدرت، عجز وضعف سے منزہ ہیں۔

بعث مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنے کو کہتے ہیں ،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"وَاَنَّ الساعَةَ اٰتِیةٌ لّاریبَ فِیهاوَاَنَّ اللهَ یَبعَثُ مَن فِی القُبُورِ"۔(الحج:۷)

(اور قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالی (قیامت

میں قبر والوں کو دوبارہ پیدا کر دے گا)۔

اور فرمایا:

"زَعَمَ الذِين كَفَرُوا ان لن يُبعَثُوا قُل بلیٰ وَرَبی لَتُبعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلتُم وَذٰلِكَ علی اللهِ يَسِيرٌ"۔

(التغابن:۷)

(یہ کافر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے آپ کہہ دیجئے کیوں نہیں واللہ! ضرور دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے پھر جو کچھ تم نے کیا ہے تم کو سب جتلا دیا جائے گا اور یہ (دوبارہ زندہ کرنا) اللہ تعالیٰ کو بالکل آسان ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوبارہ زندہ کرنا حق تعالیٰ کے لئے بالکل آسان ہے اس کو اس میں کچھ بھی دُشواری نہیں کہ وہ کامل القدرت ہے۔ دُشواری اس کو ہوتی ہے جس کی قدرت میں نقص ہو، وتعالی اللہ عن ذالك علواً کبیراً۔

موت وجودی ہے یا عدمی؟

اس امر میں اختلاف ہے کہ موت وجودی ہے یا عدمی؟ فلاسفہ اور ان کے متبعین اس کے عدمی ہونے کے قائل ہیں اور اہل حق وجودی ہونے کے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے:

"الَّذِی خَلَقَ المَوتَ والحَیٰوةَ لِیَبلُوَکُم اَیُّکُم اَحسَنُ عَمَلاً"۔ (الملك:۲)

اگر موت عدمی چیز ہوتی تو اس کو مخلوق نہ کہتے، نیز بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ:

"یوتی بالموت یوم القیامة علی صورة کبش املح فیذبح بین الجنة والنار"۔

(قیامت کے دن موت کو سفید وسیاہ رنگ کے مینڈھے کی صورت میں

لایا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان ذبح کر دیا جائے گا)۔

اب رہا یہ اشکال کہ موت عرض ہے اور مینڈھا عین تو موت مینڈھے کی صورت میں کیسے ہو جائے گی، اس کا جواب یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے احکام اس عالم سے مختلف ہیں وہاں اعراض کو اعیان میں بدل دیا جائے گا، چنانچہ حدیث پاک میں ہے کہ عمل صالح خوب صورت نوجوان کی شکل میں اور بُرا عمل بدصورت انسان کی شکل میں آئے گا، اسی طرح سورۂ بقرہ اور سورۂ ال عمران کے متعلق وارد ہے کہ یہ دونوں سورتیں قیامت کے روز اپنے پڑھنے والے پر اس طرح سایہ فگن ہو جائیں گی جیسے بادل کے ٹکڑے یا پَر پھیلائے ہوئے پرندوں کے دو گروہ، ان سے اور اسی طرح کی بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ آخرت میں اعراض بہ شکل اعیان ہو جائیں گے۔

قوله: "مازال بصفاته قديماً قبلَ خلقه لم يزدَد بكونهم شيئاً لم يكن قبلهم من صفاته وكما كان بصفاته ازلياً كذالك لايزال عليها ابدياً"۔

اللہ تعالیٰ مع اپنی صفات کے قدیم ہے:

ترجمہ: وہ مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے ہی مع اپنی تمام صفات کے قدیم ہے، مخلوق کے وجود میں آنے سے اس کی صفات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، اور جس طرح وہ مع اپنی صفات کے ازلی ہے اسی طرح وہ مع اپنی صفات کے ابدی ہے۔

تشریح: صفات ذات اور صفات فعل کی تعریف اور اس میں اختلاف:۔

صفاتِ باری تعالی کی دو قسمیں ہیں: (۱) صفاتِ ذات جیسے حیات، قدرت، علم، کلام، سمع، بصر اور ارادہ یہ صفات بالاتفاق قدیم ہیں۔ (۲) صفاتِ فعل جیسے تخلیق، ترزیق، احیاء، اماتت اور انشاء وغیرہ ماتریدیہ کے نزدیک صفات فعل بھی قدیم ہیں اور اشاعرہ کے نزدیک حادث ہیں، والنزاع لفظی کما حققہ الملا علی القاری فی شرح الفقہ الاکبر۔ معتزلہ کے

نزدیک صفاتِ فعل وہ ہیں جن میں نفی واثبات جاری ہو سکے مثلاً صفت خَلق (پیدا کرنا) کہ اس کو نفیاً اور اثباتاً دونوں طرح استعمال کرتے ہیں کہتے ہیں: ''خلق اللہ لفلانٍ ولداً'' (فلاں کے لئے اللہ تعالیٰ نے لڑکا پیدا فرمایا) ''ولم یخلق اللہ لفلانٍ ولداً'' (اور فلاں کے لئے اللہ نے لڑکا نہیں پیدا فرمایا) اس میں نفی کا صیغہ بھی استعمال ہوا اور اثبات کا بھی۔ اور صفات ذات ان کے نزدیک وہ ہیں جن میں نفی نہ جاری ہو سکے مثلاً صفت علم وقدرت چنانچہ یہ نہیں کہا جاتا کہ ''لم یعلم اللہ کذا ولم یقدر علی کذا'' (اللہ نے فلاں بات نہیں جانی اور اللہ فلاں چیز پر قادر نہیں ہوا) اس بناء پر صفت ارادہ اور صفت کلام ان کے نزدیک صفاتِ فعل میں سے ہیں کیونکہ ان دونوں صفات میں نفی واثبات خود قرآن کریم میں موجود ہے۔ آیتِ قرآنی ہے: ''یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الیُسرَ وَلَایُرِیدُ بِکُمُ العُسرَ۔

اور وَکَلَّمَ اللّٰہُ موسیٰ تَکلِیماً۔

اور وَلَایُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَومَ القِیامَۃ''۔

اور یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک یہ دونوں صفات (صفت ارادہ اور صفت کلام) حادث ہیں۔ اور اشاعرہ کے نزدیک صفاتِ ذات وہ ہیں کہ جن کی نفی سے ان کی نقیض لازم آئے، مثلاً صفت حیاۃ کہ اگر اس کی نفی کرو تو اس کی نقیض یعنی موت لازم آئے گی اور اگر صفت قدرت اور صفت علم کی نفی کرو تو ان کی نقیض یعنی عجز اور جہل لازم آئے گا۔ اور صفاتِ فعل ان کے نزدیک وہ ہیں کہ جن کی نفی سے ان کی نقیض نہ لازم آئے۔ مثلاً اگر صفت خلق اور صفتِ رزق کی یا صفت احیاء (زندہ کرنے) کی نفی کرو تو اس سے اس کی نقیض لازم نہ آئے گی۔ پس اس تعریف کی بناء پر اگر اللہ تعالیٰ سے صفت ارادہ کی نفی کرو تو اس سے جبر واضطرار لازم آئے گا اور اگر صفتِ کلام کی نفی کرو تو خرس (گونگاپن) اور سکوت لازم آئے گا، اس سے ثابت ہوا کہ یہ دونوں صفات، صفات ذات میں سے ہیں۔

اور ہمارے نزدیک صفت ذات ہر وہ صفت ہے جو اللہ تعالی کی صفت ہو اور اس صفت کی ضد جو صفت ہو وہ اللہ تعالی کی صفت نہ ہو سکے جیسے صفتِ قدرت، علم، عزت اور عظمت وغیرہ اور صفت فعل ہر وہ صفت ہے کہ وہ اور اس کی ضد دونوں ہی اللہ تعالی کی صفت ہو سکے، جیسے صفت رأفت ورحمت اور سخط وغضب۔ (شرح الفقہ الاکبر لملا علی القاری)

صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات؟

فلاسفہ کے نزدیک صفات باری تعالی عین ذات ہیں اور معتزلہ کے نزدیک غیر ذات ہیں، اور کرامیہ کے نزدیک صفاتِ باری حادث ہیں، البتہ مخلوق کی صفات سب کے نزدیک ذاتِ مخلوق کے غیر ہیں۔ اہلِ سنت کے نزدیک صفاتِ باری تعالی نہ عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات، کیونکہ صفات کو عین ذات ماننے سے قدماء کا تعدد لازم آتا ہے اور غیر ذات ماننے سے غیر کا قدیم ہونا لازم آتا ہے اور یہ دونوں ہی باطل ہیں اس لئے عین ذات یا غیر ذات ماننا بھی باطل ہوا۔

ایک دلچسپ مناظرہ:۔

عبدالحق عیسائیوں کا مشہور پادری تھا اس سے سہارنپور کے گرجا گھر میں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ ناظم اعلیٰ مظاہر العلوم سہارنپور و خلیفہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ کا مناظرہ ہوا، زیر بحث مسئلہ "الوہیت وصفات باری" تھا، عبدالحق پادری نے کہا کہ متکلمینِ اسلام کا مسلک بھی عجیب ہے، وہ کہتے ہیں کہ صفاتِ باری تعالی نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات ہیں، یا تو صفات باری کو عین ذات ماننا چاہئے یا غیر ذات، نہ عین ہوں، نہ غیر تو اس سے ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے، اور ارتفاع نقیضین محال وباطل ہے اور یہ محال صفات باری تعالی کو لاعین اور لاغیر ماننے سے لازم آیا اور جو شے مستلزم محال ہوتی ہے وہ خود محال وباطل ہوتی ہے، لہذا متکلمین اسلام کا مسلک محال وباطل ہوا۔ حضرت مولانا نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ آپ کا ہاتھ ہے بتایئے کہ یہ عین ذات ہے یا غیر ذات؟ جلد

بولئے کیا ہے؟ اگر عین ذات ہے تو اس کے کاٹنے سے آپ کو ہلاک ہو جانا چاہئے، اور غیر ذات ہے تو اس کا تقاضا ہے کہ اگر اس کو کاٹا جائے تو آپ کو قطعاً کوئی تکلیف نہ ہو، پادری خاموش ہو گیا اور سب نے تالیاں بجا کر باآواز بلند کہا کہ مولانا صاحب کی بات ہماری سمجھ میں آ گئی، مولانا صحیح فرماتے ہیں۔

رد بر فرقہ جہمیہ و معتزلہ:۔

اس تفصیل کے بعد اب سُنئے کہ مصنف امامؒ نے یہاں پر معتزلہ، جہمیہ اور روافض پر رد فرمایا ہے، جہمیہ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ فعل و کلام پر قادر نہیں تھا اب قادر ہو گیا کیونکہ فعل و کلام پہلے ممتنع تھا اور اب ممکن ہو گیا اور امتناع ذاتی سے امکان ذاتی میں متبدل ہو گیا۔

فرقہ جہمیہ کہتا ہے کہ حوادث [1] کا دوام ممتنع ہے اور ضروری ہے کہ حوادث کا کوئی مبدأ ہو کیونکہ یہ ممتنع ہے کہ حوادث کی کوئی ابتداء نہ ہو، لہذا یہ بھی ممتنع ہوگا کہ باری تعالیٰ ازل سے فاعل اور متکلم ہوں بلکہ یہ بھی ممتنع ہوگا کہ فعل و کلام پر قادر ہوں اس لئے کہ ممتنع پر قدرت بھی ممتنع ہے۔ جہمیہ کے اس قول کا جواب یہ ہے کہ تمہارا یہ قول فاسد ہے اس لئے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ عالَم کا حدوث بھی ممتنع ہو حالانکہ عالَم حادث ہے، اور حادث جب حادث ہو حالانکہ وہ پہلے سے موجود نہیں تھا تو وہ ممکن ہوتا ہے، اور ممکن کے لئے کوئی وقت محدود نہیں ہوتا، کیونکہ جو بھی وقت فرض کیا جائے امکان کا ثبوت اس میں موجود ہوتا ہے، اور فعل کے امکان کا کوئی مبدأ نہیں جہاں سے اس کی ابتدا ہو، لہذا واجب ہوا کہ فعل ہمیشہ سے ممکن ہو اور اس سے یہ لازم آیا کہ حق تعالیٰ ہمیشہ سے فعل پر قادر ہیں اور پھر نتیجۃً اس سے یہ بھی لازم آیا کہ ایسے حوادث کا جواز اور امکان ثابت ہے جن کی کوئی ابتدا نہیں۔

---

[1] ۔حوادث حادث کی جمع قدیم کی ضد ہے قدیم جو ہمیشہ سے ہو جس کی ابتداء نہ ہو اور حادث جس کی ابتداء ہو اور جو ہمیشہ سے نہ ہو یعنی تمام مخلوقات، دوام حوادث کے امتناع سے مراد یہ ہے کہ مخلوقات کا ہمیشہ سے ہونا ممتنع اور محال ہے۔ مؤلف ۱۲

جہمیہ اوران کے موافقین کہتے ہیں کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ امکان حوادث کی کوئی بدایت نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ امکانِ حوادث کی بدایت بشرط اس کے مسبوق بالعدم ہونے کے نہیں ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے (جہمیہ کے) نزدیک حوادث کا قدیم النوع ہونا ممتنع ہے بلکہ اس کی نوع کا حدوث ضروری ہے البتہ یہ حدوث کسی معین وقت میں ضروری نہیں ہے۔ پس حوادث کے امکان کی بدایت بشرط اس کے مسبوق بالعدم ہونے کے نہیں ہے، برخلاف جنس حوادث کے اہل سنت کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ مانا کہ تم یہی کہتے ہو، لیکن جنس حوادث کے امکان کی تو تمہارے نزدیک بدایت ہے پس اس سے لازم آیا کہ تمہارے نزدیک جنس حدوث ممکن ہو گیا بعد اس کے کہ ممکن نہیں تھا اور پھر اس امکان کا کوئی وقت معین نہیں ہے، بلکہ جو بھی وقت فرض کیا جائے گا امکان اس سے قبل ثابت ہوگا، جس کو امکان کا دوام اور تسلسل لازم ہے، کیونکہ اگر دوامِ امکان نہ تسلیم کرو گے تو لازم آئے گا کہ بغیر کسی شے کے حدوث کے جنس امتناع سے امکان میں بدل گئی۔ اور یہ مسلّم ہے کہ جنس حوادث کی حقیقت کا امتناع سے امکان میں بدل جانا (جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بغیر کسی سبب کے اس کو ممکن بنا دیا بعد اس کے کہ وہ ممتنع تھا) عقلاً ممتنع ہے اور یہی حقیقت ہے جنس کے امتناع ذاتی سے امکان ذاتی میں بدل جانے کی، کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک ذاتِ جنس حوادث ممکن ہو جاتی ہے حالانکہ پہلے وہ ممتنع تھی اور پھر یہ تبدل اور انقلاب کسی معین وقت کے ساتھ خاص نہیں ہوتا اس لئے کہ جو وقت بھی فرض کیا جائے گا امکان اس سے پہلے ثابت ہوگا، جس سے لازم آتا ہے کہ یہ تبدل اور انقلاب ہمیشہ سے ممکن ہے اور نتیجہ یہ لازم آتا ہے کہ ممتنع ہمیشہ سے ممکن ہے۔ اب یہ دیکھو کہ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ''حادث ہمیشہ سے ممکن ہے'' جو ان کو تسلیم نہیں اور ان کے قول سے یہ لازم آتا ہے کہ ''ممتنع ہمیشہ سے ممکن ہے'' ظاہر ہے کہ یہ ان کے حق میں ''فرّ من المطر قرّ تحت المیزاب'' کا مصداق ہے کیونکہ حادث کا ممکن ہونا اور اس امکان کا ہمیشہ سے ہونا تو امر معقول ہے لیکن ممتنع کا ممکن ہونا ممتنع بالذات ہے پس جس قول سے یہ امتناع لازم آیا وہ

خود ممتنع ہے۔

نوعِ حوادث کے امکان دوام میں تین اقوال ہیں:۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس میں تین اقوال ہیں کہ نوع حوادث کا امکانِ دوام مستقبل اور ماضی میں ہے یا نہیں؟

(۱) جہم بن صفوان (بانی فرقہ جہمیہ) وغیرہ کا قول یہ ہے کہ اس کا دوام نہ ماضی میں ممکن ہے اور نہ مستقبل میں، یہ سب سے ضعیف قول ہے۔

(۲) اکثر متکلمین اور فقہاء کا قول یہ ہے کہ مستقبل میں اس کا دوام ممکن ہے اور ماضی میں ممکن نہیں۔

(۳) ائمہ حدیث کا قول یہ ہے کہ ماضی اور مستقبل دونوں میں اس کا دوام ممکن ہے۔

(۴) چوتھی قسم یعنی ماضی میں دوام ہو مستقبل میں نہیں اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔

جمیع انبیاء و مرسلین اور دنیا کے تمام اہل مذاہب اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی کے ماسوا سب مخلوق ہیں، پہلے نہیں تھے بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی بداہۃً معلوم ہے کہ مفعول کا اپنے فاعل کے ساتھ ہمیشہ مقارن ہونا ممتنع ہے، پھر جب مستقبل میں حوادث کا دوام اور تسلسل حق سبحانہ وتعالی کے "الآخر" ہونے سے مانع نہیں ہے تو ماضی میں حوادث کا تسلسل اس کے "الاول" ہونے سے کس طرح مانع ہو جائے گا؟ لاریب کہ حق تعالیٰ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں کلام فرماتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"قَالَ كَذٰلِكَ اللهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ"۔ (آل عمران:۴۰)

(اللہ تعالی نے فرمایا کہ اسی حالت میں (لڑکا ہو جائے گا) کیونکہ اللہ تعالی جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں)۔

اور فرمایا:

"ذُوالعَرْشِ المَجِيدُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ". (البروج:۱۵،۱۶)

(عرش کا مالک عظمت والا ہے وہ جو چاہے سب کچھ کرگزرتا ہے)۔

پس صحیح اور حق یہ ہے کہ حق سبحانہ وتعالی ہمیشہ سے تمام صفات کمال کے ساتھ متصف ہیں، خواہ صفات ذات ہوں یا صفات فعل، اس کے برخلاف یہ عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالی کسی ایسی صفت کے ساتھ متصف ہوئے جس کے ساتھ پہلے سے متصف نہیں تھے، اس لئے اللہ تعالی کی صفات تمام کی تمام صفات کمال ہیں، پس کسی بھی وقت میں ان صفات میں سے کسی بھی صفت کے ساتھ متصف نہ ہونے سے نقص وعیب لازم آتا ہے۔ لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالی پہلے نقص وعیب سے معاذاللہ! متصف رہے ہوں اور بعد میں کمال حاصل ہوا ہو کہ ذاتِ حق تمام نقائص سے منزہ ہے۔ سُبحٰنَ اللهِ عَمَّا يَصِفُونَ۔

قوله: "ليس منذ خَلَقَ الخلقَ استفادَ اسمَ الخالق ولا باحداثه البريةَ استفاد اسمَ الباری"

ترجمہ: مخلوق کے پیدا کرنے کے بعد اس نے اسم خالق اور خلقت کو وجود میں لانے کے سبب اس نے اسم باری نہیں حاصل کیا ہے۔

تشریح: ۔ مصنف امامؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حوادث کا دوام اور تسلسل ماضی میں ممکن نہیں ہے مگر مستقبل میں ممکن ہے، جیسا کہ اسی کتاب کی آگے مذکورہ عبارت "والجنة والنار مخلوقتان لاتفنيان ابداً ولاتبيدان" سے معلوم ہوتا ہے، اور یہی جمہور علماء کا مذہب ہے کما سبق مفصلاً۔ مصنفؒ کے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالی نے ان صفات کو اپنی ذات کی طرف بہ صیغہ ماضی مطلق منسوب فرمایا ہے اور انہیں اسم جلالہ (اللہ) پر محمول فرمایا ہے اور "اللہ" علم ہے اس ذات کا جو مستجمع ہے جمیع صفات کمال کا چنانچہ فرماتے ہیں:

"وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شئٍ عَلِیماً۔

اور فرمایا: وَ کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شئٍ مُحِیطاً۔

نیز فرمایا: وَ کَانَ اللّٰہُ سمیعاً بصِیراً O " وغیرھا من الآیات الکریمۃ، ان تمام آیات میں لفظ "کان " صیغہ ماضی ہے جس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ صفات باری تعالی ماضی سے ہیں، ذاتی ہیں، اس کے علم ذات پر محمول ہیں، قدیم ہیں اور مخلوق کی تخلیق کے پہلے سے وہ صفات تمام اسمائے معلومہ کے ساتھ ازل ہی سے موجود ہیں، ان صفات کا وجود اوران اسماء کے ساتھ حق تعالی کا موسوم ہونا مخلوق کے پیدا کرنے اور افعال کے ظاہر کرنے پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ اسمائے صفات اللہ تعالی کے افعال کے ساتھ متعلق ہوتے کہ جب وہ فعل اللہ تعالی کرتا جب اس اسم اور صفت کے ساتھ موسوم اور متصف ہوتا، مثلاً دنیا کو خلق کرنے کے بعد خالق کہلاتا اور خلقِ عالم سے پہلے خالقیت کی صفت سے متصف نہ ہوتا تو قرآن کریم میں ان اسمائے صفات کا اطلاق ذاتِ باری تعالی پر تخلیق عالم سے پہلے بہ صیغہ ماضی نہ ہوتا، اور "اسم جلالہ" پر ان اسماء کا اطلاق نہ کیا جاتا کیونکہ "اسم جلالہ" (اللہ) نام ہے اس ذات کا جو جمیع صفات کمال کو ازلاً وابداً مستجمع ہے۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ صفاتِ باری اور اسمائے الٰہی قدیم ہیں، ہمیشہ سے ہیں، ایسا نہیں کہ اس نے عالم کو خلق فرمایا تب خالق ہوا، اس نے مخلوق کو رزق عطا فرمایا تب رزّاق ہوا، اس نے صورت گری کا فعل انجام دیا تب مصوّر ہوا وغیرہ وغیرہ، بلکہ وہ اس وقت بھی خالق، رزّاق اور مصوّر تھا جبکہ مخلوقات کا کوئی وجود نہ تھا، وہ ازل میں بھی تخلیق کائنات سے پہلے ان اسمائے صفات کے ساتھ موسوم تھا جس طرح ابد تک ان کے ساتھ موسوم اور متصف رہے گا جیسے کاتب کہ جس وقت وہ کتابت کا فعل کر رہا ہو صرف اسی وقت اس کو کاتب نہیں کہا جاتا بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اس کو کاتب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ فعل کتابت پر قادر ہے، پس اسی طرح حق تعالی اپنے اسمائے صفات کے ساتھ قبل خلقِ عالم اور اظہار افعال موسوم ہیں کیونکہ وہ ان تمام پر ازلاً وابداً قادر ہیں۔

قوله: "له معنی الربوبیة ولامربوب، ومعنی الخالق ولا مخلوق".

ترجمہ: اس کے لئے ربوبیت کے معنی اس وقت بھی ثابت تھے جبکہ کوئی مربوب نہیں تھا اور اس کے لئے خالق کے معنی اس وقت بھی ثابت تھے جبکہ کوئی مخلوق نہیں تھا۔

تشریح: ۔مطلب یہ ہے کہ مربوب اور مخلوق کے وجود سے پہلے بھی وہ "رب اور خالق" ہونے کے ساتھ موصوف تھا۔ مصنف امامؒ نے ربوبیت اور خالقیت کے بجائے "معنی الربوبیۃ" اور "معنی الخالق" اس لئے کہا کہ "خالق" اس کو کہتے ہیں کہ جو شے کو عدم سے نکال کر وجود میں لائے۔ نیز "خلق" بمعنی تقدیر بھی آتا ہے۔ اسی طرح "رب" کے بھی کئی معنی آتے ہیں ملک، حفاظت، تدبیر اور تربیت۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصنفؒ نے جن الفاظ سے تعبیر فرمائی ہے وہی انسب ہے۔

قوله: "وكما انه محيي الموتى بعد ما احيى استحق هذا الاسم قبل احيائهم، كذلك استحق اسمَ الخالق قبل انشائهم".

ترجمہ: اور جس طرح وہ مخلوق کو حیات کے بعد موت اور پھر موت کے بعد حیات دینے والا ہے، لیکن اس حیات کے دینے سے پہلے ہی "محی" کہلانے کا مستحق ہے، اسی طرح مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہی "خالق" کہلانے کا مستحق ہے۔

تشریح: ۔یہ معتزلہ کا رد ہے جو صفات باری تعالی کے حدوث کے قائل ہیں کماتقدم فیما مضی۔

قوله: "ذالك بانه على كل شيء قدير وكل شيء اليه فقير وكل امر عليه يسير لايحتاج الى شيء لَيسَ كَمِثلِه

شیٌٔ وَهُوَ السمیعُ البَصِیرُ"

ترجمہ: ایسا اس لئے ہے کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز اس کی محتاج ہے اور ہر امر اس کے لئے آسان ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، اس کے مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تشریح:۔ اس میں اشارہ ہے کہ باری تعالی کی صفات ازلی ہیں۔ معتزلہ نے "واللہ علی کُلِّ شیءٍ قدیر" کے معنی میں اپنے عقیدہ کے مطابق تحریف کی ہے، انہوں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر اُس چیز پر قادر ہے جو اس کی قدرت کے اندر داخل ہے لہذا ان کے نزدیک وہ افعال عباد پر قادر نہیں ہے، لیکن ان کے اس عقیدہ سے اللہ تعالی کی صفتِ قدرت کے کمال کا انکار لازم آتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ تعالی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اِس عموم میں ہر ممکن شامل ہے، رہا یہ سوال کہ اللہ تعالی محال لذاتہ پر (مثلاً شیٔ واحد کا ایک ہی وقت میں موجود بھی ہونا اور معدوم ہونا) قادر ہے یا نہیں؟ تو دراصل یہ سوال ہی بے بنیاد اور حقیقت سے خالی ہے کیونکہ محال لذاتہ کا نہ وجود متصور ہے اور نہ اس کو "شے" کہا جاتا ہے، اسی پر ان سوالات کو بھی قیاس کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالی اپنے مثل کے پیدا کرنے اور اپنے کو فناء کرنے پر قادر ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ سب محال لذاتہ ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے" لیسَ کمثلِه شیٔ" سے مصنفؒ نے مشبہ پر رد فرمایا ہے اور "هُوَالسمیعُ البصیر" سے معطلہ پر رد کیا ہے کہ ذاتِ حق تعالی جمیع صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے اور کوئی مخلوق ان صفات میں اس کے مشابہ نہیں ہے، گو مخلوق بھی "سمیع اور بصیر" ہونے کے ساتھ موصوف ہے لیکن مخلوق کا سمع وبصر ویسا ہے جیسا اس کو لائق ہے اور ذاتِ واجب الوجود کا سمع وبصر ویسا ہے جیسا اُس کو لائق ہے۔ دونوں میں کوئی تشبیہ وتمثیل نہیں کہ ذاتِ باری تعالی کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا جائے اور نہ تو "لَیسَ کَمِثلِه شیٔ" سے استدلال کر کے صفات کی نفی ہی کی جاسکتی ہے کہ جس سے تفصیل لازم آئے کیونکہ اسی آیت میں "وَهُوَ السمیعُ

البصیر'' بھی موجود ہے جس سے علی وجہ الکمال ذات حق سبحانہ کے لئے صفت سمع وبصر کا ثبوت ہو رہا ہے۔

قولہ: "خَلَقَ الخلقَ بعلمہ".

ترجمہ: مخلوق کو اپنے علم کے ساتھ پیدا کیا۔

تشریح: ۔خلق: فعل ماضی بمعنی اَوجَدَ وَانشأ وَابدَعَ (ایجاد کرنے اور پیدا کرنے) کے ہے اور قدّر: (اندازہ کرنے) کے معنی میں بھی آتا ہے الخلق: مصدر ہے اور یہاں مخلوق کے معنی میں ہے۔ بعلمہ: حال ہونے کی بناء پر محلاً منصوب ہے، تقدیری عبارت یہ ہے: "خلقھم عالماً بھم "یعنی مخلوق کو پیدا کیا اس حال میں کہ وہ ان کا علم رکھتا تھا۔ دلیل اس دعویٰ کی یہ آیت ہے:

اَلَا یَعلَمُ مَن خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیفُ الخَبِیرُ" ۔(الملك:١٤)

(کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے اور وہ باریک بین پورا باخبر ہے)۔

اس میں بھی معتزلہ کا رد ہے جو صفات کے منکر ہونے کے سبب اللہ تعالی کو صفت علم سے خالی سمجھتے ہیں تعالی اللہ عن ذالك علوّا کبیراً۔ آیت مذکورہ کے علاوہ بھی بہت سی آیات سے صفت علم کا ثبوت ہوتا ہے، من جال النظر فی القرآن وجدھا علی العیان اور از روئے عقل بھی علم کا ثبوت ذاتِ باری کے لئے ضروری ہے، کیونکہ جہل کے ساتھ اشیاء کا ایجاد کرنا محال ہے کہ بغیر جانے ہوئے کس چیز کو اور کس طرح ایجاد کرے گا؟ نیز یہ کہ اللہ تعالی نے اشیاء کو اپنے ارادہ سے ایجاد کیا اور ارادہ مستلزم ہے مراد (جس چیز کا ارادہ کیا جائے) کے تصور کو اور تصور ہی کو علم کہتے ہیں لہٰذا ایجاد و خلق مستلزم ہوا ارادہ کو اور ارادہ مستلزم ہوا علم کو، پس نتیجہ نکلا کہ خلق وایجاد مستلزم ہے علم کو۔ نیز یہ بھی قابل غور ہے کہ علم صفت کمال ہے اور وہ مخلوق کے لئے ثابت ہے اور خالق مخلوق سے اکمل وارفع ہے تو جب وہ مخلوق کے لئے ثابت ہے تو اس سے اکمل وارفع، یعنی خالق کے لئے کیونکر ثابت نہیں ہوگا۔

صفت علم سے متعلق ایک دلچسپ مناظرہ:۔

خلیفہ مامون کے دربار میں امام شافعیؒ کے شاگرد امام عبدالعزیز مکیؒ سے معتزلی عالم بشر مریسی کا مناظرہ ہوا تھا، جس کی روداد کتاب ''الحیدہ'' میں بتمامہ درج ہے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی کسی زمانہ میں شائع ہوا تھا، اس میں ہے کہ: ''جب امام عبدالعزیز نے بشر سے اللہ تعالیٰ کے علم کے متعلق سوال کیا تو اس نے جواب دیا کہ اللہ جاہل نہیں ہے، وہ بار بار علمِ باری کے متعلق سوال کرتے رہے اور وہ جواب میں بس یہی کہتا رہا کہ اللہ جاہل نہیں ہے غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے صفت علم کا اقرار نہیں کرتا تھا، تو آخر میں امام عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ جہل کی نفی کچھ مدح کی صفت نہیں ہے کیونکہ ستون کی بھی یہ صفت ہے کہ یہ جاہل نہیں ہے اور ستون سے جہل کی نفی اس کے لئے صفتِ مدح نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام، ملائکہ اور مومنین کی مدح علم کے سبب فرمائی ہے نہ کہ جہل کی نفی سے، کیونکہ جس نے علم کو ثابت کیا اس نے جہل کی نفی کر دی اور جس نے جہل کی نفی کی تو اس سے علم کا ثبوت لازم نہیں آیا، اس لئے کہ ثبوت علم مستلزم ہے نفی جہل کو لیکن نفی جہل ثبوت علم کو مستلزم نہیں ہے۔

قولہ: "وقدر لھم اقداراً"۔

ترجمہ: اور ان (مخلوق) کی تقدیروں کا اندازہ مقرر کیا (کہ ان کی قسمت لکھی)۔

تشریح:۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا"۔ (الفرقان:۲)

(اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا)۔

نیز فرمایا:

"إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ"۔ (القمر:۴۹)

(ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا)۔

اور فرمایا:

"وَكَانَ أَمْرُ اللهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا"۔ (الاحزاب:۳۸)

(اور اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا ہوتا ہے)۔

اور صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"قدر الله مقادير الخلق قبل ان يخلق السموت والارض بخمسين الف سنة وكان عرشه على الماء"۔

(اللہ تعالی نے مخلوق کی تقدیرات کو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مقدر فرما دیا تھا جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔)

قوله: "وضرب لهم آجالاً"۔

ترجمہ: اور ان کی زندگی کی مدت مقرر کردی۔

تشریح:۔ یعنی اللہ تعالی نے مخلوق کی موت کا وقت مقرر کر دیا ہے جب اس کا وقت آپہنچتا ہے تو اس میں ایک لحہ کی تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی، فرماتے ہیں:

"فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ"۔

(الاعراف:۳۴)

(سو جس وقت ان کی میعاد آجائے گی اس وقت ایک ساعت نہ پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے)۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا"۔

(آل عمران:۱۴۵)

(اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدون حکم خدا کے اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے)۔

اہل سنت کے نزدیک مقتول میت باجلہ ہے:۔

یہاں ایک بحث یہ ہے کہ جو شخص قتل کیا جاتا ہے تو اپنے اجل اور مدت عمر کے ختم ہی پر مقتول ہوتا ہے یا قتل کے سبب بدون اجل اور وقت مقرر آئے ہوئے بھی موت کا شکار ہوجاتا ہے"معتزلہ کہتے ہیں کہ قتل کے ذریعہ مقتول کی اجل کو منقطع کر دیا جاتا ہے وہ اپنے وقت مقررہ پر نہیں مرتا چنانچہ اگر وہ قتل نہ ہوتا تو وہ وقت مقرر تک زندہ رہتا، گویا وہ انسانی مقتول کے لئے دو اجل کے قائل ہیں۔معتزلہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف یہ منسوب کیا جائے کہ اس نے مقتول کے لئے ایک ایسی اجل بھی مقرر فرمائی جس کے متعلق وہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ اس اجل تک وہ زندہ نہ رہے گا، یا پھر یہ خرابی لازم آئے گی کہ احد الامرین (قتل یا طبعی موت) کو اجل مقرر کیا، حالانکہ ایسے امر کا صدور ایسی ذات سے ہوتا ہے جو عواقب اور انجام سے بے خبر ہو تعالی اللہ عن ذالك علوا کبیرا۔

اہل سنت والجماعت کے نزدیک مقتول کو اپنی اجل اور وقت مقرر پر موت آتی ہے۔اللہ تعالی یہ مقدر فرمادیتے ہیں کہ فلاں شخص کی موت بیماری کے سبب ہوگی اور فلاں کی قتل کے سبب اور فلاں کی پانی میں ڈوبنے اور فلاں کی آگ میں جلنے اور فلاں کی فلاں حادثہ کے سبب موت واقع ہوگی۔کیونکہ اللہ تعالی جس طرح موت وحیات کا خالق ہے اسی طرح موت وحیات کے اسباب کا بھی خالق ہے۔

معتزلہ کے مذہب کی بناء پر اہل سنت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب شخص مقتول میت باجلہ ہے تو قاتل پر قصاص نہ ہونا چاہئے۔اس کا جواب یہ ہے کہ قاتل پر قصاص مقتول کے مرنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ قاتل نے امر منھی عنہ کا ارتکاب کیا ہے کیونکہ قتل موت کا ایسا سبب ہے جو ممنوع اور محظور ہے۔

صلہ رحمی درازیٔ عمر کا سبب:۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ مدتِ عمر مقرر ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ:"صلة الرحم تزيد في العمر"(صلہ رحمی عمر بڑھاتی ہے)[1]۔دونوں میں تعارض ہوا۔اس کا جواب یہ ہے کہ تعارض نہیں ہے اس لئے کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صلہ رحمی درازیٔ عمر کا سبب ہے،اور اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر فرمادیا ہے کہ یہ شخص صلہ رحمی کرے گا اور اس سبب سے اس مدت تک زندہ رہے گا اور اگر وہ سبب نہ پایا جاتا تو اس مدت تک زندہ نہ رہتا،لیکن اس سبب کو بھی اللہ تعالیٰ ہی نے مقدر فرمایا ہے،اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی نے یہ بھی مقدر فرمایا ہے کہ فلاں شخص قطع رحمی کرے گا اور اس مدت تک زندہ رہے گا،الحاصل درازیٔ عمر کے سبب صلہ رحمی یا عدم درازی کے سبب قطع رحمی کا فیصلہ بھی تقدیر ہی میں ہو چکا ہوتا ہے۔

قوله:-لم يخف عليه شئ قبل ان يخلقهم، وَعلِمَ ماهم عاملون قبل ان يخلقهم-

ترجمہ:مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی۔ اور ان کے پیدا کرنے سے پہلے بھی وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کریں گے؟

تشریح:۔ یہ روافض اور قدریہ پر رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شے کو پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم نہیں رکھتا،مصنفؒ نے ان پر رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ما کان وما یکون کا عالم ہے اور اسی طرح اس کا بھی عالم ہے کہ اگر آئندہ وہ شے ہوگی تو کس کیفیت کے ساتھ ہوگی؟اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ"۔(الملك:١٤)

(کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے)۔

---

[1] رواہ ابو یعلیٰ عن انس بسند ضعیف وشہد لہ احادیث کثیرہ۔١٢

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوقات کا علم ہے پیدا کرنے سے پہلے بھی اور پیدا کرنے کے بعد بھی، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ اور دوسری آیت:

"واللہُ خَلَقَکُم وَمَاتَعمَلُونَ"۔ (الصافات:۹۶)

(حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ افعال عباد اللہ تعالیٰ ہی کے مخلوق ہیں، اس لئے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہ ہوں گے، ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"وَلَورُدُّوا لَعَادُوْا لِمَانُھُوا عَنہُ"۔ (الانعام:۲۸)

(اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھی بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا)۔

اس سے ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس کا بھی علم ہے کہ آئندہ ہونے والی چیز کس کیفیت کے ساتھ ہوگی۔

قولہ: "وامرھم بطاعتہ ونھاھم عن معصیتہ"۔

ترجمہ: اور اس نے ان کو اپنی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی نافرمانی سے منع فرمایا۔

تشریح: ۔ مصنفؒ نے امر ونہی کو خلق وقدر کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَمَاخَلَقتُ الجِنَّ والانسَ اِلّالِیعبُدُونِ"۔ (الذاریات:۵۶)

(اور میں نے جن وانسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں)۔

قولہ: "کل شیٔ یجری بتقدیرہ (بقدرتہ) ومشیئتہ ومشیئتہ تنفذ لامشیئۃ العباد الاماشاء لھم فماشاء

لهم كان،ومالم يشألم يكن".

ترجمہ:اور ہر چیز اس کی تقدیر اور مشیت سے ہوتی ہے ،اور اس کی مشیت نافذ ہو کر رہتی ہے، بندوں کی مشیت نافذ نہیں ہوتی مگر وہی جوان کے لئے چاہے، بس وہ بندوں کے لئے جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔

تشریح:-ماشاء الله كان ومالم يشأ لم يكن:اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا:"ماشاء الله كان ومالم يشألم يكن "یہی تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالی کی مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّا اَن يَشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ"۔

(اور تم بدون خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے)۔

"وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّا اَن يَشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيماً حَكِيماً"۔

(الدهر:۳۰)

(اور بدون خدا کے چاہے تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے،خدا تعالی بڑا علم وحکمت والا ہے)۔

اور فرمایا:

"مَن يَشأ اللهُ يُضلِلهُ وَمَن يَشأ يَجعَله على صِراطٍ مستقيمٍ"۔ (الانعام:۳۹)

(اللہ تعالی جس کو چاہیں بے راہ کردیں اور وہ جس کو چاہیں سیدھی راہ پر لگائیں)۔

ان کے علاوہ بہت سی آیات میں یہی مضمون بیان فرمایا گیا ہے۔البتہ فرقہ قدریہ کا ایک گروہ اس کے خلاف زعم کرتا ہے ،وہ کہتا ہے کہ اللہ نے کافر سے ایمان چاہا اور

کافر نے کفر چاہا اور کفر ہی کیا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا چاہا ہوا نہیں ہوا اور کافر کا چاہا ہوا ہو گیا یعنی معاذ اللہ! کافر کی مشیت اللہ کی مشیت پر غالب ہو گئی تو بہ! استغفر اللہ! وتعالی اللہ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوّاً کبیراً۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کافر کا کفر بھی اللہ تعالی کی مشیت ہی سے ہے لیکن مشیت کونیہ سے نہ کہ مشیت شرعیہ سے کمامر تفصیلہ سابقاً۔

یہاں ایک اعتراض یہ ہے کہ درج ذیل آیت اور اسی مضمون کی دوسری آیات میں اللہ تعالی نے مشرکین کی اس بات پر مذمت فرمائی ہے کہ انہوں نے اپنے شرک کو اللہ کی نسبت کے ساتھ متعلق کیا تھا، فرماتے ہیں:

"وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوا لَوْشَاءَ اللہُ مَا عَبَدْ نَا مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ نَحْنُ وَلَآ اٰبَاۗؤُنَا"۔ (النحل:۳۵)

(اور مشرک یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالی کو منظور ہوتا تو خدا کے سوا کسی چیز کی نہ ہم عبادت کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا)۔

مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کا یہ کہنا کہ خدا نے چاہا تو ہم نے شرک کیا، قابل مذمت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کا شرک وکفر مشیت خداوندی سے نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس پر ان کی مذمت اس لئے نہیں فرمائی کہ یہ مشیتِ الٰہی سے نہ تھا، بلکہ یہ مذمت اس لئے فرمائی کہ ان لوگوں نے اللہ تعالی کی مشیت کو اس کی رضا اور پسندیدگی کی دلیل سمجھ لیا، اور یہ کہنے لگے کہ اگر اللہ کو یہ ناپسند ہوتا تو وہ اس کو نہ چاہتا، اس کے ساتھ اس کی مشیت متعلق نہ ہوتی، یعنی انہوں نے مشیت کو رضا کی دلیل قرار دے لیا یا اس لئے اللہ تعالی نے ان پر نکیر فرمائی کہ ان کا اعتقاد تھا کہ مشیت اس کی دلیل ہے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔ یا اس لئے ان پر نکیر اور مذمت فرمائی کہ مشیت کے ذکر سے ان کا مقصد در حقیقت حکمِ شریعت کی مخالفت تھی، اس کا ذکر انہوں نے کچھ توحید کی بناء پر نہیں کیا تھا، جس طرح کہ بددینوں کو جب کچھ کہا جاتا ہے تو وہ تقدیر کو بہانہ بنانے لگتے ہیں، حالانکہ وہ تقدیر کی

حقیقت پر ایمان بھی نہیں رکھتے، جیسے کہ جب ایک چور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا تو اس نے اپنی چوری کے لئے تقدیر ہی کا عذر پیش کیا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی تمہارا ہاتھ اللہ ہی کی قضاء وقدر سے کاٹ رہا ہوں اس پر اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

قوله:۔ یهدی من یشاء ویعصم ویُعافی فضلاً ویُضل من یشاء ویخذل ویبتلی عدلاً۔

ترجمہ: جس کو چاہتا ہے اس کو از راہ فضل ہدایت دیتا ہے اور (گناہ سے) بچاتا ہے اور عافیت عطا کرتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے اس کو از راہ عدل گمراہ کرتا ہے اور بے سہارا چھوڑ دیتا ہے اور آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔

تشریح:۔ فضلا: فضل کہتے ہیں: "اعطاء مالایستحق العبد بنفسه" کو۔ عدل: کہتے ہیں: "البدل المساوی من غیر ظلم" کو۔ مصنف امامؒ نے یہاں پر بھی معتزلہ کا رد فرمایا ہے، کیونکہ معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ اللہ پر وہ فعل واجب ہے جو اصلح للعبد ہو، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "ہدایت من اللہ" کے معنی راہِ صواب کا بیان کرنا ہے، اور اضلال کے معنی بندہ کا نام ضال رکھنا ہے، یا بالفاظ دیگر یہ کہ جب بندہ اپنے اندر ضلال اور گمراہی پیدا کرلے تو اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کا ضلال کا حکم لگانا۔ دراصل معتزلہ کے اس قول کی بنیاد ان کے اس اصل فاسد پر ہے کہ بندوں کے افعال خود بندوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں یعنی بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں، العیاذ باللہ!۔ اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے کاسب اور فاعل ہیں اور خالق ان کے افعال کا اللہ تعالیٰ ہے پس اللہ ہی ہدایت دینے والا ہے اور وہی ضلال میں بھی مبتلا کرنے والا ہے۔ چنانچہ رب العزت جل شانہ فرماتے ہیں:

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔

(القصص:٥٦)

(اے پیغمبر!) آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہے

ہدایت کر دیتا ہے)۔

پس اگر ہدایت کے معنی راہ کے بیان کرنے کے ہوتے تو نبی اکرم ﷺ سے اس کی نفی

کرنا صحیح نہ ہوتا، کیونکہ آپ نے تو راستہ سب دوست ودشمن کے سامنے بیان ہی فرمادیا ہے۔

دوسری جگہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

"وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا"۔ (السجدة:۱۳)

(اور اگر ہم کو منظور ہوتا تو ہم ہر شخص کو اس کا رستہ عطا فرماتے)۔

ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

"يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ"۔ (المدثر:۳۱)

(اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت

کر دیتا ہے)۔

اب اگر "ہدایت من اللہ" کے معنی بیان کرنے کے ہوتے تو چونکہ یہ ہر مومن

وکافر کے لئے عام ہے اس لئے ان آیات میں اور اسی طرح دوسری آیات میں ہدایت کو

مشیت کی قید سے مقید کرنا صحیح نہ ہوتا۔

قوله: "وکلهم یتقلبون فی مشیئته بین فضله وعدله"۔

ترجمہ: اور سب کے سب اس کی مشیت کے مطابق اس کے فضل اور

عدل کے درمیان الٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔

تشریح:۔ چنانچہ مخلوق میں سے بعض کے اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا، انہیں

ہدایت عطا فرمائی، تو وہ دولت ایمان سے سرفراز ہوئے اور بعض کے ساتھ عدل کا معاملہ

فرمایا تو وہ ضلال وگمراہی کی وادی میں سرگرداں ہوئے، قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

"هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ"۔

(التغابن:۲)

(وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا سو تم میں بعضے کافر ہیں اور بعضے مومن ہیں)۔

وسیأتی زیادة الکلام علی هذه المسئلة ای مسئلة القدر فیما یأتی ان شاء الله تعالی۔

قوله:- لا رادَّ لِقضائه ،ولا مُعقبَ لحکمه ،ولا غالب لامره ،وهو متعال عن الاضداد والانداد۔

ترجمہ: نہ اس کا فیصلہ کوئی ٹال سکتا ہے اور نہ اس کے حکم کو کوئی مؤخر کر سکتا ہے اور نہ اس کے امر پر کوئی غالب ہو سکتا ہے اور وہ مدمقابل اور ہمسروں سے بالاتر ہے۔

تشریح:- ضد: مخالف اور معارض کو کہتے ہیں خواہ مثل ہو یا نہ ہو اور ند: اس مقابل کو کہتے ہیں جو مثل ہو، پس حق تعالی کا نہ کوئی ایسا مخالف ہے جو اس کے مثل نہ ہو اور نہ کوئی ایسا مقابل ہے جو اس کے مثل ہو، ارشاد ربانی ہے:

وَلَم یَکُن لَه کُفُواً اَحَدٌ. (الاخلاص ۴)

(اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے)۔

ضد اور ند کی نفی کر کے مصنف ؒ نے معتزلہ پر رد بھی فرمادیا کیونکہ یہ لوگ بندوں کو اپنے افعال کا خالق کہہ کر خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

قوله:- امنا بذالك کله وایقنا ان کلا من عنده۔

ترجمہ: ہم ان سب (مذکورہ باتوں) پر ایمان رکھتے ہیں ،اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ سب چیزیں اللہ تعالی کی طرف سے ہیں۔

تشریح:- ایمان کی بحث آگے آرہی ہے ان شاء اللہ تعالی اور ایقان کے معنی استقرار کے ہیں جو قرّ الماء فی الحوض- اذا استقر (پانی حوض میں ٹھہر گیا) سے ماخوذ ہے اور "کلا" کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، تقدیری عبارت یہ ہے:

-کل کائن محدث من عند الله ای بقضائه وقدره وارادته-

اس پر مفصل کلام ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

قوله:-وانّ محمداً صلی الله علیه وسلم عبده المصطفیٰ ونبیه المجتبیٰ ورسوله المرتضیٰ-

ترجمہ:-اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے منتخب بندہ اور برگزیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں۔

تشریح: نبوت کی بحث:

مصطفیٰ، مجتبیٰ اور مرتضیٰ:-یہ تینوں قریب المعنی الفاظ ہیں اور ''انّ محمداً '' میں جو انّ ہے وہ بکسر الہمزہ ہے کیونکہ یہ ''انّ الله واحد لاشریك له '' پر معطوف ہے اور معطوف و معطوف علیہ دونوں اس ''نقول'' کے معمول ہیں جو ''نقول فی توحید اللہ'' میں ہے۔

''عبده المصطفیٰ ''مصنفؒ نے وصف عبدیت کو دوسرے اوصاف پر اس لئے مقدم فرمایا کہ عبدیت دوسرے اوصاف پر وجوداً مقدم ہے اس لئے مناسب ہوا کہ ذکر میں بھی مقدم ہو، اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ آپ ﷺ کو اپنے عبد ہونے پر عار نہیں ہے بلکہ اس پر فخر ہے، کما اوضح هذه النکتة مُلاعلی القاری فی شرح الفقه الاکبر۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ مقامات قُرب ورضا میں مقام عبدیت سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں کہ مخلوق کے اندر جس قدر عبدیت کا تحقق ہوتا جائے گا اسی قدر اس کے درجات بلند اور اس کا کمال اوجِ ترقی پر پہنچے گا، چنانچہ نبی اکرم ﷺ کو عبدیت کا جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور کو حاصل نہیں، یہی سبب ہے کہ قرآن کریم میں متعدد ایسے مقامات پر جہاں آپ کی محبوبیت اور مقربیت کا اظہار مقصود تھا اللہ تعالیٰ نے لفظ ''عبد'' ہی کے ساتھ آپ کا ذکر فرمایا ہے، ارشاد فرماتے ہیں:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔ (الاسراء:۱)
(پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گیا)۔

اور فرمایا:

"وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا۔ (البقرۃ:۲۳)
(اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ (خاص) پر۔

ایک اور جگہ فرمایا:

فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی۔ (النجم:۱۰)
(پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی)۔

یہیں سے ان جاہل صوفیاء کے قول کی غلطی بھی معلوم ہوگئی جن کا گمان باطل یہ ہے کہ ایک وقت وہ آتا ہے جب بندہ بندگی اور عبدیت سے نکل جاتا ہے، اور ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو آپ کو بشریت کی حدود سے نکال کر الوہیت کی حدود میں داخل کرنے کے درپے ہیں، اور اسی کو "عشق مصطفیٰ" ﷺ کی معراجِ کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہی وہ بات تھی جس سے رسول اللہ ﷺ نے بالصراحۃ منع فرمایا تھا، آپ کا ارشاد ہے:

"لَا تُطۡرُوۡنِیۡ کَمَا اَطۡرَتِ النَّصَارٰی عِیۡسَی بۡنَ مَرۡیَمَ"۔
(مجھے حد سے نہ بڑھانا، جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم کو حد سے بڑھادیا)۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے ؎

اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھایا

نبی کو جو چاہا خدا کر دکھایا

نبی اور رسول کی تحقیق لغوی:۔

''ونبیه المجتبیٰ ورسوله المرتضیٰ'' لفظ نبی لغت میں مہموز بھی ہے اور غیر مہموز بھی، اگر مہموز ہے تو ''نبأ'' بمعنی خبر سے مشتق ہے اور غیر مہموز ہے تو ''نبوۃ اور نباوۃ'' بمعنی بلند زمین سے مشتق ہے ''نبأ'' سے مشتق ہو تو نبی کو نبی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالی کی وحی کے ذریعہ غیب کی باتوں کی خبر دیتے ہیں اور ''نبوۃ'' سے مشتق ہو تو اس لئے نبی کہتے ہیں کہ وہ رفیع المنزلت اور عظیم المرتبت ہوتے ہیں۔ اور ''رسول'' رَسُلَ اللبن بمعنی مسلسل دودھ آنا سے مشتق ہے، پس رسول کو رسول اس لئے کہتے ہیں کہ ان پر مسلسل وحی کا نزول ہوتا ہے۔ (اصول الدین لابی منصور عبدالقاہر بن طاہر التمیمی م ۴۲۹ھ)

نیز رسول لغت میں پیغامبر اور قاصد کو بھی کہتے ہیں تو چونکہ رسول بندوں کی طرف اللہ تعالی کے پیغامبر ہوتے ہیں اس لئے ان کو رسول کہتے ہیں۔

نبی اور رسول میں فرق:۔

امام ابن ہمامؒ کے نزدیک مختار یہ ہے کہ نبی اور رسول مترادف ہیں، لیکن جمہور علماء دونوں میں فرق کے قائل ہیں، پھر اس میں مشہور قول یہ ہے کہ رسول وہ ہے جس کے اوپر وحی نازل ہو اور اس کو تبلیغ کا حکم ہو، اور نبی وہ ہے جس کے اوپر وحی نازل ہو خواہ اس کو تبلیغ کا حکم ہو یا نہ ہو، اس بناء پر رسول نبی سے اخص ہے، کیونکہ ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں، البتہ رسالت بالذات نبوت سے اعم ہے، کیونکہ نبوت رسالت کا جزو ہے، اس لئے کہ رسالت نبوت اور غیر نبوت دونوں کو شامل ہے، برخلاف رسول کے کہ وہ نبی و غیر نبی کو شامل نہیں بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک نبی اس کو کہتے ہیں کہ جس کو تبلیغ کا حکم نہ ہو اور اصول الدین میں یہ فرق لکھا ہے کہ نبی وہ ہے جس کے پاس فرشتہ وحی لے کر آئے۔ اور رسول وہ ہے جو مستقل شریعت لائے یا پہلی شریعت کے بعض احکام کو منسوخ

کردے۔

اثبات نبوت:۔

نبی اور رسول کی تعریف میں معلوم ہوا کہ ان پر وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے، پہلے کچھ دہریئے ایسے تھے جو وحی کے امکان کے منکر تھے، اور اس زمانہ میں بھی ایک پورا طبقہ ایسا موجود ہے جو ادعائے ہمہ دانی کے باوجود وحی آسمانی کے امکان اور وجود کا انکار کرتا ہے ہم بہت مناسب خیال کرتے ہیں کہ اس موقع پر کتاب ''علم جدید کا چیلنج'' سے وہ اقتباس پیش کریں جو موجودہ طرز استدلال میں اپنے دعویٰ کے اثبات کے لئے بہترین اور محکم دلیل ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''ہمارے گرد وپیش ایسے واقعات موجود ہیں جو ہمارے محدود دائرہ سماعت سے کہیں بالاتر ہیں، مگر اس کے باوجود انہیں اخذ کیا جا سکتا ہے، انسان نے آج ایسے آلات ایجاد کر لئے ہیں جن سے وہ ایک مکھی کے چلنے کی آواز میلوں دور سے اس طرح سن سکتا ہے جیسے وہ اس کے کان کے پردہ پر رینگ رہی ہو، حتیٰ کہ وہ کائناتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے تصادم تک کو ریکارڈ کر لیتا ہے۔ اس طرح کے آلات اب کثرت سے انسان کو حاصل ہو چکے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اخذ وسماعت کی ایسی صورتیں بھی ممکن ہیں جو معمولی حواس کے لئے ناممکن ،،رنا قابل قیاس ہوں۔

پھر یہ مخصوص ذرائع ادراک صرف مشینی آلات تک محدود نہیں، بلکہ حیوانوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فطرت نے خود ذی حیات اشیاء کے اندر ایسی طاقتیں رکھی ہیں، بے شک عام انسان کے حواس بہت محدود ہیں مگر جانوروں کے حواس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کتا اپنی متجسس ناک سے اس جانور کی بو سونگھ لیتا ہے جو راستہ سے نکل گیا، چنانچہ کتے کی اس صلاحیت کو جرائم کی تفتیش میں استعمال کیا جاتا ہے، چور جس تالے کو توڑ کر کمرہ میں گھسا ہے، اس تالے کو جاسوسی کتے کو سونگھایا جاتا ہے اور اس کے بعد اسے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ سینکڑوں انسانوں کے درمیان سے اس شخص کو تلاش کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جس نے اپنے ہاتھ

سے تالے کو چھوا تھا، کتنے جانور ہیں جو ایسی آوازیں سنتے ہیں جو ہماری قوتِ سماعت سے

باہر ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ جانوروں میں اشراق (Telepathy) کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ایک مادہ پتنگے کو کوٹھے میں کھلی کھڑکی کے پاس رکھ دیجئے، وہ کچھ مخصوص اشارے کرے گی، یہ اشارے اسی نوع کے نر پتنگے حیرت انگیز فاصلے سے سُن لیں گے اور اس کا جواب دیں گے۔ جھینگر اپنے پاؤں یا پر ایک دوسرے پر رگڑتا ہے، رات کے سناٹے میں آدھے میل دُور تک یہ آواز سنائی دیتی ہے، یہ چھ سوتن ہوا کو ہلاتا ہے اور اس طرح اپنے جوڑے کو بلاتا ہے، اس کی مادہ جو بظاہر بالکل خاموش ہوتی ہے، مگر پُراسرار طریقہ پر کوئی ایسا بے آواز جواب دیتی ہے جو نر تک پہنچ جاتا ہے، نر اس پراسرار جواب کو جسے کوئی بھی نہیں سُنتا حیرت انگیز طور پر سُن لیتا ہے، اور ٹھیک اسی سمت میں اس کے مقام پر جا کر اس سے مل جاتا ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک معمولی ٹڈے کی قوت سماعت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ ہائیڈروجن کے ایٹم کے نصف قطر کے برابر کی حرکت تک وہ محسوس کر لیتا ہے۔

اس طرح کی کثیر مثالیں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ایسے ذرائع مواصلات ممکن ہیں جو بظاہر نظر نہ آتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ بطور واقعہ موجود ہوں، اور مخصوص حواس رکھنے والے ذی حیات اس کا ادراک کر لیتے ہوں۔ ان حالات میں اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''مجھے خُدا کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیتی ہے جن کو عام لوگ نہیں سنتے'' تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟ اگر اس دنیا میں ایسی آوازیں ممکن ہیں جو آلات سنتے ہوں مگر انسان نہ سنتے ہوں، اگر یہاں ایسی پیغام رسانی ہو رہی ہے جس کو ایک مخصوص جانور تو سُن لیتا ہے، مگر دوسرا اسے نہیں سنتا تو آخر اس واقعہ میں استبعاد کا کیا پہلو ہے کہ خُدا اپنی مصالح کے تحت بعض مخفی ذرائع سے ایک انسان تک اپنا پیغام بھیجتا ہے، اور اس کے اندر ایسی صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے کہ وہ اس کو اخذ کر سکے اور اس کو پوری طرح سمجھ

کر قبول کرلے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی والہام کے تصور اور ہمارے مشاہدات وتجربات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، بلکہ یہ اسی قسم کے مشاہدات کی ایک مخصوص صورت ہے، جس کا مختلف شکلوں میں ہم تجربہ کر چکے ہیں، یہ ایک امکان کو واقعہ کی صورت میں تسلیم کرنا ہے۔

پھر اشراق اور غیب دانی کے تجربات بتاتے ہیں کہ یہ چیز صرف حیوانوں تک محدود نہیں بلکہ انسان کے اندر بھی بالقوۃ اس قسم کی خصوصیات موجود ہیں۔ ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں: "فرد کی نفسیاتی سرحدیں مکان اور زمان کے اندر محض فرضی ہوتی ہیں" چنانچہ ایک عامل کسی آواز اور خارجی ذریعہ کے بغیر اپنے معمول پر توجہ ڈالتا ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اس پر مصنوعی نیند طاری کر سکتا ہے، اس کو ہنسا یا رلا سکتا ہے اس کے ذہن میں مخصوص خیالات القاء کر سکتا ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نہ کوئی ظاہری آلہ استعمال ہوتا ہے اور نہ عامل اور معمول کے سوا کوئی شخص اسے محسوس کرتا ہے، پھر اسی نوعیت کا واقعہ بندہ اور خدا کے درمیان کیوں ہمارے لئے ناقابلِ تصور ہو، خدا کو ماننے اور انسانی زندگی میں اشراقی قوت کا تجربہ کر لینے کے بعد ہمارے لئے وحی والہام سے انکار کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

دسمبر ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے، بویریا کے حکام نے ایک وی، آئی عامل توجہ (Hypnotist) فرنز مزوبل پر ریڈیو پروگرام میں "خلل اندازی بذریعہ ٹیلی پیتھی" کے الزام میں مقدمہ دائر کر دیا، ریجنا ہوٹل واقع میونخ میں اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزوبل نے ایک تماشہ بین کو تاش کا ایک پتہ اٹھا کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کا نام حسب منشاء ترتیب کے ساتھ اپنے دل میں سوچ لے، ہپناٹسٹ نے دعویٰ کیا کہ وہ اس پتے کا نام مع ترتیب (جیسا کچھ پتہ اٹھانے والے نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا) خود جانے بغیر ریڈیو کے اس اناؤنسر کی جانب منتقل کر دے گا جو اس وقت ریڈیو پر خبریں سنا رہا تھا۔ چند ہی سیکنڈ کے بعد حیرت زدہ سامعین نے میونخ ریڈیو کے اناؤنسر کی لڑکھڑاتی زبان میں سنا ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ۔ پتے کا نام بھی درست تھا اور ترتیب بھی پتہ اٹھانے

والے کی سوچ کے عین مطابق تھی۔اناؤنسر کی وحشت اس آواز سے واضح طور پر مترشح ہو رہی تھی، تاہم وہ خبریں سنائے چلا گیا، ادھر سینکڑوں ریڈیو سننے والے اس عجیب واقعہ کا سبب معلوم کرنے کے لئے براڈکاسٹنگ اسٹیشن کو ٹیلی فون کر رہے تھے، کیونکہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ خبروں کے پروگرام کے درمیان، ریجنا ہوٹل، حکم کی ملکہ" کے الفاظ کا کیا مطلب؟ ڈاکٹر معائنہ کے لئے آیا تو اس نے دیکھا کہ اناؤنسر شدید اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہے، اناؤنسر نے بتایا کہ خبریں پڑھتے پڑھتے اس کے سر میں اچانک ایک درد سا اٹھا، اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

میں کہوں گا کہ اگر انسان کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ایک انسان کے خیالات دوسرے انسان کو بعینہ منتقل کر دے، جبکہ دونوں کے درمیان غیر معمولی فاصلہ ہو اور اس کے لئے کوئی ظاہری واسطہ استعمال نہ کیا گیا ہو، تو القائے کلام کا بھی واقعہ خالق کائنات کی طرف سے کیوں وجود میں نہیں آسکتا۔انسانی صلاحیت کا یہ اظہار، جس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں، یہ ایک تجرباتی قرینہ ہے جس سے ہم اس امکان کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کے بغیر کس طرح الفاظ اور معانی کا تعلق قائم ہوتا ہے اور ایک کے خیالات دوسرے کو بعینہ منتقل ہو جاتے ہیں، اشراقی پیغام رسانی جو بندوں کے درمیان ایک معلوم اور ثابت شدہ واقعہ ہے، ایک ایسا قرینہ ہے جس سے ہم اس اشراق کو سمجھ سکتے ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان ہوتا ہے اور جس کی کامل اور متعین صورت کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وحی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسی قسم کا ایک مخصوص کائناتی اشراق ہے جس کا تجربہ محدود پیمانے پر ہم انسانی زندگی میں بار بار کر چکے ہیں اور کرتے رہے ہیں"۔(علم جدید کا چیلنج: از ص: ۱۹۲ تا ۱۹۷)

وحی اور رسول کی ضرورت:۔

وحی کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے بھی فاضل مصنف کا طرز استدلال عصری طریقہ پر مبنی ہے اور اذہان حاضرہ کو متاثر کرنے والا ہے، اس لئے اس موقع پر بھی ہم انہی

کا اقتباس پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''وحی والہام کو ممکن ماننے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں کہ خُدا کسی انسان سے مخاطب ہو اور اس کے ذریعہ سے اپنا کلام بھیجے، اس کی ضرورت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول آدمی کو جس سے باخبر کرتا ہے وہ آدمی کی شدید ترین ضرورت ہے، مگر وہ خود اپنی کوشش سے اُسے حاصل نہیں کر سکتا، ہزاروں برس سے انسان حقیقت کی تلاش میں ہے، وہ سمجھنا چاہتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ انسان کا آغاز وانجام کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ انسان کو کیسے قابو میں لایا جائے؟ زندگی کو کیسے منظم کیا جائے کہ انسانیت کے سارے تقاضے اپنے صحیح مقام کو پاتے ہوئے متوازن ترقی کرسکیں، مگر ابھی تک اس تلاش میں کامیابی نہیں ہوئی، تھوڑی مدت کی تلاش وجستجو کے بعد ہم نے لوہے اور پیٹرول کی سائنس تو بالکل ٹھیک جان لی اور اسی طرح طبیعی دنیا کی سینکڑوں سائنسوں کے بارے میں صحیح ترین واقفیت حاصل کرلی، مگر انسان کی سائنس ابھی تک دریافت نہیں ہوئی؟ طویل ترین مدت کے درمیان بہترین دماغوں کی لاتعداد کوششوں کے باوجود یہ سائنس ابھی تک اپنے موضوع کی ابتدائیات کو بھی متعین نہ کرسکی، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں ہمیں خدا کی مدد کی ضرورت ہے، اس کے بغیر ہم اپنا ''دین'' **معلوم نہیں** کرسکتے، یہ بات انسانِ جدید کو تسلیم ہے کہ زندگی کا راز ابھی تک اس کو معلوم نہ ہوسکا۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل کے الفاظ میں: ''فرانسیسی انقلاب کے اصول اور مارکس اور لینن کے نظریے محض ذہنی اور قیاسی افسانوں پر منطبق ہوسکتے ہیں، اس بات کو صاف طور پر محسوس کرنا چاہئے کہ انسانی تعلقات کے قوانین اب تک معلوم نہیں ہوسکے ہیں، سماجیات اور اقتصادیات کے علوم محض قیاسی ہیں اور ناقابلِ ثبوت ہیں (Man The UN-Known P.51) زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرتناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کے لئے ناقابلِ دریافت ہے، ایک طرف صورت حال یہ

ہے کہ زندگی کی حقیقت کو جاننا ضروری ہے، اس کے بغیر ہم کوئی عمل نہیں کر سکتے، ہمارے بہترین جذبات اسے جاننا چاہتے ہیں، ہماری ہستی کا اعلیٰ ترین جزو جس کو ہم فکر یا ذہن کہتے ہیں، وہ اس کے بغیر مطمئن ہونے کے لئے کسی طرح راضی نہیں، ہماری زندگی کا سارا نظام اس کے بغیر ابتر ہے اور لاینحل معمہ بنا ہوا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، مگر یہی سب سے بڑی ضرورت ہم خود سے پوری نہیں کر سکتے۔ کیا یہ صورت حال اس بات کی کافی دلیل نہیں ہے کہ انسان "وحی" کا محتاج ہے، زندگی کی حقیقت کا انتہائی ضروری ہونے کے باوجود انسان کے لئے ناقابلِ دریافت ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا انتظام اسی طرح خارج سے کیا جانا چاہئے جیسے روشنی اور حرارت انسان کے لئے ناگزیر ہونے کے باوجود اس کے اپنے بس سے باہر ہے، مگر قدرت نے حیرت انگیز طور پر سورج کے ذریعہ اس کا انتظام کر دیا ہے"۔ (ایضاً از ص:۱۶۷ تا ص:۱۷۰)

نبی اکرم ﷺ کی نبوت کا اثبات:۔

متکلمینِ اسلام انبیائے کرام علیہم السلام کی نبوت کے اثبات کے لئے معجزات اور خوارقِ عادات کو بطورِ دلیل پیش کرتے ہیں اور آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بے شمار معجزات وخوارق عادات جو بتواتر منقول ہیں اور جن پر علماء کی مستقل تصانیف موجود ہیں آپ کی نبوت کی دلیل ہیں، جن میں سب سے بڑا معجزہ جو آج تک ہمارے سامنے موجود ہے اور قیامت تک از روئے وعدۂ الٰہی موجود رہے گا "قرآن کریم" ہے جس کا اعجاز مختلف پہلوؤں سے ہے۔ مثلاً اس کا اس حد تک فصیح وبلیغ ہونا کہ باوجود بار بار چیلنج دینے کے تمام بلغائے عرب کا اس جیسا کلام بنانے سے عاجز رہنا، غیب کی باتوں کی خبر دینا، گزشتہ تاریخوں کو بیان کرنا، آئندہ کے لئے پیشین گوئیاں دینا اور ان کا صحیح واقع ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اس موضوع پر علماء کی مستقل تصانیف موجود ہیں **من اراد التفصیل فلیراجع الیھا**۔ لیکن صرف معجزات اور خوارق ہی میں دلیلِ نبوت کا انحصار نہیں ہے، اس کے علاوہ بہت سے ایسے قرائن قویہ ہوتے ہیں جن کو دیکھنے اور سننے والا، اس نتیجہ پر بداہۃً اور بالیقین

پہنچ جاتا ہے کہ یہ شخص جو اللہ کے نبی ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے واقعی اللہ کا سچا نبی اور پیغمبر ہے، اس کی کافی توضیح آگے آنے والے اقتباس سے بھی ان شاء اللہ تعالیٰ ہو جائے گی۔ فلیتد بر

ہم کتاب محولہ بالا ہی سے ایک اقتباس اس سلسلہ میں بھی پیش کرتے ہیں، تا کہ نئے اسلوب کلام سے بھی واقفیت بہم پہنچ کر مزید نفع حاصل ہو، فاضل مصنف رقمطراز ہیں:

''وحی والہام کو ممکن اور ضروری تسلیم کر لینے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو شخص اس کا دعویٰ کر رہا ہے وہ فی الواقع صاحبِ وحی ہے یا نہیں؟ ہمارے عقیدے اور ایمان کے مطابق اس قسم کے صاحبانِ وحی بہت کثیر تعداد میں اس زمین پر پیدا ہو چکے ہیں، مگر اس باب میں ہم خاص طور پر آخری رسول حضرت محمد ﷺ کے دعوائے نبوت پر گفتگو کریں گے، اس لئے کہ آپ کے دعوائے نبوت کا ثابت ہونا دراصل سارے انبیاء کے دعوائے نبوت کا ثابت ہونا ہے، کیونکہ آپ دیگر انبیاء کے منکر نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں اور اس لئے بھی کہ اب موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے آپ ہی خدا کے رسول ہیں، آپ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں ہے، اس لئے عملاً اب نسلِ انسانی کی نجات وخسران کا معاملہ آپ ہی کے دعوائے نبوت کو ماننے یا نہ ماننے سے متعلق ہے۔

سن عیسوی کے لحاظ سے ۲۹ راگست ۵۷۰ء کی صبح کو مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا، چالیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ خدا نے مجھ کو اپنا آخری رسول بنایا ہے اور میرے پاس اپنا پیغام بھیج کر مجھے اس خدمت کے لئے مامور کیا ہے کہ میں اس کے پیغام کو تمام انسانوں تک پہنچا دوں، جو میری اطاعت کرے گا وہ خدا کے یہاں سرفراز ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا وہ ہلاک کر دیا جائے گا۔

یہ آواز آج بھی پوری شدت کے ساتھ ہمارے سروں پر گونج رہی ہے، یہ ایسی آواز نہیں ہے کہ کوئی شخص اس کو سنے اور نظر انداز کر دے، بلکہ یہ ایک زبردست مطالبہ ہے، اس آواز کا تقاضا ہے کہ ہم اس کے اوپر غور کریں۔ اس کے بعد اگر اس کو غلط پائیں تو کھلے دل سے اسے رد کر دیں اور صحیح پائیں تو کھلے دل سے اس کو قبول کر لیں۔

کسی چیز کے علمی حقیقت بننے کے لئے اسے تین مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔

(۱) مفروضہ (Hypothesis)

(۲) مشاہدہ (Observation)

(۳) تصدیق (Verification)

پہلے ایک مفروضہ یا تصور ذہن میں آتا ہے، پھر مشاہدہ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہو جائے تو اس مفروضہ کو واقعہ تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس ترتیب میں کبھی فرق بھی ہو جاتا ہے، یعنی پہلے کچھ مشاہدات سامنے آتے ہیں اور ان مشاہدات سے ایک تصور یا مفروضہ ذہن میں قائم ہوتا ہے، پھر جب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مشاہدات فی الواقع اس مفروضہ کی تصدیق کر رہے ہیں تو وہ حقیقت قرار پا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق نبی کا دعوائے نبوت گویا کہ ایک مفروضہ کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشاہدات اس کی تصدیق کر رہے ہیں یا نہیں، اگر مشاہدات اس کے حق میں گواہی دے دیں تو اس کی حیثیت ایک مصدقہ حقیقت کی ہو جائے گی اور ہمارے لئے ضروری ہو جائے گا کہ ہم اس کو تسلیم کریں۔

اب دیکھئے کہ وہ کیا مشاہدات ہیں جو اس "مفروضہ" کی تصدیق کے لئے درکار ہیں جن کی بنیاد پر ہم نبی کے دعوے کو جانچیں اور اس کے مطابق دعوے کا صحیح یا غلط ہونا معلوم کریں۔ دوسرے لفظوں میں وہ کون سے خارجی مظاہر ہیں جن کی روشنی میں یہ متعین ہوتا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے رسول تھے، ذات رسول میں جمع ہونے والی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم ان کو خدا کا رسول مانیں۔ میرے نزدیک یہ حسب ذیل ہیں، جو شخص اپنے بارے میں رسول ہونے کا دعوی کرے، اس کے اندر دو خصوصیات لازمی طور پر ہونی چاہئیں۔

(۱) ایک یہ کہ وہ غیر معمولی طور پر ایک معیاری انسان ہو، کیونکہ وہ شخص جس کو ساری نسل انسانی میں اس لئے چُنا جائے گا کہ وہ خدا سے ہمکلام ہو اور زندگی کی درستگی کا پروگرام

اس کے ذریعہ سے منکشف کیا جائے، یقینی طور پر اس کو نسل انسانی کا بہترین فرد ہونا چاہئے، اور اس کی زندگی میں اس کے آدرشوں (Ideals) کو تمام وکمال ظہور کرنا چاہئے، اگر اس کی زندگی ان اوصاف سے مزین ہے تو یہ اس کے دعویٰ کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے، کیونکہ اس کا دعویٰ اگر غیر حقیقی ہو تو وہ زندگی میں اتنی بڑی حقیقت بن کر نمایاں نہیں ہوسکتا کہ اس کو اخلاق وکردار میں ساری انسانیت سے بلند کردے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس شخص کا کلام اور اس کا پیغام ایسے پہلوؤں سے بھرا ہوا ہونا چاہئے جو عام انسان کے بس سے باہر ہو جس کی اُمید کسی ایسے ہی انسان سے کی جاسکتی ہو جس پر مالک کائنات کا سایہ پڑا ہو، عام انسان ایسا کلام پیش کرنے پر قادر نہ ہوسکیں۔ یہ دو معیار ہیں جن پر ہمیں رسول کے دعوائے نبوت کو جانچنا ہے۔

پہلی بات کے سلسلہ میں تاریخ کی قطعی شہادت یہ ہے کہ محمد ﷺ ایک غیر معمولی سیرت کے آدمی تھے، ہٹ دھرمی کے ذریعہ تو کسی بھی حقیقت کا انکار ممکن ہے اور دھاندلی کی زبان میں ہر اُلٹی بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ مگر جو شخص اس قسم کے تعصب کا مریض نہ ہو اور کھلے دل سے حقیقت کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ لازماً تسلیم کرے گا کہ آپ کی زندگی اخلاقی حیثیت سے نہایت اعلیٰ وارفع تھی۔

محمد ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی، اس سے پہلے آپ کا پورا دور اخلاقی لحاظ سے اس قدر ممتاز تھا کہ آپ کو لوگ سچا اور دیانت دار کہہ کر پکارنے لگے تھے "الصادق الامین" آپ کا مشہور لقب بن گیا تھا، آپ کے متعلق یہ بات ساری آبادی میں متفق علیہ تھی کہ آپ ایک نہایت ایماندار شخص ہیں اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ دعوائے نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا، جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجرِ اسود کو نئی تعمیر میں کون شخص اس کی جگہ نصب کرے، چار پانچ دن تک یہ اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ تلواریں چل جائیں، بالآخر طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح کو سب سے پہلے بیت اللہ میں داخل ہو،

دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے
"هذا الامين رضينا" (امین آ گیا، ہم سب ان کے فیصلہ پر متفق ہیں) (بخاری: باب
ماذکر فی الحجر الاسود) ہمیں تاریخ میں کسی ایسے شخص کا علم نہیں جس کی زندگی بحث ونزاع
کا موضوع بننے سے پہلے چالیس سال جیسی لمبی مدت تک لوگوں کے سامنے رہی ہو اور اس
کے جاننے والے اس کی سیرت وکردار کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں۔

پہلی بار آپ پر غارِ حراء میں وحی اُتری تو یہ آپ کے لئے ایک ایسا غیر معمولی واقعہ
تھا جس کا آپ کو پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، آپ شدت احساس کے ساتھ گھر لوٹے اور اپنی
اہلیہ سے، جو آپ سے عمر میں بڑی تھیں، اس واقعہ کا ذکر کیا، اہلیہ کا جواب تھا: "اے
ابوالقاسم! خدا یقیناً آپ کی حفاظت کرے گا، کیونکہ آپ سچ بولتے ہیں، آپ دیانت دار
ہیں، آپ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں"۔ نبوت
ملنے کے بعد جب آپ نے پہلی بار کوہِ صفا کے دامن میں لوگوں کو جمع کر کے اپنی دعوت پیش
کی، اس وقت آپ نے اپنی دعوتی تقریر شروع کرنے سے پہلے حاضرین سے یہ سوال کیا
"تمہارا میرے متعلق کیا خیال ہے" جواب میں بالاتفاق یہ آواز آئی "ما جربنا عليك
الا صدقاً" (تمہارے اندر ہم نے سچائی کے سوا کوئی اور بات نہیں دیکھی
ہے) پیغمبر ﷺ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں یہ ایک ایسا ممتاز تاریخی ریکارڈ ہے کہ
جس کی مثال کسی بھی شاعر، فلسفی، مفکر یا مصنف کے یہاں نہیں مل سکتی۔

جب آپ نے پیغمبری کا اعلان کیا تو مکہ کے لوگ جو آپ کو اچھی طرح جانتے تھے
ان کے لئے یہ سوال خارج از بحث تھا کہ آپ کو نعوذ باللہ! جھوٹا یا جعل ساز سمجھیں، کیونکہ یہ
محمد ﷺ کی اب تک کی پوری زندگی کے بالکل خلاف تھا، اس لئے انہوں نے کبھی آپ
پر اس قسم کا الزام نہیں لگایا، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ اس شخص کی عقل کھو گئی ہے، وہ شاعرانہ مبالغہ
کر رہے ہیں اور ان پر کسی کا جادو چل گیا ہے، ان پر جنات سوار ہے، مخالفین نے یہ سب
کچھ کہا مگر کسی کی جرأت یہ نہ ہوئی کہ وہ آپ کی صداقت اور دیانت داری پر شبہہ ظاہر

کرے۔ نبوت کے تیرھویں سال عین اس وقت جبکہ آپ کے مخالفین آپ کا مکان گھیرے ہوئے کھڑے تھے اور اس بات کا قطعی فیصلہ کر چکے تھے کہ باہر نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں گے، آپ گھر کے اندر اپنے نوجوان عزیز علیؓ بن ابو طالب کو یہ وصیت کر رہے تھے کہ میرے پاس مکہ کے فلاں فلاں لوگوں کا مال امانت رکھا ہوا ہے، میرے جانے کے بعد تم ان سب کا مال واپس کر دینا۔

نضر بن حارث جو آپ کا مخالف ہونے کے ساتھ دُنیوی معاملات میں قریش کے اندر سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، اس نے ایک روز اپنی قوم سے کہا: "قریش کے لوگو! محمد کی دعوت نے تم کو ایسی مشکل میں ڈال دیا ہے جس کا کوئی حل تمہارے پاس نہیں ہے، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچپن سے جوان ہوئے ہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہارے درمیان سب سے زیادہ سچے، سب سے زیادہ امانت دار اور سب سے زیادہ پسندیدہ شخص تھے، لیکن جب ان کے بال سفید ہونے کو آئے اور انہوں نے وہ کلام پیش کیا جس کو تم سن رہے ہو تو اب تمہارا حال یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ: "یہ شخص جادوگر ہے، یہ شاعر ہے، یہ مجنون ہے" خدا کی قسم! میں نے محمد کی باتیں سنی ہیں، محمد نہ جادوگر ہے، نہ وہ شاعر ہے، نہ وہ مجنون ہے، مجھے یقین ہے کہ کوئی اور مصیبت تمہارے اوپر آنے والی ہے"۔

(سیرت النبی لابن ہشام)

ابوجہل جو آپ کا چچا تھا اور آپ کا بدترین دشمن تھا، وہ کہتا ہے۔ "محمد! میں یہ نہیں کہتا کہ تم جھوٹے ہو، مگر جس چیز کی تم تبلیغ کر رہے ہو وہ صحیح نہیں، اس کو میں غلط سمجھتا ہوں"۔ (ترمذی)

آپ کی نبوت چونکہ صرف عرب کے لئے نہیں تھی بلکہ ساری دنیا کے لئے تھی اس لئے اپنی زندگی ہی میں آپ نے ہمسایہ ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ کئے۔ روم کے بادشاہ ہرقل کو آپ کا دعوت نامہ ملا تو اُس نے حکم دیا کہ عرب کے کچھ لوگ یہاں ہوں تو حاضر کئے جائیں۔ اُسی زمانے میں قریش کے چند لوگ تجارت کی غرض سے شام

گئے ہوئے تھے، وہ دربار میں پہنچے تو ہرقل نے پوچھا تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، تم میں سے کوئی اس کا قریبی رشتہ دار بھی ہے، ابوسفیان نے جواب دیا کہ وہ میرے خاندان کا ہے، اس کے بعد ہرقل اور ابوسفیان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

ہرقل: اس دعوے سے پہلے کبھی تم نے اس کو جھوٹ بولتے ہوئے بھی سنا ہے؟

ابوسفیان: کبھی نہیں۔

ہرقل: کیا وہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک اس نے کسی عہد کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ہرقل نے یہ سُن کر کہا۔۔۔ ''جب یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ آدمیوں کے معاملہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس نے خدا کے معاملہ میں اتنا بڑا جھوٹ گھڑ لیا ہو'' یہ اس وقت کی گفتگو ہے جبکہ ابوسفیان ابھی ایمان نہیں لائے تھے اور محمد ﷺ کے کٹر دشمن تھے، بلکہ آپ کے خلاف جنگ کی قیادت کر رہے تھے، وہ خود کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو دوسرے قریشی بیٹھے ہوئے ہیں، وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا''۔ (بخاری: کیف کان بدء الوحی)

ساری تاریخ میں کسی بھی ایسے شخص کا نام نہیں لیا جا سکتا جس کے مخاطبین شدید مخالف ہونے کے باوجود اس کی زندگی اور سیرت کے بارے میں اتنی غیر معمولی رائے رکھتے ہوں اور یہ واقعہ بجائے خود آپ کے رسول اللہ ہونے کا کافی ثبوت ہے، یہاں میں ڈاکٹر لیٹز کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

''میں بہت ادب کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر فی الواقع خدائے پاک کے یہاں سے، جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے الہام ہوتا ہے، تو محمد کا مذہب الہامی مذہب ہے، اور اگر ایثار نفس، دیانت داری، راسخ الاعتقادی، نیکی اور بدی کی کامل جانچ اور برائی دور کرنے کے عمدہ ذرائع ہی الہام کی ظاہری بین علامتیں ہیں تو محمد کا مشن الہامی

تھا"۔(Mohammad and Mohammadanism P.344)

جب آپ نے دعوت دینی شروع کی تو آپ کی قوم نے سخت ترین مصیبتیں ڈالیں، آپ کی راہ میں کانٹے بچھا دیتے، نماز پڑھتے میں آپ کے جسم پر نجاست لاکر انڈیل دیتے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچا کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، اس قسم کی حرکتوں سے جب آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے آپ کا اور آپ کے سارے خاندان کا بائیکاٹ کر دیا اور آپ کو مجبور کیا کہ بستی سے باہر ایک پہاڑی درّہ میں جا کر بے یارومددگار پڑے رہیں، اس دوران میں کوئی ضرورت کی چیز حتیٰ کہ کھانا پینا بھی نہ کوئی شخص آپ تک پہنچا سکتا تھا اور نہ آپ کے ہاتھ فروخت کر سکتا تھا، آپ اپنے خاندان کے ساتھ تین سال تک اس حصار میں اس طرح رہے کہ پہاڑی درخت (طلح) کے پتے کھاتے تھے، آپ کے ایک ساتھی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے پانی سے اسے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ تین سال کے بعد یہ حصار ختم ہوا۔

مکہ کے لوگوں کی یہ سنگدلی دیکھ کر آپ طائف گئے جو مکہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر اُمراء ورؤساء کا شہر تھا، وہاں کے لوگوں نے آپ سے نہایت بُری طرح کلام کیا۔ ایک نے کہا "کیا خدا کو تیرے سوا کوئی اور پیغمبری کے لئے نہیں ملتا تھا" پھر ان لوگوں نے بدکلامی ہی پر اکتفاء نہیں کی بلکہ طائف کے اوباشوں کو اُبھار کر آپ کے پیچھے لگا دیا۔ یہ لوگ ہر طرف سے آپ کے اوپر ٹوٹ پڑے اور آپ پر پتھر پھینکنے شروع کئے، انہوں نے اس بُری طرح آپ کو زخمی کیا کہ آپ کے جوتے خون سے بھر گئے۔ آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے جب چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالی بجاتے، اسی طرح شام ہونے تک آپ کے پیچھے لگے رہے، شام کو جب وہ زخم اور خون کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر چلے گئے تو آپ نے ایک باغ میں

انگور کی ٹٹیوں کی آڑ میں پناہ لی، یہی وہ واقعہ ہے کہ جس کے متعلق آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

لقد لقیت من قومك ما لقیت وکان اشد ما لقیت منهم یوم العقبة۔

ان تمام ایذاء رسانیوں کے باوجود آپ اپنا کام کرتے رہے، بالآخر قریش نے طے کیا کہ اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ایک رات کو قریش کے تمام سرداروں نے ننگی تلواروں کے ساتھ آپ کا مکان گھیر لیا تا کہ صبح کو جب آپ باہر نکلیں تو آپ کو قتل کر دیا جائے، مگر اللہ تعالی کی مدد سے آپ بحفاظت گھر سے نکل گئے اور مدینہ جا کر قیام فرمایا۔

اس کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ باضابطہ جنگ چھیڑ دی، اور دس سال تک مسلسل آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جدال وقتال میں اُلجھائے رکھا، جس میں آپ کے دانت شہید ہوئے، بہترین ساتھی مارے گئے، وہ تمام مصائب جھیلنے پڑے جو جنگی حالت پیدا ہو جانے کے بعد جھیلنے ہوتے ہیں۔

اس طرح کی ۲۳ سالہ تاریخ کے بعد آپ کی عمر کے آخری دنوں میں مکہ فتح ہوا، اس وقت آپ کے دشمن بے یار ومددگار آپ کے سامنے کھڑے تھے، ایسے وقت میں فاتح جو کچھ کرتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، مگر آپ نے ان سے کوئی انتقام نہیں لیا، آپ نے پوچھا "**یامعشر قریش ماترون انی فاعل فیکم**" (قریش کے لوگو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا، انہوں نے کہا کہ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، آپ نے فرمایا: "**اذھبوا فانتم الطلقاء**" (جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو)۔ (سیرت النبی لابن ہشام مطبوعہ قاہرہ: جلد: ۴ ص: ۳۲)

اعلی ترین سلوک کی یہ حیرت انگیز مثال تاریخ کا ایک ایسا معجزہ ہے کہ اگر وہ دورِ تاریخ سے قبل کا ہوتا اور تاریخی طور پر ثابت نہ ہوتا تو یقیناً کہنے والے کہتے کہ یہ واقعہ

نہیں بلکہ افسانہ ہے، کیونکہ کوئی انسان اب تک ایسا پیدا نہیں ہوا، پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ کس قدر صحیح ہیں:

''جب میں آپ کی جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور آپ کے تابع دار پیروؤں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی، کیا کیا کارنامے دکھائے تو آپ مجھے سب سے بزرگ، سب سے برتر اور اپنی نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں''۔

(Mohammad and Mohammadanism P)

آپ نے صرف اپنے مشن کی خاطر یہ تکلیفیں اُٹھائیں، ورنہ آپ کے لئے دوسری زندگی بھی ممکن تھی، جب آپ مکہ میں تھے، قریش کی طرف سے عقبہ یہ پیشکش لے کر آپ کی خدمت میں آیا کہ: '' بھتیجے! اگر اس دعوت سے تم مال و دولت چاہتے ہو تو آؤ ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مالدار بن جاؤ، اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو بتاؤ ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں کہ تمہیں اپنا سردار مان لیں، اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے، لیکن اگر یہ واقعہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمہیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنہیں تم دور نہیں کر سکتے تو ہم تمہارا علاج کرنے کے لئے بھی تیار ہیں'' عقبہ کی یہ تقریر آپ خاموشی سے سُنتے رہے، اور اس کے بعد جو جواب دیا وہ یہ کہ قرآن کی کچھ آیتیں پڑھ کر اُسے سُنا دیں''۔ (سیرت ابن ہشام: ج:۱)

مدینہ میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے، آپ کو ایسے جاں نثار خادم حاصل تھے کہ ان جیسے وفادار اور جاں نثار ساتھی آج تک کسی کو نہیں ملے، مگر واقعات بتاتے ہیں کہ آخر عمر تک آپ نے بالکل معمولی حالت میں گزار دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ: ''میں آپ کے حجرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر قمیص کے کھجور کی معمولی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور آپ کے جسم پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے ہیں، حجرہ میں چاروں طرف نظر دوڑائی تو اس کا کُل اثاثہ یہ تھا: ایک طرف تین چمڑے، ایک

کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں تقریباً ایک صاع جو، یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا، آپ نے پوچھا روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا کہ قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے اور آپ خدا کے رسول اس حال میں ہیں، یہ سن کر آپ بیٹھ گئے اور فرمایا: عمر! تم کس خیال میں ہو، کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے"۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ عروہ نے پوچھا تو آپ لوگ زندہ کیسے رہتی تھیں، انہوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، ساتھ ہی بعض انصار دودھ بھیج دیا کرتے تھے، ان ہی کی دوسری روایت ہے کہ محمد ﷺ کے مدینہ آنے کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن تک گیہوں کا استعمال کیا ہو، اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے۔

آپ نے قدرت رکھنے کے باوجود اس طرح زندگی گزاری اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لئے کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار، نہ درہم، نہ بکری، نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ اس کے بجائے دنیا کی عظیم ترین حکومت کے بانی جس کو اپنی زندگی میں معلوم تھا کہ اس کی حکومت ایشیاء اور افریقہ سے گزرتی ہوئی، یورپ کی سرحدوں تک پہنچ جائے گی۔ اس نے فرمایا:

"لانورث ماترکنا صدقة"۔ بخاری و مسلم۔

(ہم پیغمبروں کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہے)۔

آپ کے اخلاق و کردار اور آپ کے اخلاص و ایثار کی ایک جھلک جو اوپر پیش کی گئی، یہ کچھ مستثنیٰ واقعات نہیں ہیں، بلکہ یہی آپ کی پوری زندگی ہے، آپ کی ساری زندگی اسی قسم کے واقعات کا دوسرا نام ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ کی انسانیت اتنی بلند تھی کہ اگر آپ پیدا نہ ہوتے تو تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کبھی پیدا ہوسکتا ہے۔

ایسے غیر معمولی انسان کے بارے میں یہ عجیب نہیں ہوگا کہ ہم اس کو خدا کا رسول مان لیں، بلکہ یہ عجیب ہوگا کہ ہم اس کے رسول ہونے کا انکار کردیں، کیونکہ آپ کو رسول مان کر ہم صرف آپ کی معجزاتی شخصیت کی توجیہ کرتے ہیں، اگر ہم آپ کو رسول نہ مانیں تو ہمارے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں رہتا کہ ان حیرت انگیز اوصاف کا سرچشمہ کیا تھا، جبکہ ساری معلوم تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا۔ پروفیسر باسورتھ اسمتھ کے یہ الفاظ ایک لحاظ سے حقیقت واقعہ کا اعتراف ہیں اور دوسرے لحاظ سے وہ سارے انسانوں کو آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں:

"محمد (ﷺ) نے اپنی زندگی کے آخر میں بھی اپنے لئے اسی منصب کا دعویٰ کیا جس سے انہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا تھا اور میں یقین کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اعلیٰ ترین فلسفہ اور سچی مسیحیت ایک روز یہ تسلیم کرنے پر متفق ہوں گے کہ آپ ایک پیغمبر تھے، خدا کے سچے پیغمبر"۔

(Mohammad and Mohammadanism P,344)

(علم جدید کا چیلنج: از ص: ۱۷۰ تا ص: ۱۸۶)

دوسرے معیار کے متعلق لائق مصنف رقمطراز ہیں:

"دوسرے پہلو سے رسول ہونے کا سب سے بڑا ثبوت وہ کتاب ہے جس کو اس نے یہ کہہ کر پیش کیا کہ وہ اس کے اوپر خدا کی طرف سے اُتری ہے، یہ کتاب بے شمار ایسی خصوصیات سے بھری ہوئی ہے جو اس کے بارے میں اس امر کا قطعی قرینہ پیدا کرتی ہیں کہ یہ ایک غیر انسانی کلام ہے، یہ خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے"۔ (ایضاص: ۱۸۶)

پھر مصنف نے اس پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے اور شروع میں یہ حدیث نقل کی ہے: "پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے ایسے معجزات دیئے ہیں جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے، اور مجھ کو جو معجزہ عطا ہوا ہے، وہ قرآن ہے"۔ (بخاری:

باب الاعتصام)

اس کے بعد قرآن کریم کی بہت سی خصوصیات میں سے درج ذیل تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے:

(۱) قرآن کا چیلنج جو چودہ سو برس پہلے سے دنیا کے سامنے ہے، مگر آج تک اس کا جواب نہ دیا جا سکا۔

(۲) قرآن کی پیشین گوئیاں جو حیرت انگیز طور پر بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

(۳) یہ کہ باوجودیکہ قرآن علمی ترقی سے بہت پہلے نازل ہوا، اس کی کوئی بات آج تک غلط ثابت نہ ہو سکی، اگر یہ صرف ایک انسانی کلام ہوتا تو ایسا ہونا ناممکن تھا۔

پھر انہوں نے ان تینوں خصوصیات پر باون (۵۲) صفحات میں نہایت محققانہ اور بصیرت افروز بحث اپنے مخصوص انداز میں کی ہے، جو قابل مطالعہ ہے۔ من اراد التفصیل فلیطالعه وانی ترکته مخافة طول البحث ولکن لابد ان یطالعه طالب العلم فانه یورث البصیرة ویزداد به التحقیق۔

مسئلہ عصمتِ انبیاء:۔

''شرح عقائد'' میں ہے کہ انبیاء کذب سے معصوم ہیں خصوصاً امور شرائع، تبلیغ احکام اور ارشاد اُمت میں عمداً کذب سے بالاجماع معصوم ہیں اور جمہور کے نزدیک سہواً بھی کذب سے معصوم ہیں، اور کذب کے علاوہ باقی گناہوں سے عصمت میں یہ تفصیل ہے کہ کفر سے قبلِ وحی بھی بالاجماع معصوم ہیں اور بعد وحی بھی، اور اسی طرح (بعد نبوت) کبائر کے عمداً ارتکاب سے بھی جمہور کے نزدیک معصوم ہیں، البتہ اس میں فرقہ حشویہ کا اختلاف ہے، اور (بعد نبوت) سہواً کبائر کا ارتکاب اکثر علماء کے نزدیک جائز ہے۔

''نبراس'' میں لکھا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے کبائر سے عصمت پر بلا قید عمد اور سہو کے اجماع نقل کیا ہے۔ اور صغائر کا ارتکاب (بعد نبوت) جمہور کے نزدیک عمداً بھی جائز ہے۔ البتہ جبائی اور اس کے متبعین معتزلہ کا اس میں اختلاف ہے، اور سہواً صغائر کا ارتکاب بالاتفاق

جائز ہے" اور "نبراس" میں قاضی عیاضؒ کا قول نقل کیا ہے کہ محققین فقہاء اور متکلمین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ انبیائے کرام صغائر سے بھی اسی طرح معصوم ہیں جس طرح کبائر سے معصوم ہیں کیونکہ صغائر میں اختلاف ہے اور کبائر سے ان کا تمایز مشکل بھی ہے، اور اس لئے کہ سلف" کا یہ طریقہ معروف اور ثابت ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ سے صادر ہونے والے ہر قول و فعل کی اقتداء کرتے اور اس سے حجت پکڑتے۔ (انتہیٰ)

"شرح عقائد" سے جو تفصیل نقل کی گئی یہی عامہ متکلمین کا مذہب ہے، لیکن جمہور علمائے محققین کا مذہب یہ ہے کہ انبیائے کرام قبل وحی اور بعد وحی دونوں زمانوں میں صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہیں، ملا علی قاریؒ نے "شرح الفقہ الاکبر" میں ابن ہمامؒ کا قول نقل کیا ہے کہ جمہور اہل سنت کے نزدیک مختار یہ ہے کہ انبیاء صغائر و کبائر سے خطاءً سہواً معصوم ہیں، اور بعض اہل سنت نے سہو سے بھی معصوم مانا ہے لیکن اصح یہ ہے کہ افعال میں سہو جائز ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ ارقام فرماتے ہیں:

"تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ صغیرہ گناہ ان سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، جمہور اُمت کے نزدیک صحیح نہیں (قرطبی)

وجہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کا مقتداء بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے اطمینان اُٹھ جائے گا، اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانا ہے۔

البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر

عتاب بھی ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بھی اسی میں داخل ہے، ایسے واقعات کا حاصل باتفاق اُمت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاونسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، یا خطا ونسیان کے سبب قابلِ معافی ہوتے ہیں، جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جا سکتا اور یہ سہو ونسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہو سکتی جن کا تعلق تبلیغ وتعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو ونسیان ہو سکتا ہے۔ (تفسیر بحر محیط) مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے، اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں"۔ (معارف القرآن: جلد: اول ص:۱۹۵، ۱۹۶)

عصمت کی کیفیت:۔

عصمت کی کیفیت میں بھی علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے جس میں بندہ کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا، اب اس کی یا تو یہ صورت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو ایسی طبیعت اور جبلت پر پیدا فرمایا ہے کہ وہ معصیت کی طرف مائل نہیں ہوتے اور طاعت سے انہیں نفرت نہیں ہوتی جس طرح کہ فرشتوں کی طبیعت ہے، اور یا پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی توجہ کو جبراً سیئات کی طرف سے ہٹا لیتے ہیں اور طاعات کی طرف منعطف کر دیتے ہیں، حالانکہ ان کے اندر بشری تقاضے موجود ہوتے ہیں۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ عصمت اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہی ہے لیکن اس طور پر کہ عصمت کے بعد بھی طاعت پر اقدام کرنے اور معصیت سے باز رہنے میں ان کا اختیار باقی رہتا ہے اور اسی کی طرف شیخ ابو منصور ماتریدیؒ مائل ہیں۔

(شرح الفقہ الاکبر)

انبیائے کرام علیہم السلام کی تعداد:۔

''اصول الدین'' میں ہے کہ مسلمان مؤرخین کا اس پر اجماع ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، کما وردت بہ الاخبار الصحیحہ ۔جن میں اول حضرت آدمؑ ہیں اور آخر ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ ہیں، اور رسول مثل تعداد اصحاب بدر کے تین سو تیرہ ہوئے ہیں، جن میں پانچ وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے یعنی حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علی نبینا وعلیہم السلام۔ اور ''شرح عقائد'' وغیرہ کتب عقائد میں لکھا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ کسی معین عدد میں منحصر نہ کرے، کیونکہ جس حدیث میں عدد کا ذکر ہے وہ ''خبر واحد'' ہے اور باب عقائد میں ''خبر واحد'' معتمد نہیں ہے نیز روایات میں اختلاف بھی ہے، بعض روایات میں دو لاکھ چوبیس ہزار کا عدد ہے اور رسولوں کے لئے تین سو پندرہ کا عدد ہے، اس لئے اقتصار علی العدد المعین میں اندیشہ ہے کہ کوئی غیر نبی انبیاء میں داخل ہوجائے یا کوئی نبی انبیاء کی جماعت سے خارج ہوجائے۔ پس عدم انحصار ہی کے ساتھ اعتقاد اولیٰ ہے۔

قوله:"خاتم الانبیاء وامام الاتقیاء"۔

ترجمہ: آپ آخری نبی ہیں اور متقیوں کے امام ہیں۔

مسئلہ ختم نبوت:۔

تشریح:۔ ''عقیدۂ ختم نبوت'' یعنی رسول اللہ ﷺ کا خاتم الانبیاء ہونا اور آپ کا آخری پیغمبر ہونا، آپ کے بعد کسی نبی کا دنیا میں مبعوث نہ ہونا اور ہر مدعی نبوت کا کاذب اور کافر ہونا ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اجماع رہا ہے، لیکن پنجاب کے ایک گاؤں قادیان کے ایک جھوٹے شخص مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور پھر اس نے اور اس کے متبعین قادیانیوں نے اس مسئلے میں مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لئے بہت سے رسالے

8

لکھے اوران میں طرح طرح کی تحریفات سے گمراہی پیدا کرنے کی کوشش کی، اوراب جبکہ علمائے پاکستان کی مساعی مشکورہ کی بدولت انہیں وہاں پر سرکاری طور پر بھی غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے تاہم یہ اپنی گمراہ کن کوششوں سے باز نہیں آتے اور ہندوستان میں نیز دوسرے ممالک میں بھی جہاں موقع پاتے ہیں وہاں اپنی تبلیغی مہم جاری رکھتے ہیں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں جو کچھ لکھا ہے اس سے چند اقتباسات درج کردوں کہ نہ وہ طویل ممل ہے اور نہ قصیر مخل اور حصولِ مقصود میں مفید اور موجب بصیرت ہے۔

مفتی صاحبؒ نے آیت "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا" (الاحزاب:۴۰) (محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے) کے تحت اس مسئلہ پر قدرے مفصل گفتگو فرمائی ہے، لفظ "خاتم النبیین" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"لفظ خاتم میں دو قراءتیں ہیں: امام حسن اور عاصم کی قراءت خاتم بفتح تاء ہے اور دوسرے ائمہ قراءت خاتم بکسر تاء پڑھتے ہیں، حاصل معنی دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی انبیاء کو ختم کرنے والے، کیونکہ خاتم بکسر التاء ہو یا بفتح التاء دونوں کے معنی آخر کے بھی آتے ہیں اور مہر کے معنی میں بھی۔ یہ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں، اور نتیجہ دوسرے معنی کا بھی وہی آخر کے معنی ہوتے ہیں، کیونکہ مہر کسی چیز پر بند کرنے کے لئے آخر ہی میں لگائی جاتی ہے، لفظ خاتم بالکسر والفتح دونوں کے دونوں معنی لغت عربی میں تمام کتابوں میں مذکور ہیں، قاموس، صحاح، لسان العرب، تاج العروس وغیرہ۔ اسی لئے تفسیر روح المعانی میں خاتم بمعنی مہر کا حاصل بھی وہی معنی آخر کے بتلائے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: "والخاتم اسم آلة لما یختم به کالطابع لما یطبع به فمعنی خاتم النبیین الذی ختم النبیون به ومآله اٰخر النبیین" یہی مضمون تفسیر بیضاوی اور احمدی میں بھی مذکور ہے، اور امام

راغبؒ نے مفردات القرآن میں فرمایا:وخاتم النبوةِ لانه خَتَمَ النبوة ای تممها بمجیئه ''یعنی آپ کوخاتم نبوت اس لئے کہا گیا کہ آپ نے نبوت کواپنے تشریف لانے سے ختم اور مکمل کر دیا''۔(معارف القرآن: جلد: ہفتم:ص:۱۶۱)

پھر چند سطور کے بعدارقام فرماتے ہیں:

''صفت خاتم الانبیاء ایک ایسی صفت ہے جوتمام کمالات نبوت ورسالت میں آپ کی اعلیٰ فضیلت اور خصوصیت کوظاہر کرتی ہے، کیونکہ عموماً ہر چیز میں تدریجی ترقی ہوتی ہے اور انتہاء پر پہنچ کر اس کی تکمیل ہوتی ہے اور جو آخری نتیجہ ہوتا ہے وہی اصل مقصود ہوتا ہے، قرآن کریم نے خود اس کو واضح کر دیا ہے:''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی ''انبیائے سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے،کوئی ناقص نہ تھا،لیکن کمالِ مطلق اسی دینِ مصطفوی کوحاصل ہوا جواولین وآخرین کے لئے حجت اور قیامت تک چلنے والا دین ہے''۔(ایضاً)

پھر آگے چل کر آیت میں لفظ''خاتم الرسل'' کے بجائے''خاتم النبیین'' آنے کی ایک لطیف حکمت بیان فرمائی ہے اور اس سلسلہ میں تفسیر ابن کثیر کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"فهذه الآية نص فی انه لانبی بعده واذا کان لانبی بعده فلارسول بالطريق الاولى لان مقام الرسالة اخص من مقام النبوة فان کل رسول نبی ولاینعکس بذالك وردت الاحاديث المتواترة من رسول الله صلی الله علیه وسلم من حدیث جماعة من الصحابة"۔

یہ آیت نص صریح ہے اس عقیدہ کے لئے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں اور جب نبی نہیں تو بدرجہ اولی رسول بھی نہیں، کیونکہ لفظ نبی عام اور لفظ رسول خاص ہے اور یہ وہ عقیدہ ہے جس پر احادیث متواترہ شاہد ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کی روایت سے ہم تک پہنچی

ہیں۔(ایضاً ص:۱۶۳)

آگے اس پر بحث فرمائی ہے کہ قیامت سے پہلے آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول آنحضور ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

''مرزائے قادیانی نے عیسیٰؑ کا زندہ آسمان میں اُٹھایا جانا اور پھر آخر زمانہ میں تشریف لانا جو قرآن وسنت کی بے شمار نصوص سے ثابت ہیں، ان کا انکار کر کے خود مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا، اور استدلال میں یہ پیش کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ بن مریم نبی بنی اسرائیل کا پھر دنیا میں آنا تسلیم کیا جائے تو یہ آنحضرت ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے منافی ہوگا۔

جواب بالکل واضح ہے کہ خاتم النبیین اور آخر النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی شخص عہدۂ نبوت پر فائز نہ ہوگا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے پہلے جس کو نبوت عطا ہو چکی ہے، ان کی نبوت سلب ہو جائے گی، یا ان میں سے کوئی اس عالم میں پھر نہیں آسکتا، البتہ آنحضرت ﷺ کے بعد جو بھی آپ کی اُمت میں اصلاح وتبلیغ کے لئے آئے گا وہ اپنے منصب نبوت پر قائم ہوتے ہوئے اُس اُمت میں اصلاح کی خدمت آنحضرت ﷺ کی تعلیمات ہی کے تابع ہو کر انجام دے گا، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے، یہی بات اس آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیرؒ نے بہت وضاحت کے ساتھ تحریر فرمائی ہے''۔(ایضاً)

مرزا قادیانی نے نبوت کے مفہوم میں تحریف کی اور ظلی وبروزی نبوت کی تقسیم خود اپنی طرف سے ایجاد کی، جس کا نصوص شرع سے کوئی ثبوت نہیں، مفتی صاحبؒ نے اس پر اس طرح گفتگو فرمائی ہے:

''اس مدعی نبوت نے دعوی نبوت کا راستہ ہموار کرنے کے لئے ایک نئی چال یہ چلی کہ نبوت کی ایک نئی قسم ایجاد کی، جس کا قرآن وسنت میں کوئی وجود وثبوت نہیں اور پھر کہا کہ یہ قسم نبوت کی حکم قرآنی ختم نبوت کے منافی نہیں، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اس نے نبوت کے

مفہوم میں وہ راستہ اختیار کیا جو ہندوؤں اور دوسری قوموں میں معروف ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے جنم میں دوسرے کے روپ میں آسکتا ہے، اور پھر یہ کہا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے مکمل اتباع کی وجہ سے آپ کا ہم رنگ ہوگیا ہو اس کا آنا خود آپ ہی کا آنا ہے ،وہ درحقیقت آپ ہی کا ظل اور بروز ہوتا ہے،اس لئے اس کے دعوے سے عقیدۂ ختم نبوت متاثر نہیں ہوتا۔مگر اول تو خود یہ نوایجاد نبوت اسلام میں کہاں سے آئی اس کا کوئی ثبوت نہیں،اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت چونکہ عقائد اسلامیہ کا ایک بنیادی عقیدہ ہے،اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کو مختلف عنوانات سے مختلف اوقات میں ایسا واضح کر دیا ہے کہ کسی تحریف کرنے والے کی تحریف چل نہیں سکتی،اس جواب کی پوری تفصیل تو احقر کی کتاب ''ختم نبوت'' ہی میں دیکھی جا سکتی ہے،یہاں چند چیزیں بقدر ضرورت پیش کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔صحیح بخاری و مسلم وغیرہ تمام کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت اسناد صحیح کے ساتھ آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنٰی بیتاً فاحسنه واجمله الاموضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به ویعجبون له ویقولون هلا وضعت هذه اللبنة وانا خاتم النبیین ،رواه احمد والنسائی والترمذی وفی بعض الفاظه فکنت انا سددت موضع اللبنة وختم بی البنیان".

میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک مکان بنایا ہو اور اس کو خوب مضبوط اور مزین کیا ہو،مگر اس کے ایک گوشہ میں دیوار کی ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کو دیکھنے کے لئے اس میں چلیں پھریں اور تعمیر کو پسند کریں مگر سب یہ کہیں کہ اس مکان بنانے والے نے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی جس سے تعمیر بالکل

مکمل ہوجاتی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (قصرنبوت کی) وہ آخری اینٹ میں ہوں اور بعض الفاظ حدیث میں ہے کہ میں نے اس خالی جگہ کو پُر کر کے قصرِ نبوت کو مکمل کردیا۔

صحیح بخاری ومسلم اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی ایک دوسری حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کانت بنواسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفه نبی وانه لانبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون الحدیث"۔

بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام خود انبیاء کے ہاتھ میں تھا، جب ایک نبی کی وفات ہوجاتی تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہوجاتا تھا اور میرے بعد کوئی نبی نہیں البتہ میرے خلیفہ ہوں گے۔

اس حدیث نے یہ بھی واضح کردیا کہ آنحضرت ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا، تو اُمت کی ہدایت کا انتظام کیسے ہوگا؟ اس کے متعلق فرمایا کہ آپ کے بعد اُمت کی تعلیم وہدایت کا انتظام آپ کے خُلفاء کے ذریعہ سے ہوگا، جو رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مقاصدِ نبوت کو پورا کریں گے، اگر ظلی بروزی کوئی نبوت کی قسم ہوتی یا غیر تشریعی نبوت باقی ہوتی تو ضرور تھا کہ یہاں اس کا ذکر کیا جاتا کہ اگرچہ عام نبوت ختم ہوچکی مگر فلاں قسم کی نبوت باقی ہے جس سے اس عالم کا انتظام ہوگا۔ اور مسند احمد اور ترمذی میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلارسول بعدی ولانبی" رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث صحیح۔

(بے شک رسالت اور نبوت میرے بعد منقطع ہوچکی ہے، میرے بعد نہ

کوئی رسول ہوگا اور نہ نبی)۔

اس حدیث نے واضح کر دیا کہ غیر تشریعی نبوت بھی آپ کے بعد باقی نہیں، اور ظلی وبروزی تو نبوت کی کوئی قسم ہی نہیں، نہ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز معروف ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک اُمت مسلمہ کے سب طبقات کا اجماع اس عقیدہ پر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی کسی قسم کا نبی یا رسول نہیں ہو سکتا، جو دعویٰ کرے وہ کاذب، منکرِ قرآن اور کافر ہے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سب سے پہلا اجماع اسی مسئلہ پر ہوا جس کی رو سے مسیلمہ کذاب اور دعائے نبوت سے خلیفہ اوّل صدیق اکبر کے عہد میں جہاد کر کے اس کو اور اس کے ماننے والوں کو قتل کیا گیا"۔ (ایضاً)

اب آخر میں ''معارف القرآن'' ہی سے امام غزالیؒ کی کتاب ''الاقتصاد فی الاعتقاد'' کی وہ عبارت درج کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں جو امام موصوف نے آیت مذکورۃ الصدر کی تفسیر اور عقیدۂ ختم نبوت کے متعلق تحریر فرمائی ہے، ارقام فرماتے ہیں:

"ولیس فیه تاویل ولا تخصیص ومن اوّله بتخصیص فکلامه من الهذیان لا یمنع الحکم بتکفیره لانه مکذب لهذا النص الذی اجمعت الامة علی انه غیر مأوّل ولا مخصوص"۔

اس آیت میں کسی تاویل یا تخصیص کی گنجائش نہیں اور جو شخص تاویل کر کے اس میں کوئی تخصیص نکالے اس کا کلام ہذیان کی قسم سے ہے اور یہ تاویل اس کو کافر کہنے سے نہیں روک سکتی، کیونکہ وہ اس آیت کی تکذیب کر رہا ہے جس کے متعلق اُمت کا اجماع ہے کہ وہ مؤول یا مخصوص بالکل نہیں۔ (معارف القرآن: جلد: ۷ ص: ۱۶۹)

امام الاتقیاء: امام اس کو کہتے ہیں جس کی اقتداء اور پیروی کی جائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی لئے ہوئی ہے تا کہ آپ کی اقتداء اور اتباع کی جائے چنانچہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قُل اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِی یُحبِبکُم اللهُ وَیَغفِر لَکُم ذُنُوبَکُم"۔(آل عمران)

(آپ فرمادیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے)۔

اور اتقیاء: تقی کی جمع ہے بمعنی پرہیزگار، جو لوگ آپ کا اتباع کرتے ہیں وہی اتقیاء ہیں۔اس سے ثابت ہوا کہ آپ ''امام الاتقیاء'' ہیں۔

قوله:"وسید المرسلین"۔

ترجمہ: اور رسولوں کے سردار ہیں۔

تشریح:۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"انا سید ولد آدم یوم القیامة واوّل من ینشق عنه القبر، واول شافع واوّل مشفّع"۔ رواہ مسلم۔

میں قیامت کے روز اولاد آدم کا سردار ہوں گا، اور پہلا وہ شخص ہوں جس کی قبر پھٹے گی، اور پہلا شفاعت کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی۔(مسلم)

نیز ارشاد فرمایا: ''انا سید الناس یوم القیامة'' متفق علیہ (میں قیامت کے روز لوگوں کا سردار ہوں گا) اور حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اِن الله اصطفیٰ کنانة من ولد اسماعیل واصطفیٰ قریشاً من کنانة واصطفیٰ من قریش بنی هاشم واصطفانی من بنی هاشم"۔

(بے شک اللہ نے اولادِ اسماعیل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا اور کنانہ سے قریش کو منتخب فرمایا اور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو منتخب فرمایا۔ (مسلم و ترمذی)

نیز ترمذی کی حدیث ہے: "انا سید ولد ادم ولا فخر" (میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں) جن روایات میں "یوم القیامۃ" کی قید ہے، اس کا مطلب نہیں ہے کہ یہ سیادت بروزِ قیامت ہی ہوگی اور اس سے پہلے نہیں ہے، بلکہ یہ قید بایں وجہ ہے کہ آپ کی اس سیادت کا ظہور بدرجہ اتم و اکمل قیامت کے روز تمام اولین و آخرین کے سامنے بیک وقت ہوگا، نیز جس طرح اولادِ آدم پر جن میں تمام انبیاء و مرسلین بھی ہیں آپ کی سیادت ثابت ہے اسی طرح حضرت آدمؑ پر بھی آپ کی سیادت اس حدیث سے ثابت ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ: "ادم فمن سواہ تحت لوائی" (آدم اور ان کے علاوہ میرے پرچم کے نیچے ہوں گے)

مسئلہ تفضیل بین الانبیاء:۔

اشکال:۔ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے کو اولادِ آدم کا سردار فرمایا، اور صحیحین کی حدیث میں ہے:

"لاتفضّلونی علی موسیٰ فان الناس یصعقون یوم القیامۃ فاکون اول من یفیق فاجد موسیٰ باطشاً بساق العرش فلاادری ھل افاق قبلی او کان ممن استثنیٰ اللہ"۔
(بخاری)

مجھ کو موسیٰ پر فضیلت نہ دو، اس لئے کہ لوگ قیامت کے روز بے ہوش گر پڑیں گے، پس میں پہلا شخص ہوں گا جس کو ہوش آئے گا، پس میں موسیٰ کو پاؤں گا کہ عرش کا پایہ پکڑے ہوئے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ ان کو مجھ سے پہلے ہوش آجائے گا یا وہ اُن لوگوں میں سے ہوں گے جن کو اللہ

نے مستثنیٰ کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے، اس کا کیا جواب ہے اور تطبیق کی کیا صورت ہے؟

جواب:۔ یہ ہے کہ اس حدیث کا ایک واقعہ ہے، جس کی بناء پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، ایک یہودی نے کہا تھا "لا والذی اصطفیٰ موسیٰ علی البشر" (نہیں قسم اس ذات کی جس نے موسیٰ کو تمام بشر پر فضیلت دی) اس پر ایک مسلمان نے اس کو طمانچہ مارا اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان موجود ہیں اور پھر بھی تو یہ کہتا ہے، یہودی نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے ان صحابی کی شکایت کی اس پر رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، اس لئے کہ تفضیل اگر حمیت، عصبیت اور ہوائے نفسانی کی بناء پر ہو تو مذموم ہے، اور تفضیل ہی کیا، عصبیت اور ہوائے نفسانی کے ساتھ تو جہاد بھی مذموم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فخر کرنے کو حرام قرار دیا ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ" (الاسراء:۵۵) (اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے) اور فرمایا:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ۔ (البقرۃ:۲۵۳)

(یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے۔ بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوئے ہیں، اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں سے سرفراز کیا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ تفضیل مذموم وہ ہے جو تفاخراً یا احتقاراً ہو، مطلق تفضیل مذموم نہیں ہے، اور یہی محمل بخاری کی حدیث "لا تُفضلوا بین الانبیاء" (انبیاء کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو) کا ہے، یعنی یہ کہ تفاخراً، احتقاراً اور تنقیصاً کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو۔

دوسرا جواب:۔ بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ "لا تفضلونی علی موسیٰ" اور "لا تفضلوا بین الانبیاء" میں منہی عنہ وہ تفضیل ہے جو تعین کے ساتھ ہو، یعنی کسی خاص اور معین پر تخصیص کے ساتھ فضیلت نہ دو، چنانچہ "انا سید ولد آدم ولا فخر" میں تفضیل عام ہے جو ممنوع نہیں اور جو ممنوع ہے یعنی تفضیل خاص وہ اس میں ہے نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ اہلِ شہر میں سب سے بہتر اور افضل ہے، یہ تفضیل عام ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ تم سے اور فلاں شخص سے بہتر اور افضل ہے، تو یہ تفضیل خاص ہے۔ "شرح العقیدۃ الطحاویہ" میں ہے کہ خود امام طحاویؒ نے "شرح معانی الآثار" میں یہی جواب دیا ہے۔

ایک حدیث ہے "لا تفضّلونی علی یونس بن متیٰ" یہ بہت مشہور ہے، لیکن ان الفاظ کے ساتھ اس کی کوئی اصل نہیں "شرح العقیدۃ الطحاویہ" میں ہے:

"فان هذا الحدیث بهذا اللفظ لم یروه أحد من اهل الکتب التی یعتمد علیها"۔

اس کے جو الفاظ حدیث صحیح میں مسلم و مسند احمد میں ثابت ہیں وہ یہ ہیں "لا ینبغی لعبد ان یقول انا خیر من یونس بن متی" (کسی بندہ کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ میں یونس بن متیٰ سے افضل ہوں) اور ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "من قال انی خیر من یونس بن متیٰ فقد کذب" (جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن متیٰ سے افضل ہوں اس نے جھوٹ کہا) ان الفاظ میں دو معنی محتمل ہیں: ایک یہ کہ ضمیر متکلم (پہلی روایت میں "انا" اور دوسری روایت میں "یائے متکلم" سے مراد ہر متکلم ہے۔ اس احتمال کی بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی کو یہ نہ چاہئے کہ وہ اپنے کو یونس بن متیٰ سے افضل کہے، یہ مطلب نہ ہوگا کہ آپ نے مسلمانوں کو اس سے منع فرمایا ہو کہ وہ آپ ﷺ کو حضرت یونس بن متیٰ سے افضل کہیں، یہی معنی شارح العقیدۃ الطحاویہ نے اختیار کیا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ضمیر متکلم سے مراد خود آنحضرت ﷺ ہیں، اس بناء پر حدیث

کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ کسی کو میری نسبت یہ کہنا لائق نہیں کہ میں یونسؑ سے افضل ہوں، اس کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اختیار فرمایا ہے، مولانا تھانویؒ: ''لاینبغی لعبد ان یقول الحدیث'' کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''حالانکہ حضور ﷺ کی فضیلت تمام انبیاء پر قطعی ہے، مگر حضور ﷺ نے اس میں تفصیلی گفتگو سے منع فرمادیا، (نیز اس سے بھی منع فرمادیا کہ کسی نبی کا نام لے کر یہ کہا جائے کہ ہمارے حضور ﷺ فلاں نبی سے افضل ہیں بس اجمالاً ہی کہنا چاہئے کہ آپ سب سے افضل ہیں، کیونکہ تفصیل سے دوسرے نبی کی تنقیص ہوجاتی ہے، اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو تفصیلِ کلام میں مقابلہ میں تنقیص سے بچ سکیں، اس لئے حضور ﷺ کی یہ غایت رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو اس میں تفصیلی گفتگو سے بالکل منع فرمادیا''۔

(البدائع، بدیعہ: ص:۷۱)

قوله: "وحبيب رب العالمين".

ترجمہ: اور رب العالمین کے حبیب ہیں۔

تشریح: محبت کی تعریف اور اس کے درجات:۔

محبت کی تعریف میں تقریباً تیس (۳۰) اقوال ہیں لیکن اس کی جتنی تعریف کی گئی اتنا ہی وہ پردۂ خفا میں ہوتا گیا، محبت کی سب سے واضح تعریف خود لفظ محبت ہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی واضح اور بدیہی چیزیں یا احساسات تعریف سے بے نیاز ہوتی ہیں، تعریف کرنے سے ان کی وضاحت ابہام واغلاق سے بدل جاتی ہیں۔

محبت کے کئی درجات اور مراتب ہیں:

(۱) علاقہ: تعلق القلب بالمحبوب۔

(۲) ارادہ: قلب کا محبوب کی طرف مائل ہونا اور اس کو طلب کرنا۔

(۳) صَبابہ: قلب کا محبوب کی طرف اس طرح مائل ہوجانا کہ اس پر قابو نہ رہے

جس طرح پانی نشیب کی طرف بے اختیار بہہ پڑتا ہے۔

(۴) غرام: ایسی محبت جو دل سے چمٹ جائے۔

(۵) موّدہ اور وُدّ: خالص محبت۔

(۶) شغف: محبت کا پردۂ قلب تک پہنچ جانا۔

(۷) عشق: ایسی بے حد محبت کہ عاشق کی جان جانے کا خوف ہوجائے، لیکن اس لفظ کا اطلاق اللہ تعالی کے لئے نہیں ہوتا، اسی طرح بندہ کو اللہ کے ساتھ جو محبت ہوتی ہے اس کے لئے بھی عشق کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا، لیکن بعض حضرات نے کیا ہے (بالخصوص صوفیائے کرامؒ نے) اللہ تعالی کی نسبت سے لفظ عشق کے اطلاق کی ممانعت کی وجہ مختلف بتائی گئی ہیں، بعض لوگوں نے عدم توقیف (شریعت میں اس اطلاق کے نہ ہونے کو) وجہ بتلائی ہے اور بعض نے دوسری وجوہ ذکر کی ہیں، ممکن ہے، یہ وجہ ہو کہ عشق اس محبت کو کہتے ہیں جس میں شہوت کا شمول ہو۔

(۸) تَیم: بمعنی تعبّد (غلام بنانا)۔

(۹) خُلّت: وہ محبت جو محب کی روح اور دل میں رچ بس جائے۔

(شرح العقیدۃ الطحاویہ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ محبت سے اعلی درجہ "خُلّت" ہے اور نبی کریم ﷺ کے لئے محبتِ الٰہیہ کا یہی درجہ ثابت ہے، حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إِنَّ الله اتخذ ني خليلاً كما اتخذ ابراهيم خليلاً". رواه مسلم

(بے شک اللہ نے مجھ کو خلیل بنایا جس طرح ابراہیم کو خلیل بنایا۔)

اور فرمایا:

"ولو كنت متخذاً من اهل الارض خليلاً لاتخذت ابابكر خليلاً ولكن صاحبكم خليل الرحمن". مسلم

(اگر میں اہل زمین میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ضرور ابوبکر کو خلیل بناتا، لیکن

تمہارا صاحب رحمن کا خلیل ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ''خُلت'' حضرت ابراہیمؑ اور آنحضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے ،اور محبت سب کے لئے عام ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"واللّٰہُ یُحِبُّ المُحسِنِین"(ال عمران:۱۳۴)

(اور اللہ تعالی نیکو کاروں کو محبوب رکھتا ہے)۔

قولہ:"وکل دعوی النبوۃ بعدہ فغیٌّ وھویً"۔

ترجمہ: اور آپ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور نفس پرستی ہے۔

تشریح:۔غی: بمعنی گمراہی، ضد ہے رشاد بمعنی ہدایت کی۔ھوی: خواہشِ نفسانی :مطلب یہ ہے کہ وہ دعوائے نبوت نفس پرستی کی وجہ سے ہوا۔ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، اسی سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جو شخص آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اگر نبوت کا یہ مدّعی معجزات وخوارق اور براہینِ صادقہ پیش کرے تو پھر اس کو کاذب کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن اور متصور ہی نہیں، یہ فرض محال ہے، اس لئے کہ جب اللہ تعالی نے یہ خبر دے دی کہ آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں تو اب یہ محال ہے کہ کوئی شخص نبوت کا دعویٰ کرے اور اس کے کذب وجھوٹ کی علامت اور نشانی نہ ظاہر ہو۔

قولہ:"وھو المبعوث الیٰ عامۃ الجن وکافۃ الوریٰ بالحق والھدیٰ وبالنور والضیاء"

ترجمہ: اور آپ تمام جن وانس کی طرف حق وہدایت کے ساتھ بھیجے گئے۔

تشریح:۔مبعوث الی عامۃ الجن ہونے کی دلیل یہ آیت ہے: ''یٰقَومَنَا اَجِیبُوا دَاعِیَ اللّٰہِ'' (الاحقاف:۳۱) (جنات نے کہا) اے بھائیو! اللہ کی طرف بلانے والے

کا کہنا مانو۔نیز سورۂ جن بھی اس کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ جن کی طرف بھی مبعوث ہوئے تھے۔

کیا جنات میں رسول ہوئے ہیں:۔

ضحاک بن مزاحم کا خیال ہے کہ جناتوں میں بھی رسول ہوئے ہیں، ان کا استدلال "یا معشر الجن والانسِ اَلَمۡ یَأۡتِکُم رُسُلٌ مِنکُم" (الانعام:۱۳۰) (اے جماعت جنات کی اور انسان کی! کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے) سے ہے۔لیکن اس استدلال میں نظر ہے کیونکہ یہ اس مضمون میں صریح نہیں ہے بلکہ اس میں احتمال ہے واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "رسول" انسانوں میں سے ہوئے ہیں اور جناتوں میں "نذیر" ہوئے ہیں۔

کیا آنحضور ﷺ کے علاوہ اور بھی رسول جنات کی طرف مبعوث تھے:۔

حضرت مقاتلؒ فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ سے پہلے اللہ تعالی نے کسی رسول کو انسان و جنات دونوں کی طرف نہیں مبعوث فرمایا "شرح العقیدۃ الطحاویہ" میں ہے کہ یہ قول بعید ہے، کیونکہ سورۂ انعام کی آیت "یامعشر الجِنِ والانسِ اَلَمۡ یَأۡتِکُم رُسُلٌ مِنکُم" سے کئی پیغمبروں کی بعثت انس و جن دونوں کی طرف معلوم ہوتی ہے، نیز سورۂ احقاف کی آیت "قَالُوا یا قومَنَا اِنّا سمِعنَا کِتاباً اُنزِلَ مِن بعدِ موسیٰ" (الاحقاف:۳۰) (اور وہ جن) کہنے لگے کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰؑ بھی جنات کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔واللہ اعلم بالصواب۔

اور تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہونے کی دلیل یہ آیت ہے۔

وَمَا اَرسلنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيراً وَنَذِيراً۔(سبا:۲۸)

(اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، خوشخبری

سنانے والے اور ڈرانے والے)۔

دوسری جگہ فرمایا:

"قُل یایھا الناسُ اِنِی رَسُولُ اللهِ اِلَیکُم جَمِیعاً"۔

(الاعراف:۵۸)

(آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں)۔

نیز ارشاد فرمایا:

"تبٰرکَ الذی نَزَّلَ الفُرقَانَ علیٰ عبدِہٖ لِیَکُونَ نَذِیرا"۔

(الفرقان:۱)

(بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن) اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی تا کہ وہ (بندہ) تمام دنیا جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔)

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"وَقُل لِلّذِین اُوتُوا الکِتاب وَالاُمِّیّین ءَاَسلمتُم فَاِن اَسلَمُوا فَقَد اِھتَدَوا وَ اِن تَوَلَّوا فَاِنّما عَلَیكَ البلاغُ"۔

(آل عمران:۲۰)

(اور کہئے اہل کتاب سے اور مشرکین سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہ پر آجائیں گے اور اگر وہ لوگ روگردانی رکھیں سو آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے)۔

نیز "صحیحین" کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اُعطِیتُ خمساً لم یعطھن احد من الانبیاء قبلی، نُصِرتُ بالرعب مسیرۃ شھر، وجعلت لی الارضۃ مسجداً وطھوراً،

فایما رجل من اُمتی ادرکته الصلوٰۃ فلیصل ،واُحِلّت لی الغنائم ،ولم تحِلّ لاحدٍ قبلی .واعطیت الشفاعۃ ،وکان النبی یبعث الی قومه خاصة وبعثتُ الی الناس عامة۔

(مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء میں سے کسی کو عطا نہیں ہوئیں:ایک (۱) ماہ کی مسافت سے رُعب کے ذریعہ میری مدد کی گئی (۲) اور ساری زمین میرے لئے مسجد اور پاکی حاصل کرنے کی چیز بنادی گئی ،پس میری اُمت میں جس کو بھی نماز کا وقت آجائے تو وہ نماز پڑھ لے (۳) اور میرے لئے غنیمت کے مال حلال کردیئے گئے ،اور مجھ سے پہلے یہ کسی کے لئے حلال نہیں تھے (۴) اور مجھے شفاعت (کی اجازت) عطا کی گئی (۵) اور (پہلے) نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں)۔

عیسائیوں کا اعتراض اور اس کا جواب:۔

بعض عیسائی یہ کہتے ہیں کہ آنحضور ﷺ صرف عرب کے پیغمبر تھے ،لیکن ان کا یہ اعتراض سراسر باطل ہے ،کیونکہ جب انہوں نے آپ کو رسول تسلیم کرلیا گو صرف عرب ہی کے لئے ،تو اب ان کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ آپ کی جملہ باتوں اور خبروں کی تصدیق کریں ،کیونکہ کوئی بھی رسول کاذب نہیں ہوتا ،اور آپ نے اپنے آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہونے کو بالصراحۃ بیان فرمایا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیات وحدیث سے ظاہر ہے ،نیز اس کے علاوہ آپ کا فعل وعمل بھی اس پر شاہد ہے کہ آپ تمام دنیا کے پیغمبر تھے ،چنانچہ آپ نے ایران کے کسریٰ ،روم کے قیصر ،حبش کے نجاشی ،مصر کے مقوقس اور اطراف واکناف کے دوسرے سلاطین کے پاس فرامین بھیجے اور ان سب کو اسلام کی دعوت دی ،آپ نے اپنی دعوت کو صرف سرزمین عرب تک محدود نہ رکھا ،یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ تمام دنیا کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

قوله: "وإنّ القرآن كلام الله تعالى منه بدأبلا كيفية قولاً وانزله على نبيّه وحياً وصدقه المومنون على ذالك حقاً وايقنوا انه كلامه الله تعالى بالحقيقة وليس بمخلوق ككلام البرية فمن سمعه فزعم انه كلام البشر فقد كفر وقد ذمّه الله تعالى وعابه واوعده بسقر حيث قال سأصليه سقر فلما اوعدالله تعالى بسقرَ لمن قال إن هذا الاقولُ البشر علمنا انه قولُ خالِقِ البشر ولايشبهه قولُ البشر"

ترجمہ: اور بلاشبہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، وہ اسی سے بلا کسی کیفیت کے قولاً ظاہر ہوا، اور اپنے نبی پر اس کو بذریعہ وحی نازل فرمایا، اور مومنوں نے حق کے ساتھ اس کی تصدیق کی اور یقین کیا کہ وہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور انسان کے کلام کی طرح مخلوق نہیں ہے، پس جو شخص اس کو سن کر گمان کرے کہ وہ انسان کا کلام ہے تو وہ کافر ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مذمت کی اور اس کی معیوب قرار دیا، اور اس کو جہنم کی دھمکی دی، چنانچہ ارشاد فرمایا: ''میں اس کو جہنم میں داخل کروں گا'' پس جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جہنم کی دھمکی دی ہے جس نے یہ کہا کہ ''یہ بشر کا کلام ہے'' تو ہم نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ یہ خالقِ بشر کا کلام ہے، اور بشر کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔

تشریح: مسئلہ خلقِ قرآن:۔

اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ اسی سبب سے اس مسئلہ کا نام ''مسئلہ خلقِ قرآن'' پڑ گیا، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ اس مسئلہ کا نام ''مسئلہ عدم خلق القرآن'' یا ''مسئلۃ الکلام'' ہوتا کیونکہ یہی نام مذہب اہل حق

کے لحاظ سے انسب اور اقرب الی الصواب تھا، لیکن چونکہ معتزلہ نے اسی نام سے اس بحث کو مشہور کر دیا اس لئے اہلِ حق کی کتابوں میں بھی اسی نام سے یہ شہرت پا گیا۔ اس مسئلہ میں نو (۹) اقوال ہیں:

(۱) کلام اللہ ان معانی کو کہتے ہیں جو عقلِ فعال سے یا کسی اور چیز سے علی اختلاف الاقوال نفوس پر فائض ہوتے ہیں، اس کے قائل فلاسفہ ہیں۔

(۲) کلام اللہ مخلوق ہے جس کو اللہ نے اپنی ذات سے منفصل اور علٰحدہ پیدا کیا ہے، یہ معتزلہ کا قول ہے۔

(۳) کلام اللہ ایک ایسا واحد معنی ہے جو اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہے، معنی سے مراد امر ونہی اور خبر واستخبار ہے، اب اگر اس کو عربی زبان میں بولیں تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کریں تو تورات ہے، یہ ابن کلاب اور اس کے موافقین جیسے اشعری وغیرہ کا قول ہے۔

(۴) کلام اللہ حروف اور اصوات ازلیہ ہیں، یہ متکلمین اور محدثین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

(۵) کلام اللہ حروف اور اصوات ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کا تکلم بعد میں کیا، پہلے وہ اس کے ساتھ متکلم نہیں تھا، یہ کرامیہ وغیرہ کا قول ہے۔

(۶) کلام اللہ راجع ہے اللہ کے اس حادث علم وارادہ کی طرف جو قائم بذاتہ ہیں، یہ قول ''المعتبر'' کے مصنف کا ہے اور امام رازیؒ کا میلان بھی ''المطالب العالیہ'' میں اسی طرف ہے۔

(۷) کلام اللہ ایسے معنی کو متضمن ہے جو قائم بذاتہ ہے، جس کو اللہ نے غیر میں پیدا کیا ہے، یہ ابو منصور ماتریدی کا قول ہے۔

(۸) کلام اللہ معنی قدیم قائم بالذات اور ان اصوات کے درمیان جن کو اللہ غیر میں پیدا کرتا ہے مشترک ہے، یہ ابو المعالی اور ان کے متبعین کا قول ہے۔

(۹) اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے متکلم ہے، جب چاہے اور جس طرح چاہے، اور وہ ایسی آواز سے کلام کرتا ہے جو سنائی دیتی ہے، اور نوعِ کلام قدیم ہے، اگرچہ صورتِ معین قدیم نہیں ہے، یہ قول ائمہ حدیث وسنت سے منقول ہے۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ)

"إن القرآن كلام الله" میں إن بکسر ہمزہ ہے کیونکہ یہ معطوف ہے "ان الله واحد" پر جو معمول ہے "نقول" کا جو شروع کتاب میں آیا ہے۔

"كلام الله منه بدأبلا كيفية قولاً" اس سے مصنفؒ نے معتزلہ وغیرہ پر رد کیا ہے، معتزلہ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ سے نہیں ظاہر ہوا ہے، بلکہ اللہ نے کسی محل میں پیدا کیا اور اسی سے کلام ظاہر ہوا مثلاً موسیٰ سے جو کلام ہوا تو اس کو اللہ نے درخت میں پیدا کیا اور درخت سے کلام ظاہر ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف کلام کی اضافت، اضافتِ تعظیم ہے جیسے "بیت اللہ" اور "ناقۃ اللہ" میں "بیت" اور "ناقہ" کی اضافت "اللہ" کی طرف برائے تعظیم وتشریف ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ قول باطل ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف یا تو معانی مضاف ہوتے ہیں یا اعیان، جب اعیان مضاف ہوں تو اضافت تشریفی ہوتی ہے جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ، اور یہ سب مخلوق ہیں۔

اور جب معانی مضاف ہوں جیسے علم اللہ، قدرت اللہ، عزۃ اللہ، جلال اللہ، کلام اللہ اور حیات اللہ وغیرہ تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی صفت اللہ کی مخلوق نہیں ہو سکتی۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ کلام کو مخلوق نہ ماننے سے اللہ تعالیٰ کے لئے تشبیہ وتجسیم لازم آئے گی، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کلام کا آلہ بھی ثابت کرنا پڑے گا جس طرح انسان کے لئے کلام کرنے کے واسطے جارحہ لسان ہے، لیکن معتزلہ کا یہ اشکال تارِ عنکبوت سے زیادہ لچر اور پوچ ہے، کیونکہ انسان کا تکلم جارحہ لسان کے ذریعہ انسان کے حال کے مناسب ہے، اور اللہ تعالیٰ شانہ اس طرح کلام فرماتے ہیں جو اس کی عظمت وجلال کے لائق اور شایانِ شان ہے، اور ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے، اس لئے کلام اللہ کو صفت

ماننے سے تشبیہ یا تجسیم ہرگز لازم نہیں آتی، یہ مفروضہ ہی بالکل بے بنیاد ہے کہ کلام کے لئے ایک مخصوص قسم کا جارحہ ضروری ہے، چنانچہ قیامت کے روز زبانوں پر مہر لگادی جائے گی اور ہاتھ پاؤں سے کلام کا صدور ہوگا، ارشاد ربانی ہے:

"اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ"۔ (یٰس:٦٥)

(آج ہم ان کے مونہوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے)۔

اہل سنت کا ایمان ہے کہ یہ ہاتھ اور پاؤں کلام کریں گے البتہ ہمیں ان کے تکلم کی کیفیت معلوم نہیں ہے۔ "منه بدأ بلا كيفية قولاً" سے مصنفؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کلام الٰہی اللہ تعالیٰ سے ظاہر ہوا اور ہمیں اس کے تکلم کی کیفیت معلوم نہیں ہے، نیز "قولاً" مصدر کا اضافہ اسی تاکید کے لئے فرمایا ہے۔

نیز معتزلہ کا سب سے بڑا استدلال آیتِ کریمہ "اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" (الرعد:١٨) (اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے) سے ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن شے ہے اور ہر شے مخلوق ہے اس لئے ثابت ہوا کہ قرآن بھی مخلوق ہے (معاذ اللہ!) لیکن تعجب ہے کہ ان ہی معتزلہ کے نزدیک افعالِ عباد، اللہ تعالیٰ کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ ان کے خالق خود عباد ہیں، حالانکہ یہاں بھی وہی تقریر جاری ہوتی ہے کہ افعالِ عباد شے ہیں اور ہر شے کا خالق اللہ ہے اس لئے افعالِ عباد کا بھی خالق اللہ ہے۔ افسوس ہے کہ جس کو "کل شئ" کے عموم میں داخل کرنا تھا اسے تو انہوں نے خارج کردیا اور جس کو خارج کرنا تھا کہ کلام الٰہی اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے، اس کو اس میں داخل کردیا، اس پر طرّہ یہ کہ دعوائے دانشمندی وخردمندی۔

برین عقل ودانش بباید گریست

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ

مُسَخَّرٰتٍ بِاَمرہٖ اَلَا لَه الخلقُ وَالامرُ ''(الاعراف:۵۴)(اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں، یادرکھو! اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا) اس میں اللہ تعالی نے ''خلق'' اور ''امر'' کو الگ الگ بیان فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ''امر'' مخلوق نہیں ہے، کیونکہ اگر ''امر'' بھی مخلوق ہوتو اس سے لازم آئے گا کہ وہ دوسرے امر سے مخلوق ہو اور پھر یہ دوسرا امر تیسرے امر سے مخلوق ہو اور تیسرا چوتھے سے اور چوتھا پانچویں سے وھلمّ جرًّا الی مالانہایۃ، جو مستلزم ہے تسلسل کو اور تسلسل باطل ہے اس لئے یہ مقدمہ بھی باطل ہوجائے گا جو باطل کو مستلزم ہے۔

اس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے کہ کلام اللہ کو مخلوق ماننا اللہ تعالی کی تمام صفات مثلاً علم وقدرت وغیرہ کو بھی مخلوق ماننے کو مستلزم ہے جو صریح کفر ہے، کیونکہ اللہ کا علم بھی شے ہے، اس کی قدرت بھی شے ہے اور اس کی حیات بھی شے ہے، لہذا یہ ساری صفات ''کل شئ '' کے عموم میں داخل ہوکر مخلوق ہوجائیں گی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صفات اللہ تعالی کے اندر پہلے نہ تھیں بعد میں پیدا ہوئیں۔ سُبحانہ وَتَعالیٰ عَمَّا یَقُولُونَ عُلُوّاً کبیراً۔

پس حقیقت یہ ہے کہ لفظ ''کل'' کے عموم سے استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے عموم کا درجہ حسبِ موقعِ استعمال قرائن سے معلوم ہوتا ہے، ایسا نہیں کہ جہاں بھی لفظ ''کل'' کا استعمال ہو بس وہاں ایسا عموم مُراد لیا جائے جو اس کے مدخول کے تمام افراد کو شامل ہو، مثال کے طور پر یہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے ملکہ بلقیس کا حال بیان کیا ہے ''وَاُوتِيَت مِن كُلِّ شيءٍ ''(النمل:۲۳)(اور اس کو (سلطنت کے لوازم میں سے) ہر قسم کا سامان میسّر ہے) یہاں پر ''کل شئ '' سے مراد صرف ایسی تمام چیزیں ہیں جو لوازمِ سلطنت میں سے ہیں اور بادشاہوں کو جن کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسا کہ قرینہ کلام سے مفہوم اور واضح ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ ''خَالِقُ كُلِّ شيءٍ '' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر اس شے کا خالق ہے جو کہ مخلوق ہے اور اللہ کے سوا تمام موجودات مخلوق ہیں جس میں

بندوں کے افعال بھی قطعی طور پر شامل ہیں، اور خود حق تعالیٰ جو خالقِ کائنات ہیں اور اس کی صفات اس میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ صفاتِ باری تعالیٰ ذاتِ باری تعالیٰ کے غیر نہیں ہیں کما سبق بیانہ۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اس آیت سے کلام اللہ کے مخلوق ہونے پر استدلال کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے۔

تمام اہلِ سنت اور ائمہ مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کلام اللہ غیر مخلوق ہے اس کے بعد علمائے متأخرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ کلام اللہ معنی واحد قائم بالذات ہے، یا حروف اور اصوات ہیں جن کا تکلم اللہ تعالیٰ نے بعد میں کیا ہے، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ازل سے متکلم ہے جب چاہے اور جس طرح چاہے، اور نوعِ کلام قدیم ہے یہی امام طحاویؒ کی عبارت کا مدلول ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ کی عبارت سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے چنانچہ "الفقہ الاکبر" میں فرماتے ہیں:

"والقرآن فی المصاحف مکتوب وفی القلوب محفوظ وعلی الالسن مقروء وعلی النبی ﷺ منزّل ولفظنا بالقرآن مخلوق وکتابتنا وقراءتنا له مخلوق والقرآن غیر مخلوق وماذکرہ اللہ تعالیٰ فی القرآن عن موسیٰ علیه السلام وغیرہ وعن فرعون وابلیس فانّ ذالك کلام اللہ اخباراً عنهم وکلام اللہ تعالیٰ غیر مخلوق وکلام موسیٰ وغیرہ من المخلوقین مخلوق والقرآن کلام اللہ لاکلامهم وسمع موسیٰ علیه السلام کلام اللہ تعالیٰ فلما کلم اللہ موسیٰ کلمه بکلامه الذی هو من صفاته لم یزل وصفاته کلها خلاف صفات المخلوقین، یعلم لا کعلمنا ویقدر لا کقدرتنا ویریٰ لا کرؤیتنا ویتکلم لا ککلامنا۔"

(منقول از شرح الفقه الاکبر)

(قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور قلوب میں محفوظ ہے اور زبان سے پڑھا جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ پر نازل کیا گیا ہے اور ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے اور ہمارا اس کو لکھنا اور پڑھنا بھی مخلوق ہے اور قرآن (یعنی کلام نفسی) غیر مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ وغیرہ کے متعلق اور فرعون وابلیس کے بارے میں جو ذکر فرمایا ہے تو وہ اللہ کا کلام ہے اور ان کے متعلق اخبار ہے، اور اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے، اور موسیٰ علیہ السلام وغیرہ مخلوقوں کا کلام مخلوق ہے، اور قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ ان لوگوں کا کلام ہے، اور موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا، پس جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام کیا تو اپنے اس کلام کے ساتھ تکلم فرمایا جو اس کی صفات ازلیہ میں سے ہے، اور اس کی تمام صفات مخلوقات کی صفات کے برعکس ہیں، وہ جانتا ہے لیکن ہمارے جاننے کی طرح نہیں اور وہ قادر ہے لیکن ہماری قدرت کی طرح نہیں، وہ دیکھتا ہے لیکن ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں اور وہ کلام کرتا ہے لیکن ہمارے کلام کی طرح نہیں۔)

امام طحاویؒ کی عبارت اور امام ابوحنیفہؒ کے اس قول سے اس مذہب پر رد ہو گیا کہ کلام اللہ معنی واحد ہے جس کا اللہ سے سُننا متصور نہیں اور یہ کہ مسموع، منزل، مقروء اور مکتوب کلام اللہ نہیں ہے بلکہ کلام سے عبارت ہے اور اس پر دال ہے "وانزل علی رسوله وحیاً" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بواسطہ فرشتہ اس کلام کو نازل فرمایا، چنانچہ جبرئیل امین نے اللہ سے سنا اور رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین سے سنا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا آیت قرآنی ہے:

-نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الاَمِينُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ المُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ-(الشعراء:۱۹۳)

(اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف عربی زبان

میں تا کہ آپ منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں)۔

"وایقنوا انه کلام الله تعالیٰ بالحقیقة لیس بمخلوق ککلام البریة"
یہ بھی اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ قرآن کے لفظ و معنی دونوں پر کلام اللہ کا اطلاق حقیقی ہے مجازی نہیں، کیونکہ مجازی اطلاق کی نفی درست ہوتی ہے، پس اگر یہ اطلاق مجازی ہوتا تو قرآن سے کلام اللہ کی نفی درست ہوتی اور یہ نفی درست نہیں تو معلوم ہوا کہ یہ اطلاق بھی مجازی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ "فمن سمعه فزعم انه کلام البشر فقد کفر" جو شخص قرآن کے کلام اللہ ہونے کا انکار کرے اور کہے کہ حضرت محمد ﷺ کا یا کسی اور کا کلام ہے تو وہ شخص کافر ہے اور اگر اس کے کلام اللہ ہونے کا تو اقرار کرے لیکن اس میں تاویل و تحریف سے کام لے جیسا کہ معتزلہ وغیرہ نے کیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ شیطان کے دامِ فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کے متعلق گفتگو ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔ "ولا یشبه قول البشر" یعنی کلام الٰہی اس قدر بلند پایہ، ایسا سچا اور ایسا فصیح و بلیغ ہے اور ایسے جمال و کمال پر مشتمل ہے کہ وہ ایک معجزہ ہے لہٰذا کوئی بھی انسانی کلام اس کے مشابہ نہیں ہوسکتا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کے بار بار چیلنج دینے اور غیرت دلانے کے باوجود بھی تمام بلغائے عرب مل کر قرآن کریم کی ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت کے مثل بھی کوئی کلام نہ پیش کر سکے۔

تنبیہ:۔ اہل سنت اور معتزلہ کے درمیان "خلق قرآن" کے مسئلہ میں یہ اختلاف درحقیقت نزاعِ لفظی ہے، کیونکہ اہل سنت جب قرآن کو غیر مخلوق کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کلام نفسی ہوا کرتی ہے اور معتزلہ جب قرآن کو مخلوق کہتے ہیں تو ان کی مراد کلام لفظی یعنی الفاظ و حروف ہوتے ہیں اور الفاظ و حروف کے قدیم ہونے کے قائل اہل سنت بھی نہیں ہیں۔ البتہ معتزلہ کلامِ نفسی کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور اہلِ سنت کلام نفسی کا وجود ثابت کرتے ہیں۔ کما والتفصیل فی المطولات۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب قرآن کا ذکر علی الاطلاق ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ازلیہ پر محمول ہوگا اور اس کو مخلوق کہنا درست نہ ہوگا اور یہ بھی

مدنظر رہے کہ قرآنِ لفظی کو بھی مخلوق کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں اس عقیدۂ باطلہ کا ایہام ہوتا ہے جو مؤدی الی الکفر ہے۔(کذا فی شرح الفقہ الاکبر)

قوله:"ومن وصف الله تعالى بمعنى من معاني البشر فقد كفر، فمن ابصر هذا فقد اعتبر وعن مثل قول الكفار انزجر وعلم ان الله تعالى بصفاته ليس كالبشر"

ترجمہ:اور جو شخص کسی انسانی خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو متصف کرے وہ کافر ہے پس جو اس میں بصیرت سے کام لے گا وہ عبرت حاصل کرے گا اور کافروں جیسی باتیں کرنے سے باز رہے گا اور یہ یقین کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات سمیت انسان کے مشابہ نہیں ہے۔

تشریح:۔گذشتہ سطور میں یہ بیان فرمایا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام حقیقی ہے،اب اس کے بعد متنبہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں بے مثل ہیں،کسی بھی صفت میں بشر کے مثل نہیں ہیں،مثلاً اللہ تعالیٰ متکلم ہیں لیکن اس کا اس صفت کے ساتھ متصف ہونا انسان کے متکلم ہونے کی طرح نہیں ہے کہ جس طرح انسان جارحہ زبان سے کلام کرتا ہے اسی طرح وہ بھی کسی آلہ کے ذریعہ کلام کرتا ہو،بلکہ اس کی شان نرالی ہے،وہ بے مثل ہے،اس لئے اس کے کلام کرنے کی کیفیت کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جاسکتی کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" خالق کی صفات اس کے شانِ دوام وبقا کے شایان ہیں اور مخلوق کی صفات اس کے حالِ فناء کے مناسب۔

قوله:-والرؤية حق لاهل الجنة بغير احاطة ولا كيفية، كما نطق به كتاب ربنا قال-وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ-وتفسيره على ما اراد الله تعالى وعَلِمَه وكل ما جاء في ذالك من الحديث الصحيح عن رسول الله ﷺ فهو كما قال ومعناه على ما اراد ولا ندخل في ذالك

متاولین بآرائنا ولا متوهمین باھوائنا فانه ماسلم فی دینه الامن سلم لله عزوجل ولرسوله ﷺ ورد علم ما اشتبه علیه الی عالمه"۔

ترجمہ: اور اہل جنت کا اللہ تعالیٰ کو بغیر احاطہ اور کیفیت کے دیکھنا حق ہے جیسا کہ ہمارے پروردگار کی کتاب اس کے ساتھ گویا ہے "اس روز کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے" اور اس کی تفسیر اس کے مطابق ہے جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور جس کو وہ جانتا ہے اور اس میں جو صحیح احادیث رسول اللہ ﷺ سے روایت ہیں وہ بھی اپنے حقیقی معنی پر محمول ہیں جو آپ نے مراد لیا ہے، اور ہم اس میں اپنی رائے سے نہ کوئی تاویل کرتے ہیں اور نہ اپنی خواہش کے مطابق وہم کو کام میں لاتے ہیں، اس لئے کہ دین میں صرف وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے، اور جو چیز مشتبہ ہو اسے اس کے جاننے والے کی طرف لوٹا دے

تشریح: مسئلہ رؤیت باری تعالیٰ:۔

رؤیت باری تعالیٰ کا مسئلہ مسائل مہمہ میں سے ہے، جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور شیعہ امامیہ اس کے منکر ہیں، تمام صحابہ وتابعین اور اہل سنت میں شامل تمام جماعتیں اس کی قائل ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ یہ اس عقیدۂ حقہ کی برکت سے اس نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ اندوز ہوں گی۔

"والرؤیة حق لاھل الجنة" اہلِ جنت کی تخصیص سے غیر اہل جنت سے رؤیت کی نفی معلوم ہوتی ہے، اہل جنت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے جنت میں مشرف ہوں گے، اور دخولِ جنت سے پہلے محشر میں بھی دیدارِ الٰہی سے شرفیاب ہوں گے کمافی الصحیحین، البتہ اس میں تین اقوال ہیں کہ اہلِ محشر میں سے کون کون لوگ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے:

(۱) صرف مؤمنین دیکھیں گے۔

(۲) تمام اہلِ محشر مومن وکافر سب دیکھیں گے، پھر اس کے بعد کفار کو رؤیت نہ حاصل ہوگی۔

(۳) مؤمنین اور منافقین دیکھیں گے اور دوسرے کفار نہ دیکھیں گے۔اور یہی اختلاف اہلِ محشر کے ساتھ اللہ تعالی کے ساتھ کلام فرمانے میں بھی ہے۔

اہل سنت والجماعت کاعقیدہ ہے کہ اس دنیا میں ان حسّی آنکھوں سے اللہ تعالی کو دیکھنا ممکن ہے، اس میں کوئی عقلی اور شرعی استحالہ نہیں ہے، عقلی استحالہ تو اس لئے نہیں ہے کہ اللہ موجود ہے اور جو موجود ہو اس کے ساتھ رؤیت متعلق ہوسکتی ہے، لہٰذا اللہ کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے، اس پر معتزلہ وغیرہ منکرین رؤیت کہتے ہیں کہ رؤیت اس کے ساتھ مشروط ہے کہ مرئی (جو چیز دیکھی جائے) مکان، جہت، دیکھنے والے کے مقابل اور ایسی مسافت پر ہو کہ جو غایت قُرب میں ہو اور غایت بعد میں نہ ہو اور یہ سب شرائط اللہ تعالی کے حق میں محال ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ منکرین کا رؤیت باری کو ان شرائط کے ساتھ مشروط کرنا ہمیں تسلیم نہیں ہے، اس لئے کہ مکان وجہت وغیرہ کی شرائط ہمارے لئے اسباب عادیہ کے طور پر ہیں کہ ان کے پائے جانے کے بعد اللہ تعالی رؤیت کو پیدا فرماتے ہیں، لیکن رؤیت ان اسباب پر موقوف نہیں ہے کہ اگر یہ نہ پائے جائیں تو رؤیت بھی نہ پائی جائے، اللہ تعالی اس پر قادر ہیں کہ بغیر ان اسباب کے بھی رؤیت پیدا فرمادیں، چنانچہ نبی اکرم ﷺ بعض اوقات اپنے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح آگے دیکھتے تھے، حالانکہ پیچھے مرئی رائی کے مقابل میں نہیں ہوتا۔

اور شرعی استحالہ اس لئے نہیں ہے کہ سیدنا موسیٰ نے اللہ تعالی سے سوال کیا تھا کہ ''رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْكَ'' اے اللہ! تو مجھے اپنے کو دکھلادے میں تجھے دیکھوں گا، اگر اس دنیا میں دیکھنا ممکن نہ ہوتا تو موسیٰ یہ سوال نہ فرماتے، کیونکہ باوجود ناممکن ہونے کے سوال کرنا جہل ہے اور پیغمبرانِ خدا امور شرعیہ میں جہل سے منزہ ہوتے ہیں، اس سے معلوم

ہوا کہ شرعاً بھی اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں دیکھنا ممکن ہے۔

کیا اس دُنیا میں کسی نے اللہ کو دیکھا ہے؟

اب رہا یہ کہ اس دنیا میں کسی نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں؟ تمام اُمت اس پر متفق ہے کہ دنیا میں اپنی آنکھوں سے کسی نے اللہ کو نہیں دیکھا، لیکن صرف رسولِ اکرم ﷺ کے متعلق اختلاف ہے، بعض حضرات نے آنکھ سے دیکھنے کا انکار کیا ہے، اور بعض نے اس کو ثابت کیا ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کا انکار کرتی ہیں، جب حضرت مسروق نے ان سے دریافت کیا "هل رأى محمد ربه" "کیا محمد (ﷺ) نے اپنے رب کو دیکھا تھا؟ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: "لقد قفّ شعري مما قلت" "تمہاری بات سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، پھر فرمایا جو تم سے یہ بیان کرے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو وہ جھوٹا ہے چنانچہ ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آنحضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، لیکن حضرت عطاءؒ نے انہی سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنے دل سے دیکھا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اضطراب ہے۔ بہرحال اس امر پر کوئی قطعی نص نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، واللہ اعلم بحقیقة الحال۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ بحوالہ شفا قاضی عیاض)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

> "اس میں اختلاف ہے کہ حق تعالیٰ کو اس شب میں آپ نے دیکھا یا نہیں؟ اس میں سلف وخلف سب کا اختلاف ہے اور روایات محتمل تاویل کو ہیں کیونکہ روایات مثبتہ رؤیت میں احتمال ہے کہ رؤیت بالقلب مراد ہو اور نفی رؤیت سے کسی خاص رؤیت کی نفی مراد ہو مثلاً قیامت کے روز جنت میں جو انکشاف ہوگا یہ انکشاف اس سے کم ہو گو رؤیت صادق آئے

جیسے بے عینک دیکھنا بھی دیکھنا ہے اور عینک سے اور زیادہ انکشاف ہوتا ہے، غرض اس مسئلہ میں توقف بہتر ہے انتہی۔

(بیان القرآن: ج:٦ ص:٤٧ سورۃ بنی اسرائیل)

مصنفؒ نے رؤیت باری تعالیٰ کی دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے "وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (القیامۃ: ۲۲، ۲۳) منکرینِ رؤیت معتزلہ وغیرہ نے اس میں طرح طرح کی بیجا تاویلات بلکہ تحریفات کی ہیں، لیکن اس طرح کی تاویلات سے اگر کسی چیز کا ثبوت یا نفی ہوسکتی ہے تو پھر جنت ودوزخ اور حساب وکتاب وغیرہ کی تمام نصوص میں تاویل کر کے سب کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ آیت دلائل رؤیت میں واضح ترین دلیل ہے، اس میں اولاً تو نظر کی اضافت "وجہ" کی طرف ہے جو "محل نظر" (دیکھنے کی جگہ) ہے اور پھر یہ متعدی بہ "الیٰ" ہے جس کے معنی صراحۃً آنکھوں سے دیکھنے کے ہیں، نیز کوئی قرینہ بھی نہیں ہے جس کی بناء پر حقیقی معنی موضوع لہ کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لیے جائیں اور نہ کوئی ایسی مجبوری ہے کہ جس کی وجہ سے حقیقت کو ترک کر دیا جائے۔

اس آیت کے علاوہ یہ آیت بھی رؤیت کی دلیل ہے "لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ" (یونس:۲٦) (جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی (یعنی جنت) ہے اور مزید براں (خدا کا دیدار بھی)۔ اس میں "حسنیٰ" سے مراد جنت اور "زیادۃ" سے مراد دیدار الٰہی ہے، آیت کی یہ تفسیر صحیح مسلم وغیرہ میں مروی ہے۔ نیز ان کے علاوہ بھی آیات ہیں جو رؤیت باری کی دلیل ہے۔

اور احادیث تو اس باب میں درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، چنانچہ تقریباً تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے رؤیت کی احادیث مروی ہیں۔ (کذا فی شرح العقیدۃ الطحاویہ)

"**بغیر احاطة ولا كيفية**" اللہ تعالیٰ کا دیدار بدون احاطہ اور کیفیت کے اس لئے ہوگا کہ وہ کمالِ عظمت وجلال کا مالک ہے، پس جس طرح ہمیں اس کے وجود کا علم ہے لیکن ہم اس کا علمی احاطہ نہیں کر سکتے اسی طرح اہل جنت کو اس کی رؤیت حاصل ہوگی لیکن

احاطہ رؤیت نہ ہوگا، فرماتے ہیں: "لَاتُدْرِكُهُ الأَبصَارُ" (الانعام: ۱۰۳) (اس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی) اور فرمایا: "وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلمًا" (طٰہٰ: ۱۱۰) (اور اس کو ان کا علم احاطہ نہیں کرسکتا)۔

"**وتفسیرہ علی ما ارادالله به ولامتوهمين باهوائنا**" یعنی جس طرح معتزلہ وغیرہ نے کتاب وسنت میں من مانی تحریف وتاویل کر کے اللہ ورسول کی مراد کے خلاف ان کی تفسیر وتشریح کی ہے اہل سنت کا یہ طریقہ نہیں ہے، اہل سنت صرف ایسی ہی تاویل کرتے ہیں جو شریعت کے موافق ہو اور کلام کا سباق وسیاق اور قرینہ مقام اس کا مقتضی ہو، ہر ایسی تاویل تحریف ہے، جو متکلم کے منشاء کے خلاف کلام کی تشریح کرے، کیونکہ تاویل سے مقصود متکلم کے منشاء کی توضیح ہے، نہ کہ اپنے منشاء کے مطابق کلام کی توضیح کرنا، ایسی تاویل کو تاویل نہیں بلکہ تحریف کہتے ہیں۔

"**فانه ماسلم فی دینه الا من سلم لله عز وجل ولرسوله ورد علمه الی عالمه**" مطلب یہ ہے کہ کتاب وسنت میں جو کچھ ہے اس کو بے چوں وچرا تسلیم کرے اور بیجا شکوک وشبہات اور فاسد تاویلات کو اس میں راہ نہ دے یہ خیال کرنا کہ جب عقل ونقل میں تعارض ہو تو عقل کو ترجیح ہوگی خیال باطل اور قاعدۂ فاسدہ ہے کیونکہ نقلِ صحیح اور عقل میں جب تعارض ہوگا تو نقلِ صحیح کو ترجیح ہوگی وجہ اس کی یہ ہے کہ عقل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو اس کا قبول کرنا واجب ہے، پس عقل ہی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نقل صحیح عقل پر مقدم ہوگی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عقل سلیم اور نقل صحیح میں تعارض ہو بھی نہیں سکتا، جب تعارض ہوتا ہے تو یا نقل صحیح نہیں ہوتی یا عقل سلیم نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ علم صحیح کا معیار نقلِ صحیح ہے، عقلِ انسانی نہیں ہے، یہ بھی ایک قابلِ غور امر ہے کہ خود عقلاء کے درمیان شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، اب ایسی صورت میں کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کے لئے کوئی مرجح ضروری ہے اور وہ مرجح نقل صحیح کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

قولہ:-ولایثبت قدم الاسلام الاعلی ظهرالتسلیم والاسلام۔

ترجمہ: اور اسلام کا قدم نہیں ثابت رہ سکتا مگر کامل اطاعت اور فرماں برداری کی پشت پر۔

تشریح:۔ اسلام کے لئے قدم اور تسلیم واستسلام کے لئے ظہر (پشت) کا اثبات بطور استعارہ ہے، مطلب یہ ہے کہ صرف اسی شخص کا اسلام ثابت ہے جو کتاب وسنت کے نصوص کو مکمل طور پر تسلیم کرے اور اس کے مقابلہ میں اپنی عقل وقیاس کو دخل نہ دے اور شکوک وشبہات اور اعتراضات واشکالات نہ کرے، اس موقع پر امام زہریؒ کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں: ”من الله الرسالة ومن الرسول البلاغ وعلینا التسلیم“ (اللہ نے پیغام ہدایت بھیجا اور رسول نے اس کو ہم امتیوں تک پہنچایا اور ہمارے ذمہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور بس)۔

عقل ونقل کا فرق:۔

عقل اور نقل کے فرق مراتب کی وضاحت اس مثال سے بخوبی ہوجاتی ہے کہ عقل کی مثال عامی مقلد جیسی ہے اور نقل شرعی کی مثال عالم مجتہد جیسی بلکہ عقل کا درجہ نقل شرعی کے مقابلہ میں اس سے بھی کم ہے، کیونکہ عامی کے لئے علم حاصل کر کے عالم بن جانا ممکن ہے لیکن عالم کے لئے نبی اور رسول بننا قطعاً ممکن نہیں، اب اگر ایک عامی نے جو کسی عالم ومفتی سے واقف تھا دوسرے عامی کو بھی اُن مفتی سے واقف کرادیا، پھر اس دوسرے عامی نے مفتی سے کوئی مسئلہ پوچھا اور اس پہلے عامی نے جس نے اس کو مفتی سے واقف کرایا تھا اس سے اختلاف کیا اور دوسرے عامی سے یہ کہنے لگا کہ چونکہ میں نے ہی تم کو ان عالم تک پہنچایا تھا اس لئے تمہیں میری ہی بات ماننی چاہئے تو اس کا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دوسرے عامی کو ان عالم ومفتی ہی کی بات ماننا ضروری اور واجب ہے، بس اسی طرح جب عقل نے نقل شرعی اور رسول خدا تک پہنچادیا تو اب اگر عقل اور نقل شرعی میں اختلاف بھی واقع ہو تو

نقلِ شرعی ہی کی بات ماننا واجب ہوگی۔ (کذا فی شرح العقیدۃ الطحاویہ)

قوله: "فمن رام علم ما حُجِزَ عنه علمُه ولم يقنع بالتسليم فهمُه حجبه مرامُه عن خالص التوحيد وما في المعرفة وصحيح الايمان"۔

ترجمہ: پس جو شخص اپنی رسائی سے باہر علم کا ارادہ کرے اور اس کی عقل تسلیم کرنے پر قانع نہ ہو تو اس کا مقصد و ارادہ اس کو توحیدِ خالص اور صاف ستھری معرفت اور ایمانِ صحیح سے روک دے گا۔

تشریح:۔ اس عبارت سے مصنفؒ کا مقصد عبارت ماقبل کی تاکید اور دین کے عقائد و اصول میں بدون علم کلام کرنے سے تحذیر ہے، خود اللہ تعالی اس کی بابت ارشاد فرماتے ہیں۔

"وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اِنَّ السمعَ والبصَرَ والفؤادَ كُلُّ اولئك كَانَ عَنهُ مَسئُولاً"۔ (بنی اسرائیل:٣٦)

(اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر، کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی (قیامت کے دن) پوچھ ہوگی)۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"اِن يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهوَى الانفُسُ وَلَقَد جَآءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الهُدٰى"۔ (النجم:٢٣)

(یہ لوگ صرف بے اصل خیالات پر اور اپنے نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے (بواسطہ رسول) ہدایت آچکی ہے)۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ماضل قوم بعد هدىً كانوا عليه الا اوتوا الجدل ثم تلا

"مَا ضَرَبُوهُ لَكَ اِلَّا جَدَلاً"۔(رواہ الترمذی)

کوئی قوم ہدایت پر ہونے کے بعد نہیں گمراہ ہوئی مگر (اس وقت جبکہ)

انہیں "جدل" دیا گیا اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "ان

لوگوں نے جو یہ بیان کیا ہے تو محض جھگڑے کی وجہ سے"۔

تین جماعتیں فساد کا سبب ہیں:۔ بقول حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے عالم میں تین فرقوں کے سبب سے فساد پیدا ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

رأیت الذنوب تمیت القلوب
وقد یورث الذل ادمانها
وترك الذنوب حیاة القلوب
وخیرٌ لنفسك عصیانها
وهل افسد الدین الا الملوك
واحبار سوء ورهبانها

ترجمہ: میرا عقیدہ ہے کہ گناہ، دل کو مردہ کر دیتے ہیں اور گناہ پر اصرار و مداومت ذلت کا سبب ہے، اور گناہوں کا ترک کر دینا دل کی زندگی ہے، تیرے نفس کے لئے اس کی نافرمانی کرنا ہی بہتر ہے، اور دین کو نہیں فاسد کیا مگر بادشاہوں اور علمائے سوء اور بُرے راہبوں نے۔ ظالم بادشاہ اپنی ظالمانہ سیاست کو شریعت پر مقدم کرتے ہیں اور اللہ و رسول کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور علماء سوء تاویلات فاسدہ اور قیاسات باطلہ سے دین میں تبدیلی و تحریف کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں اور رہبان یعنی جاہل صوفیہ اپنے ازواق و مواجید اور وساوس شیطانی کو ترجیح دیتے اور شریعت غرّاء پر اعتراض کرتے ہیں۔ پس جب سیاست اور شریعت میں تعارض ہوتا ہے تو ملوک سیاست کو، اور جب عقل و نقل میں تعارض ہوتا ہے تو علمائے سوء عقل کو اور جب ذوق و مواجید اور کشف اور شریعت میں تعارض ہوتا ہے تو جاہل صوفیہ اپنے ذوق و کشف کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام طحاویؒ کی اس

عبارت سے یہ معلوم ہوا کہ سارے طریقے باطل اور غلط ہیں، رسول اللہ ﷺ کی کامل متابعت دین کے تمام شعبوں میں ضروری ہے، اس میں جس قدر کمی ہوگی درحقیقت اسی قدر توحید میں کمی اور ایمان میں ضعف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(النساء:٦٥)

(پھر قسم ہے آپ کے رب کی کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورا پورا تسلیم کریں)۔

قوله: "فيتذبذب بين الكفر والايمان والتصديق والتكذيب والاقرار والانكار مُوَسوِساً تائِهاشاكا زائغاً لامؤمناً مصدقاًولاجاحِداًمُكذباً"۔

ترجمہ: پس وہ وسوسے، حیرانی اور شک میں پڑ کر کفر وایمان، تصدیق وتکذیب اور اقرار وانکار کے درمیان تردّد میں مبتلا ہوجائے گا، نہ تو صدق دل سے ایمان ہی لائے گا اور نہ کھلم کھلا انکار وتکذیب ہی کرے گا۔

تشریح:۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہی ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے عدول وانحراف کرتے ہیں یا زیادہ احتیاط سے کام لیتے ہیں تو اپنے حسب منشاء نصوص شرع میں تاویل فاسد کرکے اپنے جی کو بیجا خوش کرتے ہیں، بڑے بڑے فلاسفہ اور حکماء کا حال یہ ہوا ہے کہ آخر میں جب توفیق الٰہی نے ان کی دستگیری کی ہے تو انہوں نے اپنے عجز اور گذشتہ عمر کی بے حاصلی کا اعتراف کیا اور یہ کہا کہ میں اس عقیدہ پر مر رہا ہوں جو مسلمان

بوڑھیوں کا عقیدہ اور دین ہے ''ھا انا ذا اموت علی عقیدۃ اُمی او قال علی عقیدۃ عجائز نیسابور" (سن لو! میں اپنی ماں یا یہ کہا کہ نیشا پور کی بوڑھیوں کے عقیدہ پر مر رہا ہوں) کما قال ابو المعالی الجوینی عند موتہ۔ ولنعم ما قیل فی ھذا الباب۔

نهاية إقدام العقول عقال

وغاية سعي العالمين ضلال

ترجمہ: عقل کے اقدام کی انتہاء پابستہ زنجیر ہو جاتا ہے اور سارے اہلِ عالم کی سعی کی غایت ضلالت و گمراہی ہے۔

وارواحنا في وحشة من جسومنا

وحاصل دنيانا اذى ووبال

ترجمہ: ہماری روحوں کو ہمارے جسموں سے وحشت ہے اور ہماری دنیا کا حاصل اذیت اور وبال ہے۔

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا

سوى ان جمعنا فيه قيل وقالوا

ترجمہ: پوری عمر بحث و مباحثہ سے ہم نے سوائے قیل وقال کے کچھ حاصل نہ کیا۔

فكم قد رأينا من رجال و د و لة

فبادوا جميعاً مسرعين وزالو

ترجمہ: ہم نے کتنے لوگوں اور سلطنتوں کو دیکھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہلاکت کے گھاٹ اُتر گئے۔

وكم من جبالٍ قد علت شرفاتها

رجالٌ فزالوا والجبال جبال

ترجمہ: اور کتنے پہاڑ ہیں کہ جن کی بلندیوں پر مردان کار چڑھے اور پھر ختم ہو گئے

اور پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہے۔

قوله:"ولایصح الایمان بالرؤیة لاهل دار السلام لمن اعتبرها منهم بِوَهْمٍ اوتأوّلها بِفَهْمٍ اذکان تاویل الرؤیة وتاویل کل معنی یضاف الی الربوبیّة لایصح فلایصح الایمان بالرؤیة الابترك التأویل ولزوم التسلیم وعلیه دین المرسلین ومن لم یتوقّ النفی والتشبیه زلّ ولم یُصب التنزیهَ"۔

ترجمہ: جو شخص اہلِ جنت کے لئے دیدارِ الٰہی میں وہم کرے یا اپنے فہم سے اس میں تاویل کرے تو اس کا ایمان دیدارِ الٰہی پر صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ رؤیت کی تاویل، اور ہر ایسے معنی کی تاویل جو ربوبیت سے متعلق ہو، صحیح نہیں ہے، پس رؤیت پر ایمان صحیح نہیں ہوگا مگر تاویل ترک کرکے، اور تسلیم لازم کرکے، اور یہی پیغمبروں کا دین ہے، اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی صفت کے انکار سے یا اس کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینے سے پرہیز نہ کیا اس نے لغزش کھائی اور تنزیہ کو نہ پہنچ سکا۔

تشریح: منکرینِ رؤیت کا رد اور اہل سنت کی دلیل:۔

یہاں بھی مصنفؒ نے معتزلہ وغیرہ منکرینِ رؤیت پر رد فرمایا ہے، اہل سنت کی دلیل رؤیت باری تعالیٰ پر علاوہ آیات قرآنی کے وہ احادیث ہیں جو تقریباً تیس صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں، جن میں ایک حدیث یہ ہے جس کو صحیح بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "انکم ترون ربکم کما ترون القمر لیلة البدر" (بے شک تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح چاند چودھویں رات میں دیکھتے ہو) معتزلہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی تمام نصوص میں "رؤیت بمعنی علم" ہے یعنی "ترون" کے معنی "تعلمون" ہیں اس لئے اس سے آنکھوں سے دیکھنا ثابت نہیں ہوتا، لیکن ان کا یہ

قول صحیح نہیں، کیونکہ ''رؤیت'' کبھی ''بصر'' سے ہوتی ہے اور کبھی ''قلب'' سے اور کبھی خواب دیکھنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور جب ان معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین قرینہ سے ہوجائے تو دوسرے معانی مُرادنہ ہوں گے، پس یہاں پر یہ قرینہ ''کما ترون القمر لیلة البدر'' کمافی روایۃ اور ''ترون ربکم کما ترون الشمس فی الظهیرة لیس دونها سحاب'' آنکھ سے دیکھنے کا معنی متعین ہے، کما لا یخفی علی من یتمتع بحظ من العقل''۔

''لمن اعتبرها منهم بوهم'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اوہام باطلہ سے طرح طرح کے خیالات باندھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح دیکھا جائے گا اور اس طرح دیکھا جائے گا اور ان خیالات باطلہ کی وجہ سے کبھی تشبیہ میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کبھی تعطیل کا شکار ہوجاتا ہے، اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔

''او تأولها بفهم'' مطلب یہ ہے کہ یہ گمان کرے کہ اس نے نص شرعی کی تاویل اپنے فہم کے مطابق کی ہے، گو وہ تاویل ظاہرِ نص کے خلاف ہو اور اس مفہوم کے بھی خلاف ہو جو اہلِ زبان اس عبارت سے سمجھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی تاویل تاویل ہی نہیں ہے بلکہ تحریف ہے، پس جس تاویل کے ترک کا ذکر مصنف نے کیا ہے دراصل اس سے مراد تحریف ہی ہے لیکن انہوں نے اس کو تاویل کے لفظ کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کہ ہمارے اکابر ''دلِ دشمنان ہم نکردند تنگ'' پر عمل پیرا تھے۔

یہ واضح رہے کہ نص مؤول کے جو معنی کتاب وسنت کے موافق ہوں گے وہی تاویل صحیح ہوگی اور اگر ایسی تاویل کی گئی جو کتاب وسنت کے مخالف ہو تو وہ تاویل فاسد بلکہ تحریف ہے۔

قوله :- فان ربنا جل وعلا موصوف بصفات الوحدانية منعوت بنعوت الفردانية ليس فی معناه احد من البرية ۔

ترجمہ: اس لئے کہ ہمارا پروردگار جل وعلا وحدانیت کی صفات کے ساتھ موصوف اور فردانیت کی نعوت کے ساتھ متصف ہے، کوئی بھی مخلوق اس کے معنی میں شریک نہیں ہے۔

تشریح:۔ وصف اور نعت مترادف الفاظ ہیں اور بعض نے دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ وصف کا استعمال ذات کے لئے ہوتا ہے اور نعت کا فعل کے لئے۔ وحدانیت اور فردانیت: بھی مترادف ہیں لیکن بعض نے ان دونوں میں بھی فرق کیا ہے کہ وحدانیت کا استعمال ذات کے لئے ہوتا ہے اور فردانیت کا صفات کے لئے، تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد اور اپنی صفات میں منفرد ہے۔

مصنفؒ کی یہ عبارت مضمونِ بالا کی تاکید کے لئے ہے، اور دراصل یہ سورۂ اخلاص سے ماخوذ ہے چنانچہ "موصوف بصفات الوحدانیة" "قُل هُوَاللهُ اَحَدٌ" سے اور "معنوت بنعوته الفردانیة" "اَللهُ الصَّمَدُ لَم یَلِد وَلَم یُولَد" سے اور "لیس فی معناه احد من البریة" "وَلَم یَکُن لَهٗ کُفُواً اَحَدٌ" سے ماخوذ ہے، کما ھو ظاھر بادنی تأمل۔

قوله:۔ تعالیٰ عن الحدود والغایات والارکان والاعضاء والادوات ولا تحویه الجهات الستُّ کسائر المبتدعات۔

ترجمہ: وہ حدود وغایت اور ارکان واعضاء اور آلات سے برتر وبالا ہے، تمام (اکثر) مخلوقات کی طرح چھ جہتیں اس کا احاطہ نہیں کرتیں۔

تشریح: اللہ تعالیٰ کے لئے اعضاء وادوات جیسے الفاظ کے استعمال میں تین اقوال ہیں:۔

اللہ تعالیٰ کی نسبت حدود وارکان اور اعضاء وادوات جیسے الفاظ کے استعمال اور اطلاق کی بابت تین اقوال ہیں: (۱) ایک جماعت مطلقاً نفی کرتی ہے، (۲) اور ایک

جماعت علی الاطلاق اثبات کی قائل ہے (۳) اور ایک جماعت نہ تو مطلقاً نفی کرتی ہے اور نہ مطلقاً اثبات کی قائل ہے بلکہ وہ تفصیل سے کام لیتی ہے کہ جو الفاظ اور معانی کتاب وسنت کی نصوص سے ثابت ہیں ان کے اثبات کی قائل ہے اور کتاب وسنت میں جن الفاظ ومعانی کی نفی ہے ان کی نفی کی قائل ہے۔ یہی جماعت سلفِ صالحین کی متبع ہے اور یہی اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے۔ یہ تو ان الفاظ کے متعلق تھا جو کتاب وسنت میں وارد ہیں، لیکن جو الفاظ کتاب وسنت میں نہیں آئے ہیں ان کے استعمال کرنے والے کی غرض اور مقصد میں غور کیا جائے گا، اگر اس کی مراد صحیح اور موافق شریعت ہے تو قبول کر لیا جائے گا البتہ مبہم اور مجمل الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے گا اور نصوصِ شریعت میں جو الفاظ وارد ہیں ان ہی کو استعمال کیا جائے گا، ہاں اگر مخاطب ایسا ہے کہ اس سے بغیر ان الفاظ مجملہ مصطلحہ کے گفتگو ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں ایسے الفاظ کے استعمال کی بھی اجازت ہوگی۔

(شرح العقیدۃ الطحاویہ)

حضرت مصنفؒ نے اپنی عادت کے مطابق یہاں پر بھی فرقہ مشبہ کا رد فرمایا ہے جو معاذ اللہ! اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ جسم وجثہ اور اعضاء وغیرہ رکھتا ہے۔

ائمہ سلفؒ کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی حد نہ معلوم ہے اور نہ معلوم ہو سکتی ہے، چنانچہ ابوداؤد طیالسیؒ فرماتے ہیں کہ سفیانؒ، شعبہؒ، حماد بن زیدؒ، حماد بن سلمہؒ، شریکؒ اور ابوعوانہؒ نہ تو اللہ تعالیٰ کی حد بیان کرتے تھے اور نہ اس کی ذات وصفات کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ اور تمثیل دیتے تھے، وہ حدیث روایت کرتے اور ''کیف'' (کیونکر) نہ کہتے اور جب ان سے دریافت کیا جاتا تو وہی کہتے جو اثر (سنت) میں آیا ہے۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ)

امام مالکؒ سے جب استواء کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ: ''الاستواء معلوم والکیف مجهول والسؤال عنه بدعة والایمان به واجب'' یعنی یہ تو

معلوم ہے کہ استواء اللہ تعالی کی ایک صفت ہے، لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے، اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ (شرح الفقہ الاکبر)

ارکان واعضاء اور ادوات کی نفی سے منکرینِ صفات نے غلط فائدہ اُٹھایا اور بعض ان صفات کا بھی انہوں نے انکار کر دیا جو دلائل قطعیہ سے ثابت ہیں مثلاً ''ید اور وجہ'' وغیرہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے ''الفقہ الاکبر'' میں فرمایا:

"له يد و وجه ونفس كما ذكر تعالى فى القرآن من ذكر اليد والوجه والنفس فهوله صفة بلا كيف ولايقال ان يده قدرته ونعمته لأن فيه ابطال الصفة"۔

(اللہ تعالی کے لئے ید اور وجہ اور نفس ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ید، وجہ اور نفس کا ذکر فرمایا ہے، پس یہ اللہ کی صفت بلا کیف ہے اور یہ نہ کہا جائے کہ ید سے مراد قدرت اور نعمت ہے کیونکہ اس سے صفت کا باطل کرنا لازم آتا ہے)۔

چنانچہ ان الفاظ وصفات کا ثبوت کتاب وسنت کے قطعی دلائل سے بوضاحت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''مَامَنَعَكَ أَن تَسجُدَ لِمَاخَلَقتُ بِيَدَيَّ'' (ص:۷۵) (جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کون سی چیز مانع ہوئی) اور ارشاد فرمایا: ''كُلُّ شيءٍهَالِكٌ اِلّاوَجهَه'' (القصص:۶۶) (سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے) نیز فرمایا: ''كَتَبَ رَبُّكُم عَلىٰ نَفسِهِ الرَّحمَةَ'' (الانعام:۵۴) (تمہارے رب نے مہربانی فرمانا اپنے ذمہ مقرر کرلیا ہے) پس ان صفات (ید و وجہ و نفس وغیرہ کو) اعضاء و جوارح یا ادوات وارکان نہیں کہا جائے گا، اس لئے کہ رُکن ماہیت کا جزو ہوتا ہے اور اللہ تعالی احد و صمد ہے تجزی اور تبعیض سے پاک ہے۔ اسی طرح اللہ تعالی جارحہ سے بھی پاک ہے کیونکہ اس کے اندر اکتساب اور انتفاع کے معنی پائے جاتے ہیں، اور ادوات سے بھی پاک ہے اس لئے کہ ادوات کے معنی آلہ کے ہیں

جس کے ذریعہ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کا کام لیا جاتا ہے، اور حق تعالی سے یہ تمام امور منتفی ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی کی صفات میں ان امور کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔

-لا تحویہ الجہات الخ- لفظ جہت کا اطلاق دو معنوں میں ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ وہ امر موجود ہے اور دوسرے یہ کہ وہ امر معدوم ہے، اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خالق اور مخلوق کے سوا کوئی اور چیز موجود نہیں ہے، اب اگر جہت سے مراد اللہ کے علاوہ کوئی امر موجود ہے تو وہ مخلوق ہوگا، لہذا مصنف" کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ اس کو جہات محیط نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی مخلوق اللہ تعالی کو محیط نہیں ہو سکتی۔ اور اگر جہت سے مراد کوئی امر معدوم ہے جو کہ مافوق عالم ہے تو وہاں تو اللہ کے سوا کچھ بھی نہیں، پس اس اعتبار سے اگر کہا جائے کہ اللہ تعالی جہت میں ہے تو یہ کہنا صحیح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام عالم کے اوپر اور صفت علو کے ساتھ متصف ہے اور مصنف" کی مراد اس عبارت سے یہ ہے کہ کوئی بھی مخلوق اللہ تعالی کو محیط نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی سارے عالم کو محیط ہے۔

اب مصنف" پر ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ ان کی عبارت "کسائر المبتدعات" سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہر مخلوق محوی اور مُحاط (گھری ہوئی) ہے لیکن اس میں نظر ہے کیونکہ اگر یہ مراد ہے کہ امر وجودی سے محاط اور محوی ہے تو یہ تسلیم نہیں کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہ عالم ایک دوسرے عالم میں ہے اور وہ دوسرا عالم تیسرے عالم میں وھلم جراً فیلزم التسلسل وھو ممنوع۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ امر عدمی سے محوی اور محاط ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ مخلوق عدم میں نہیں ہے، بلکہ بعض مخلوقات ایسی ہیں جو دوسری مخلوق میں داخل ہیں جیسے آسمان و زمین کہ کرسی میں داخل ہیں، اور بعض مخلوقات وہ ہیں جو منتہی المخلوقات ہیں جیسے عرش اور سطح عالم کہ کسی مخلوق کے اندر داخل نہیں

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ لفظ ''سائر'' یہاں پر جمیع کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کے معنی بقیہ کے ہیں اور یہی اس کے اصل معنی ہیں کما صرح به الحریری فی درة الغواص اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محوی اور محاط نہیں ہے جس طرح کہ اکثر مخلوقات محوی اور محاط ہیں۔

قوله: "والمعراج حق قد أُسري بالنبی ﷺ وعُرج بشخصه فی الیقظة الی السماء ثم الیٰ حیث ماشاء الله من العُلی واکرمه الله سبحانه وتعالیٰ بماشاء فَأَوحیٰ إِلیٰ عَبدِهٖ مآ اوحیٰ"۔

ترجمہ: اور معراج حق ہے راتوں رات بیداری کی حالت میں نبی اکرم ﷺ کو جسمانی طور پر سیر کرائی گئی اور آسمان پر پہنچایا گیا، پھر جہاں تک اللہ کو منظور ہوا لے جایا گیا، اور اللہ تعالیٰ نے جس عزت واکرام کے ساتھ چاہا آپ کو نوازا، اور جو کچھ وحی آپ کی طرف کرنی تھی کی، (نظر نے جو کچھ دیکھا دل نے اسے جھوٹ نہ جانا، اللہ آپ پر دنیا وآخرت میں درود وسلام نازل کرے۔)

تشریح: معراج حق ہے:۔

معراج مفعال کے وزن پر عروج سے مشتق اور اسم آلہ ہے یعنی وہ چیز جس کے ذریعہ چڑھا جائے، یہ بمنزلہ سیڑھی کے کوئی چیز تھی جس کی کیفیت معلوم نہیں ہے، تمام امور غیبیہ کی طرح اس پر ہمارا ایمان ہے اور اس کی کیفیت وغیرہ کی تفصیل میں ہم نہیں پڑتے۔

معراج روحانی تھی یا جسمانی؟

اسراء اور معراج کی بابت یہ اختلاف ہے کہ روحانی تھی یا جسمانی، حضرت عائشہؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت حسن بصریؒ معراجِ روحانی کے قائل ہیں، لیکن روحانی کا مطلب

یہ نہ سمجھا جائے کہ جس طرح خواب دیکھنے والا خواب دیکھتا ہے اس طرح آپ نے خواب میں مشاہدہ فرمایا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی روح نے اسراء کیا اور جسم اسی عالم میں موجود رہا یعنی روح مبارک جسم سے علیحدہ ہو کر گئی اور جسم انور یہیں موجود رہا پھر روح مبارک اس میں واپس آ گئی اور خواب میں روح جسم سے علیحدہ نہیں ہوتی، بلکہ سونے والا صرف یہ محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر یا فلاں مقام پر جا رہا ہے حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے کیونکہ اس کے جسم و روح دونوں یہیں موجود ہوتے ہیں، نہ روح جسم سے علیحدہ ہو کر کہیں جاتی ہے اور نہ جسم کے ساتھ، اس لئے اگر معراجِ روحانی ہی تسلیم کر لی جائے تو پھر بھی اس کا معجزہ ہونا ثابت ہے کیونکہ کسی کی روح موت سے پہلے اس کے جسم سے علیحدہ ہو کر آسمان پر نہیں جاتی۔ پس حضرت عائشہؓ وغیرہ کی مراد یہ نہیں ہے کہ آپ کو معراج منامی ہوئی بلکہ ان حضرات کی مُراد یہی ہے کہ صرف آپ کی روحِ مبارک کو عروج ہوا اور جسم اطہر یہیں رہا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بھی آپ کے خصائص میں سے ہے لیکن ناصر الدین البانی نے شرح العقیدۃ الطحاویہ کے حاشیہ میں لکھا ہے: ''لم یصح ذالك عنهما فهو فى غنيةٍ عن التاويل ''(یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول بطریق صحیح ثابت نہیں ہے لہٰذا اس تاویل کی کچھ ضرورت ہی نہیں)۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

بعض احادیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسراء حالتِ منام میں ہوئی جس کو معراجِ جسمانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بحالتِ بیداری ہوئی، اس لئے بعض علماء نے یہ تطبیق دی کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا، ایک دفعہ بحالتِ خواب اور ایک دفعہ بحالتِ بیداری، اور بعض نے کہا کہ ایک مرتبہ قبل وحی، اور بعض نے کہا کہ تین مرتبہ پیش آیا ایک بار قبل وحی اور دو بار بعد وحی، لیکن ائمہ محققین فرماتے ہیں کہ صرف ایک مرتبہ بعثت کے بعد ہجرت سے ایک سال یا ایک سال دو ماہ قبل مکہ معظمہ میں معراج ہوئی، وھٰذا ھو الاصح۔

اور اسی طرح جمہور علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ معراج بحالت بیداری جسمِ اطہر کے

ساتھ ہوئی، قرآن حکیم کی اس آیت سے بھی ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے:

"سُبحٰنَ الذی اَسریٰ بِعَبدِہٖ لَیلاً مِنَ المسجدِالحرامِ اِلیٰ المسجدِالاقصیٰ"۔(اسرائیل:۱)

(وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندہ کو شب کے وقت مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا)۔

کیونکہ "عبد" نام ہے جسم وروح کے مجموعہ کا نہ کہ صرف روح کا، جس طرح کہ انسان نام ہے مجموعہ جسم وروح کا (اس سے ثابت ہوا کہ اسراء بھی مجموعہ جسم وروح کے ساتھ ہوئی تھی نہ کہ صرف روح کے ساتھ۔)

حضرت حکیم الامت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ: "بیت المقدس تک لے جانے کا منکر کافر ہے اور ماوّل مبتدع ہے اور آگے جانے کا منکر اور ماوّل دونوں مبتدع ہیں اور ہر چند کہ سورۂ نجم میں تصریح ہے لیکن "عند" میں احتمال ہے کہ وہ "راٰہُ" کے مفعول کا حال ہو اس لئے آپ کے سدرۃ المنتہیٰ پہنچنے میں نص نہیں ہے"۔انتہیٰ

(بیان القرآن: ج:٦ ص:٤٧ سورۂ بنی اسرائیل)

قوله:"والحوض الذی اکرمه الله تعالی به غیاثاً لاُمته حق"۔

ترجمہ: اور وہ حوض جس سے اللہ تعالی نے آپ کی اُمت کو سیراب کرنے کے لئے آپ کو نوازا ہے، حق ہے۔

تشریح: حوض کوثر حق ہے:۔

حوض کوثر کی بابت احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، جن کو تیس سے زائد صحابہ کرامؓ نے روایت فرمایا ہے، چنانچہ مسند احمد میں "حضرت انس بن مالکؓ" سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہلکی سی نیند آ گئی پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر مبارک اُٹھایا اور صحابہؓ سے ارشاد فرمایا، یا صحابہؓ ہی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ آپ کے تبسم فرمانے کا کیا

سبب ہے؟اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی ابھی میرے اوپر ایک سورت نازل کی گئی ہے،اس کے بعد" بسم الله الرحمن الرحیم اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ" پوری سورت تلاوت فرمائی۔ پھر صحابہؓ سے فرمایا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا ہے؟سب نے عرض کیا کہ اللہ اوراس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں،فرمایا کہ وہ ایک نہر ہے جو مجھے میرے پروردگار عزوجل نے جنت میں عطا فرمائی ہے،اس کے اوپر خیر کثیر ہے،قیامت کے روز اس پر میری اُمت آئے گی،اس کے برتن تاروں کی تعداد میں ہوں گے،جب کسی بندہ کو ان لوگوں کے درمیان سے نکال لیا جائے گا تو میں عرض کروں گا کہ اے میرے رب! یہ میرا اُمتی ہے تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپ کے بعد کیا نئی چیزیں (بدعات) نکالیں"۔الفاظ کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی روایت صحیح مسلم میں بھی ہے،نیز ایک روایت میں ہے کہ:"میرے حوض کی مقدار ایسی ہے جیسے ایلہ سے صنعاء یمن تک اور اس میں آسمان کے تاروں کی تعداد کے مثل لوٹے ہوں گے"۔

اس حوض کی کیفیت کی بابت جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بڑا حوض ہے جس میں نہر کوثر سے جنتی مشروب آتا ہوگا،یہ مشروب دودھ سے زیادہ سفید،برف سے زیادہ ٹھنڈا،شہد سے زیادہ میٹھا اور مشک سے زیادہ پاکیزہ،خوشبو والا ہوگا، انتہائی وسیع ہے اور عرضاً وطولاً برابر ہے،ہر کونے سے دوسرے کونے تک ایک ماہ کی مسافت ہے،اور اس کے درمیان سے مشک اور چھوٹے چھوٹے موتی اور سونے کی شاخیں اُگتی ہوں گی اور قسم قسم کے جواہرات کے پھل نکلیں گے۔نیز حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ ہر نبی کے لئے ایک حوض ہوگا اور ہمارے نبی ﷺ کا حوض سب سے بڑا،سب سے شیریں ہوگا اور اس پر سب سے زیادہ پینے والے ہوں گے جعلنا الله منهم بفضله وكرمه۔

(ملخص از شرح العقیدة الطحاویہ)

میزان پہلے ہوگا یا حوض؟اس میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ حوض پہلے ہوگا،امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ حوض اس زمین کے بعد جو دوسری زمین صاف وشفاف مثل

چاندی کے پیدا ہوگی اس پر ہوگا، اس زمین پر نہ کوئی خون ہوا ہوگا اور نہ کوئی جور و ظلم۔

قولہ:" والشفاعة التی اِدّخرها لهم حق ، کما رُوی فی الاخبار"۔

ترجمہ: اور وہ شفاعت جو اللہ تعالی نے ان کے لئے محفوظ رکھی ہے حق ہے، جیسا کہ احادیث میں مروی ہے۔

تشریح: شفاعت کی قسمیں:۔

شفاعت کئی قسم کی ہوگی:

(۱) شفاعتِ کبریٰ جو ہمارے نبی اکرم ﷺ تمام مخلوق کے لئے قیامت کے روز اس وقت فرمائیں گے جب ساری خلق حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام سے شفاعت کرنے کی درخواست کرنے اور ان سب حضرات سے جواب پانے کے بعد آپ کی خدمت میں آئے گی، آپ اس وقت عرشِ الٰہی کے نیچے سجدہ میں گر پڑیں گے اور مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کی شفاعت فرمائیں گے، اللہ تعالی اس شفاعت کو قبول فرمائیں گے۔

(۲) ان لوگوں کے لئے شفاعت جن کی نیکیاں اور بُرائیاں برابر ہوں گی، آنحضور ﷺ جنت میں ان کے داخلہ کے واسطے شفاعت فرمائیں گے۔

(۳) ان لوگوں کے لئے شفاعت جن کے لئے دوزخ میں ڈالے جانے کا حکم ہو چکا ہوگا، تا کہ وہ دوزخ میں نہ ڈالے جائیں۔

(۴) اہلِ جنت کے درجات کی بلندی کے لئے شفاعت فرمانا۔ معتزلہ صرف اس شفاعت کے قائل ہیں اور اس کے علاوہ تمام شفاعتوں کے منکر ہیں۔

(۵) کچھ لوگوں کے متعلق یہ شفاعت فرمانا کہ وہ جنت میں بغیر حساب داخل ہو جائیں۔

(۶) تخفیف عذاب کے لئے شفاعت جیسے ابوطالب کے لئے آپ شفاعت فرمائیں گے کہ ان پر عذاب میں تخفیف ہو جائے چنانچہ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لعله تنفعه شفاعتی یوم القیامة یجعل فی ضحضاح من نار تبلغ کعبیه یغلی منه ام دماغه". رواه البخاری ومسلم

(أمید ہے کہ ان کو (ابوطالب کو) قیامت کے بعد میری شفاعت نفع دے وہ آگ کے چھوٹے سے حصہ میں کر دیئے جائیں گے جو ان کے ٹخنوں تک پہنچے گی اس کے سبب ان کا دماغ کھولتا ہوگا)۔

(جمع الفوائد فضائل جماعة من غیر الصحابة)

اگر یہ اشکال ہو کہ یہ: ''فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ'' (المدثر:۴۸) (سو ان کو سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی) کے خلاف ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں شفاعت کے نافع نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ خروج نار کے لئے شفاعت کافروں کو نافع نہ ہوگی نہ کہ مطلقاً نافع نہ ہوگی فلا تعارض بین الآیة الکریمة والحدیث الصحیح۔

(۷) اس کی شفاعت کہ تمام مؤمنین کو دخولِ جنت کی اجازت دی جائے۔

(۸) اپنی اُمت کے ان اہل کبائر کے حق میں آپ کا شفاعت فرمانا جو دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے پھر آپ کی شفاعت سے نکالے جائیں گے، اس شفاعت کا ثبوت احادیثِ متواترہ سے ہے، لیکن اس کے باوجود خوارج اور معتزلہ اس کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دخولِ نار کے بعد کوئی اس سے نکالا نہ جائے گا۔ یہ شفاعت آنحضور ﷺ کے علاوہ دوسرے انبیاء، ملائکہ اور مومنین علی حسب المراتب کریں گے، نیز آنحضور ﷺ یہ شفاعت چار بار فرمائیں گے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے بخاری و مسلم)

اس کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ مشرکین ونصاریٰ اور غالی مبتدعین کے

نزدیک اللہ کے حضور میں ان حضرات شافعین کی شفاعت ایسی ہے جیسے دُنیا میں اصحابِ وجاہت کی سفارش ہوا کرتی ہے کہ جس سے سفارش کی جاتی ہے وہ سفارش کرنے والے کے جاہ ومنصب کی رعایت اور اثر کی وجہ سے خواہی نخواہی اس کو قبول کرتا ہے۔اور معتزلہ وخوارج نے اہلِ کبائر کے بارے میں آنحضور ﷺ کی شفاعت کا بھی انکار کیا ہے اور اہلسنت والجماعۃ اہل کبائر کے متعلق نبی کریم ﷺ کی شفاعت اور دوسرے صلحاء وعلماء کی شفاعت کے قائل ہیں ،لیکن ان حضرات میں سے کوئی بھی اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت نہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی ایک حد بھی متعین فرمادے گا۔کما فی الحدیث الصحیح

قوله:"والميثاق الذى اخذه الله تعالىٰ من آدم وذريته حق".

ترجمہ:اور وہ عہد جو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے لیا تھا،حق ہے۔

تشریح:۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَاِذَاَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِى آدَمَ مِن ظُهُورِهِم ذُرِّيَتَهُم وَ اَشهَدَ هُم عَلىٰ اَنفُسِهِم اَلَستُ بِرَبِّكُم قَالُوا بَلىٰ شَهِدنَا اَن تَقُولُوا يَومَ القِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَن هٰذا غٰفِلِينَ"۔

(الاعراف:۱۷۲)

(اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہیں کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں،ہم (سب اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم اس (توحید) سے محض بے خبر تھے)۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے

آدمؑ کو پیدا فرمایا پھران کی پیٹھ پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا اوران سے اولا دنکالی، اور فرمایا میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ اہلِ جنت ہی کا عمل کریں گے، پھر اللہ تعالی نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اولا دنکالی اور فرمایا میں نے ان کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ اہل دوزخ کا عمل کریں گے، ایک شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! پھر عمل کس لئے ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ عزوجل جب بندہ کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہلِ جنت کے عمل کی توفیق عطا کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اہلِ جنت کے اعمال میں سے کسی عمل پر مرتا ہے، پس اس کے سبب جنت میں داخل ہوتا ہے، اور جب بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس کو اہلِ جہنم کے عمل کی توفیق دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اہلِ جہنم کے اعمال میں سے کسی عمل پر مرتا ہے، پس اس کے سبب وہ دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ وابن ابی حاتم وابن جریر وابن حبان فی صحیحہ (از شرح العقیدۃ الطحاویہ)

قوله: "وقد علم الله فيما لم يزل عدد من يدخل الجنة و يدخل النار جملةً واحدةً ولايزداد فى ذالك العدد ولا ينقص منه وكذالك افعالهم فيما علم منهم ان يفعلوه وكل ميسر لما خُلق له والاعمال بالخواتيم والسعيد من سعد بقضاء الله والشقى من شقى بقضاء الله".

ترجمہ: اور اللہ تعالی ازل سے ان لوگوں کی تعداد جانتا ہے جو جنت میں جائیں گے اور جو دوزخ میں جائیں گے بیک دفعہ، اور اس عدد میں کوئی زیادتی اور کمی نہ ہوگی، اور اسی طرح ان کے ان افعال کو جانتا ہے جو وہ کریں گے اور ہر ایک کے لئے وہ عمل آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اور اعمال کا اعتبار خاتمے پر ہے، اور نیک بخت وہ ہے جو اللہ کے فیصلہ میں نیک بخت ہو اور بد بخت وہ ہے جو اللہ کے فیصلہ میں بد بخت ہو۔

تشریح:۔قرآن حکیم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ " (الانفال:۷۵) (بے شک اللہ تعالی ہر چیز کو خوب جانتے ہیں) یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ازلی وابدی ہے ایسا نہیں کہ پہلے وہ کسی شے کو نہ جانتا ہو بعد میں جاننے لگا ہو۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ بقیع میں ایک جنازہ کے ساتھ تھے،رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے اور بیٹھ گئے،ہم لوگ بھی آپ کے اردگرد بیٹھ گئے،آپ کے پاس ایک عصا تھا آپ نے اس کا سرا جھکایا اور اس سے زمین کریدنے لگے،پھر فرمایا کہ کوئی جان نہیں جو پیدا ہوئی ہو مگر یہ کہ اللہ تعالی نے جنت اور دوزخ میں اس کی جگہ لکھ دی ہے اور مگر یہ کہ یہ لکھ دیا جاچکا ہے کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت؟ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کیا پھر ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر ہی نہ ٹھہر جائیں اور عمل ترک کردیں،آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص نیک بختوں میں سے ہوگا وہ نیک بختوں کے عمل کی طرف جائے گا اور جو بدبختوں میں سے ہوگا وہ بدبختوں کے عمل کی طرف جائے گا،پھر فرمایا،عمل کرو کہ ہر ایک کے لئے وہ آسان کردیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے،رہے نیک بخت تو ان کو نیک بختوں کے عمل کی آسانی اور سہولت دی جائے گی،اور رہے بدبخت تو ان کو بدبختوں کے عمل کی آسانی دی جائے گی،پھر آپ نے یہ آیتیں تلاوت فرمائیں:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰى
وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ
لِلْعُسْرٰى۔ (سورۃ الاعلیٰ:۵تا۱۰)

(سو جس نے اللہ کی راہ میں (مال) دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات (ملتِ اسلام) کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (خدا سے) بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات (اسلام) کو جھٹلایا تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دے

دیں گے)۔ بخاری و مسلم

اس باب میں بے شمار حدیثیں وارد ہیں، من شاء التفصیل فلیراجع الی

کتب الحدیث والسنة۔

ابن عبدالبرؒ "التمہید" میں لکھتے ہیں کہ اس باب میں لوگوں نے بہت سے آثار نقل کئے ہیں اور متکلمین نے طویل کلام کیا ہے، لیکن اہل سنت ان آثار پر ایمان واعتقاد اور اس میں بحث ومباحثہ کے ترک پر متفق ہیں۔ وباللہ العصمة والتوفیق۔

قوله:- واصل القدر سِرُّ الله تعالى فى خلقه لم يطلع على ذالك مَلَكٌ مُقَرَّبٌ ولانبيٌ مُرسَلٌ والتعمق والنظر فى ذالك ذريعة الخذلان وسُلَّمُ الحِرمان ودرجة الطُغيان فالحذر كل الحذر من ذالك نظراً وفكراً ووسوسةً فان الله تعالى طوىٰ عِلمَ القدر عن انامه ونهاهم عن مرامه كما قال تعالى لايُسئَلُ عَمَّا يَفعَلُ وَهُم يُسئَلُونَ فمن سأل لِمَ فَعَلَ فقد رَدَّ حُكمَ الكتابِ ومن ردَّ حكم الكتاب كان من الكافرين۔

ترجمہ: اور تقدیر کی اصل یہ ہے کہ وہ مخلوق کے اندر اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے جس کو نہ تو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نبی مرسل، اور اس میں غور وفکر کرنا رُسوائی کا سبب، حرماں نصیبی کا موجب اور سرکشی کا ذریعہ ہے، خبردار! اس میں غور وفکر اور وسوسہ سے بچتے ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم اپنی مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے اور ان کو اس کے مقصد وغرض (کے معلوم کرنے) سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے سامنے) جوابدہ نہیں ہے اور سب لوگ جوابدہ ہیں، پس جس نے یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیوں کیا تو اس نے

اللہ کی کتاب کا حکم ماننے سے انکار کیا اور جس نے کتاب اللہ کے حکم کا
انکار کیا وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

تشریح: تقدیر ایک راز ہے:۔

تقدیر کی اصل کیا ہے؟ یہ ایک راز ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، وہ پیدا کرتا ہے اور وہی فنا کر دیتا ہے، کسی کو فقیر و محتاج بناتا ہے اور کسی کو دولت و ثروت سے مالا مال کر دیتا ہے، کسی کو ہدایت کے نور سے دُور رکھتا ہے اور کسی کے دل کو نورِ ہدایت سے منور اور روشن کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: "القدر سر الله فلا نکشفه" (تقدیر خدا کا راز ہے ہم اس کو ظاہر نہیں کر سکتے) سچ کہا ہے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

اور ؎

زباں تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

اہلسنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بندوں کے افعال کے خالق ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ" (القمر:۴۹) (ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا) دوسری جگہ فرمایا: "وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيراً" (الفرقان:۲) (اور اس نے (ممکنات میں سے) ہر (موجود) چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا) اور اللہ تعالیٰ کافر سے کفر کا ارادہ کرتے اور چاہتے ہیں لیکن اس کو پسند نہیں کرتے اور نہ اس سے راضی ہوتے ہیں، پس تکوینی طور پر تو اللہ تعالیٰ اس کو چاہتے ہیں لیکن تشریعی لحاظ سے اس سے راضی نہیں۔

فرقہ قدریہ اور معتزلہ اس عقیدہ میں اہل سنت کے مخالف ہیں، ان کا گمان باطل یہ

ہے کہ اللہ نے کافر سے ایمان چاہا لیکن کافر نے کُفر چاہا، وہ لوگ یہ اس لئے کہتے ہیں تا کہ اس اعتراض سے بچ جائیں کہ اللہ نے کافر سے کُفر چاہا اور اس کے باوجود اس کو کُفر پر عذاب دیا، لیکن بجائے اس کے کہ اعتراض سے خلاصی پاتے ''فرمن المطر وقام تحت المیزاب'' کے مصداق ہوئے، کیونکہ یہ کہہ کر وہ اس اعتراض سے گو بچ گئے، لیکن اس سے زیادہ بُرا پھنسے، اس لئے کہ ان لوگوں کے قول سے یہ لازم آتا ہے کہ کافر کا چاہنا (مشیت) اللہ کے چاہنے پر غالب آ گیا کہ جب اللہ نے اس سے ایمان چاہا اور اس نے کفر چاہا اور کفر ہی کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کی مشیت اللہ کی مشیت پر غالب آ گئی، معاذ اللہ! اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا بدترین بات ہے اور ساتھ ہی اس کی کوئی دلیل بھی ازروئے عقل و نقل نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"۔ (السجدۃ:۱۳)

(اور اگر ہم کو منظور نہ ہوتا تو ہم ہر شخص کو اس کا راستہ عطا فرماتے لیکن میری یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات اور انسان دونوں سے ضرور بھروں گا)۔

اور فرمایا:

"مَن يَشَإِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَن يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ"

(الانعام:۱۹)

(اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں بے راہ کر دیں اور وہ جس کو چاہیں سیدھی راہ پر لگا دیں)۔

اور فرمایا:

"وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ"۔

(التکویر:۲۹)

(اور تم بدوں خدائے رب العالمین کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے)۔

ایک قدری اور ایک مجوسی:۔

عمرو بن الہیثم کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک کشتی میں نکلے، ہمارے ساتھ ایک قدری اور ایک مجوسی بھی تھا، قدری نے مجوسی سے کہا کہ اسلام قبول کرلو، مجوسی نے کہا کہ اللہ چاہے گا تو قبول کرلیں گے، قدری نے کہا کہ اللہ تو چاہتا ہے لیکن شیطان نہیں چاہتا، مجوسی نے کہا، جب ایک چیز اللہ نے چاہی اور شیطان نے بھی چاہا اور شیطان کا چاہا ہوگیا تو اس سے معلوم ہوا کہ شیطان زیادہ طاقتور ہے پس میں اسی کے ساتھ ہوں جوان دونوں میں زیادہ طاقتور ہے۔

ایک اور واقعہ:۔

کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں عمرو بن عبید بھی تھا جو قدری تھا، ایک اعرابی آگیا، اس نے کہا کہ میری اونٹنی چوری ہوگئی ہے آپ لوگ دعا کریں کہ اللہ اس کو واپس کردے، عمرو بن عبید نے کہا، اے اللہ! تو نے نہ چاہا کہ اس کی اونٹنی چوری ہو لیکن چوری ہوگئی، پس اس کو واپس کردے، یہ سُن کر اعرابی نے کہا کہ مجھے تمہاری دعا کی کوئی ضرورت نہیں، اس نے کہا کہ کیوں؟ اعرابی نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ جس طرح اس کے نہ چاہنے کے باوجود چوری ہوگئی اسی طرح اس کے چاہنے کے باوجود واپس نہ ہو۔

ایک سوال اور جواب:۔

ایک شخص نے ابو عصام قسطلانی سے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے ہدایت نہ عطا کرے اور ضلالت میں ڈال دے پھر اس پر مجھے عذاب دے تو کیا وہ انصاف کرنے والا ہوگا؟ ابو عصام نے اس سے کہا کہ اگر ہدایت ایسی چیز ہے جو اللہ ہی کی ملکیت ہے تو اس کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔

قدریہ اور جبریہ کی گمراہی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرقے مشیت وارادہ

اور محبت ورضا کو یکساں سمجھتے ہیں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتے، پھر جبر یہ کہتے ہیں کہ کائنات ساری اللہ تعالی کے قضاء وقدر سے ہے اس لئے یہ اللہ کے نزدیک محبوب اور مرضی (پسندیدہ) بھی ہے اور قدر یہ کہتے ہیں کہ معاصی چونکہ اللہ کے نزدیک محبوب اور مرضی نہیں ہیں اس لئے یہ اللہ تعالی کی قضاوقدر سے نہیں ہیں اور اس کی مشیت وارادہ سے خارج ہیں۔

حالانکہ ان لوگوں کا یہ خیال محض باطل ہے، قرآن وحدیث میں مشیت ومحبت کا فرق واضح طور پر موجود ہے اور ذوقِ سلیم بھی اس کی شہادت دیتا ہے، مشیت اور ارادہ سے متعلق آیات ابھی اوپر گذر چکیں، محبت ورضا سے متعلق نصوص ذیل میں ملاحظہ فرمائیں، ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" (البقرہ:۲۰۵) (اور اللہ تعالی فساد کو پسند نہیں کرتا)۔ دوسری جگہ فرمایا: "وَلَا يَرْضىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ" (الزمر:۷) (اور وہ اپنے بندوں کے لئے کُفر کو پسند نہیں کرتا) اور بخاری ومسلم میں نبی اکرم ﷺ سے روایت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ: "ان الله كره لكم ثلاثاً قيل وقال و كثرة السؤال واضاعة المال" (بے شک اللہ تعالی تمہارے لئے تین چیزوں کو ناپسند فرماتے ہیں، قیل وقال، کثرتِ سوال اور اضاعتِ مال کو)۔

اب اگر اشکال ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالی ایک امر کا ارادہ فرمائیں اور اس سے راضی نہ ہوں؟ اور کسی امر کو پسند نہ فرمائیں پھر بھی اس کو چاہیں اور پیدا فرمادیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "مراد" (یعنی جس امر یا شے کا ارادہ کیا جائے) کی دو قسمیں ہیں: (۱) مراد لنفسہ اور (۲) مراد لغیرہ، مراد لنفسہ تو مطلوب اور محبوب بالذات ہے اور مراد لغیرہ مطلوب بالذات نہیں ہوتا، بلکہ وہ بالذات مکروہ اور ناپسندیدہ ہوتا ہے گو کسی مقصود کا وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مراد ہوتا ہے اور اسی لئے وہ مراد لغیرہ ہے، لہذا اس میں بغض وارادہ دونوں کا اجتماع ممکن ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے مریض تلخ اور بدمزہ دوا استعمال کرتا ہے کیونکہ اس سے اس کو شفاء کی اُمید ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات اپنے ہی کسی عضو ماؤف کو جراح سے

کٹوا دیتا ہے کیونکہ اس سے باقی جسم کی حفاظت مقصود ہوتی ہے، جو اُس کی نظر میں مطلوب اور محبوب ہوتی ہے جبکہ یہاں صرف ظنِ غالب کی بناء پر ان مکارہ کو برداشت کیا جاتا ہے، اور اللہ تعالی کی شان تو یہ ہے کہ اس سے نہ کوئی ذرّہ مخفی ہے اور نہ کسی چیز کا انجام پوشیدہ ہے۔

قوله: "فهذه جملة مايحتاج اليه من هومنور قلبه من اولياء الله تعالى وهى درجة الراسخين فى العلم لان العلم علمان، علمٌ فى الخلق موجود وعلمٌ فى الخلق مفقودٌ فانكار العلم الموجود كفرٌ وادعاء العلم المفقود كفرٌ ولايصح الايمان الابقبول العلم الموجود وتركِ طلب العلم المفقود"۔

ترجمہ: پس یہ ان عقائد کا خلاصہ ہے جس کے ضرورت مند اللہ تعالی کے وہ اولیاء ہیں جن کے دل روشن ہیں، اور یہ راسخین فی العلم کا درجہ ہے، اس لئے کہ علم کی دو قسمیں ہیں، وہ علم جو لوگوں میں موجود ہے اور وہ علم جو لوگوں میں مفقود ہے، پس علم موجود کا انکار کفر ہے اور (اسی طرح) علم مفقود کا دعویٰ کرنا (بھی) کفر ہے، اور ایمان صحیح نہیں ہوگا مگر علم موجود کے قبول کرنے اور علم مفقود کی طلب کو ترک کرنے سے۔

تشریح: علم کی دو قسمیں علم موجود اور علم مفقود:۔

لفظ "ھذہ" سے مضامین مذکورہ بالا کی طرف اشارہ ہے اور "راسخین فی العلم" میں علم سے مراد شریعت کا اجمالی و تفصیلی علم ہے، اور "علم مفقود" سے تقدیر کا علم مراد ہے جس کو اللہ تعالی نے مخلوق سے مخفی رکھا ہے اور "علم موجود" سے شریعت کے اصول و فروع کا علم مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت میں سے کسی چیز کا انکار کرے گا وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح جو علم غیب کا دعویٰ کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"عٰلِمُ الغیبِ فَلَا یُظھِرُ علیٰ غَیبِہ اَحَداً Oاِلَّا مَنِ ارتضیٰ مِن رَّسُولٍ"۔(الجن:۲۶،۲۷)

(غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو)۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"اِنَّ اللہَ عِندَہ عِلمُ الساعَۃِ وَیُنَزِّلُ الغَیثَ وَیَعلَمُ مَافِی الارحَامِ وَمَاتَدرِی نَفسٌ مَّاذاتَکسِبُ غداً وَمَاتَدرِی نَفسٌ بِاَیِّ ارضٍ تَمُوتُ اِنَّ اللہَ عَلِیمٌ خَبِیرٌ"۔(لقمان:۳۴)

(بے شک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا بے شک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے)۔

کسی چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت کیا ہے؟ اگر یہ ہمیں نہ معلوم ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں کوئی حکمت ہی نہیں کیونکہ عدم علم عدم کو مستلزم نہیں ہے، سانپ، بچھو، چوہا، بلی اور اسی طرح کی کتنی مخلوقات ہیں کہ جن کی پیدائش میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنی حکمتیں ہیں؟ لیکن ان میں سے کتنی حکمتیں ہیں جن کا ہمیں علم ہے؟

قوله:"ونؤمن باللوح والقلم وبجميع مافيه قد رَقَمَ".

ترجمہ: اور ہم لوح وقلم اور اس کے اندر لکھی ہوئی تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

تشریح:۔قرآن کریم کی آیت ہے:"بَل ھُوَقُراٰنٌ مَّجِیدٌ فِی لَوحٍ مَّحفُوظٍ" (البروج:۲۱،۲۲) (بلکہ وہ ایک باعظمت قرآن ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے) اور طبرانی نے اپنی سند کے ساتھ نبی اکرم ﷺ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ:

"بے شک اللہ تعالی نے لوح محفوظ کو سفید موتی سے پیدا کیا، اس کے صفحات سُرخ یاقوت کے ہیں، اس کا قلم نور ہے اور اس کی لکھاوٹ نور ہے۔ اللہ تعالی کے لئے اس میں ہر روز تین سو ساٹھ لمحے ہیں اور اس کا عرض آسمان وزمین کے درمیان ہے، اس میں ہر روز تین سو ساٹھ بار دیکھتا ہے، پیدا فرماتا ہے اور رزق دیتا ہے اور موت وحیات بخشتا ہے اور عزت وذلت دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔ اس حدیث میں جس لوح کا ذکر آیا ہے یہ وہی ہے جس میں اللہ تعالی نے مخلوقات کی تقدیریں لکھی ہیں اور قلم بھی وہی ہے جس سے اللہ تعالی نے لوح محفوظ کے اندر تقدیریں لکھی ہیں، چنانچہ "سنن ابوداؤد" میں حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"سمعت رسول الله ﷺ یقول اول ما خلق الله القلم فقال له اُکتب قال یارب! وما ذا اکتب؟ قال اکتب مقادیر کل شیٍٔ حتیٰ تقوم الساعة"۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ پہلے ہی جب اللہ نے قلم کو پیدا کیا تو اس سے کہا کہ لکھ اس نے کہا کہ اے رب! کیا لکھوں؟ فرمایا: قیامت تک کی ہر چیز کے مقادیر کو لکھ۔

اول المخلوقات قلم ہے یا عرش؟

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اوّل المخلوقات قلم ہے یا عرش؟ دونوں ہی قول ہیں، اصح یہ ہے کہ عرش قلم سے پہلے پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے حدیث صحیح میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالی نے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، فرمایا کہ (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا"۔ اس حدیث سے بصراحت یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تقدیر کی تحریر عرش کی پیدائش کے بعد ہوئی ہے، اور تقدیر کی تحریر قلم کی پیدائش کے اول وقت ہی ہوئی ہے جیسا کہ اوپر حدیث عبادہؓ سے معلوم ہو چکا ہے۔

اوّل ما خلق اللہ القلم کی ترکیب نحوی:۔

نیز یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ "اول ما خلق اللہ القلم" الخ بلحاظ ترکیب نحوی یا تو ایک جملہ ہے یا دو جملے ہیں، اگر ایک جملہ ہے اور قرین صحت یہی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تخلیق کے اول وقت ہی اللہ تعالیٰ نے اس سے "اکتب" فرمایا، اس صورت میں "اول" اور "القلم" دونوں منصوب ہوں گے۔ اور اگر دو جملے ہوں جو "اول" اور "القلم" کے رفع کے ساتھ مروی ہے تو پھر یہ مطلب ہوگا کہ قلم اس دنیا کی مخلوقات میں سب سے اول مخلوق ہے، اس طرح پہلی ترکیب کی بناء پر دونوں حدیثیں متفق ہو جائیں گی کیونکہ عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث میں یہ صراحت ہے کہ عرش تقدیر پر سابق ہے اور تقدیر تخلیقِ قلم کے ساتھ ہی ہوئی ہے اور دوسری حدیث کے الفاظ ہیں: "لما خلق الله القلم قال له اکتب" پس یہی قلم تمام اقلام میں اوّل و افضل ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ" میں جس قلم کی قسم کھائی ہے وہ یہی قلم ہے۔ اور لیلۃ الاسراء میں رسول اللہ ﷺ نے جن اقلام کے چلنے کی آواز سُنی تھی یہ وہ اقلام ہیں جو ان امور کو لکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ عالم علوی و سفلی میں تدبیر و انتظام کے لئے جاری فرماتے ہیں۔

قوله: "فلو اجتمع الخلقُ كلهم على شيءٍ كتبه الله تعالى فيه إنه كائنٌ ليجعلوه غير كائن لم يقدروا عليه ولو اجتمعوا كلهم على ما لم يكتبه الله ليجعلوه كائنا لم يقدروا عليه جَفَّ القلمُ بما هو كائن الى يوم القيامة"۔

ترجمہ: پس اگر ساری مخلوق اس چیز کے نہ ہونے کے لئے جمع ہو جائے جس کا ہونا اللہ نے لکھ دیا ہے تو بھی وہ ایسا نہیں کر سکتے، اور اگر سب کے سب اس چیز کے ہونے پر جمع ہو جائیں جس کا نہ ہونا اللہ نے لکھ دیا ہے تو وہ نہیں کر سکتے۔ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے قلم (اس کو لکھ کر) خشک ہو چکا ہے۔

تشریح:۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کے پیچھے تھا تو آپ نے فرمایا:

یاغلام! الا اعلمك كلمات، احفظ الله يحفظك، احفظ الله تجده تجاهك، اذا سألت فاسأل الله، واذا استعنت فاستعن بالله واعلم ان الامة لو اجتمعت على ان ينفعوك بشيء لم ينفعوك الا بشيء قد كتبه الله لك، ولو اجتمعوا على ان يضروك بشيء لم يضروك الا بشيء قد كتبه الله عليك، رفعت الاقلام وجفت الصحف" رواه الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

اے بچے! کیا میں تجھے چند کلمات نہ سکھلا دوں، اللہ کو یاد رکھ وہ تیری حفاظت کرے گا، اللہ کو یاد رکھ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، اور جب تو مدد چاہے تو اللہ سے مدد چاہ، اور جان لے کہ ساری قوم اگر تجھے کچھ نفع پہنچانے کے لئے جمع ہو جائے تو نہیں نفع پہنچا سکتی مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے، اور اگر یہ لوگ اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ تجھے کچھ نقصان پہنچائیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا جو اللہ نے تیرے خلاف لکھ دیا ہے، قلم اُٹھا لئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔ (ترمذی)

اس حدیث میں اور اسی طرح دوسری احادیث میں ''اقلام'' کا لفظ بصیغہ جمع آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقدیرات لکھنے کے لئے اس قلم اول کے علاوہ بہت سے اقلام ہیں جن کا ذکر لوح محفوظ کے ساتھ آیا ہے۔

قلم چار ہیں:۔

کتب سنت کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم کی تعداد چار ہے ''قلم اول'' جو تمام

مخلوقات کے لئے عام ہے جس کا ذکر لوح محفوظ کے ساتھ آیا ہے۔ ''قلم ثانی'' وہ قلم جو صرف بنی آدم کے لئے ہے، جیسا کہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے اعمال، رزق، عمر اور ان کی سعادت کو حضرت آدم کی تخلیق کے بعد ہی مقدر فرمادیا تھا۔ ''قلم ثالث'' جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس وقت ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے اور اس کو چار باتوں کے لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، اس کا رزق، اس کی عمر، اس کے عمل کے لکھنے کا اور یہ لکھنے کا کہ وہ شقی ہے یا سعید ہے۔ ''قلم رابع'' جو بندہ کے بلوغ کے وقت ''کراماً کاتبین'' کے ہاتھ میں ہوتا ہے جس سے وہ بنی آدم کے اعمال وافعال قلمبند کرتے ہیں۔

قوله:-وماأخطأ العبد لم يكن ليُصيبه وماأصابه لم يكن ليُخطئه۔

ترجمہ: اور جو چیز بندہ کو نہیں پہنچی وہ اس کو پہنچنے والی نہیں تھی، اور جو پہنچی وہ اس سے ٹلنے والی نہ تھی۔

تشریح:۔ اس عقیدہ کی بنیاد اس مذکورہ عقیدہ پر ہے کہ جو کچھ مقدر ہو چکا ہے وہ لامحالہ ہو کر رہے گا۔ بالکل سچ کہا عارف مجذوب نے ؎

نفعِ دینی دیکھ تو دُنیا کی بہبودی نہ دیکھ
مرضیٔ حق پر نظر کر اپنی بہبودی نہ دیکھ
تو اکیلا تیرے دُشمن سیکڑوں یہ بھی نہ دیکھ
قدرتِ حق پر نظر کر اپنی کمزوری نہ دیکھ

قوله:-وعلى العبد ان يعلم ان الله تعالى سبق علمُه في كل كائن من خلقه فقدّر ذالك بمشيته تقديراً محكماً مُبرَماً ليس له ناقضٌ ولامُعقبٌ ولامُزيلٌ ولامُغيرٌ ولامُحوّلٌ ولازائدٌ ولاناقصٌ من خلقه في سمواته وارضه ولايكون

مُکوّنٌ الابتکوینه والتکوین لایکون الاحسناً جمیلاً۔

ترجمہ: اور بندہ کے اوپر یہ لازم ہے کہ اس کا یقین کرے کہ اللہ تعالی کی جتنی مخلوق آئندہ ہونے والی ہے اس کا علم اللہ تعالی کو پہلے سے ہے، پس اس کو اپنی مشیت سے مضبوط اور قطعی طور پر مقدر کر دیا ہے، نہ آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں سے اس کو کوئی توڑ سکتا ہے نہ ہٹا سکتا ہے، نہ ٹال سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے، نہ تبدیل کر سکتا ہے، نہ زیادہ کر سکتا ہے اور نہ کم کر سکتا ہے، اور کائنات کی کوئی مخلوق نہیں ہوتی مگر اسی کی تکوین اور تخلیق سے، اور اس کی تکوین وتخلیق نہیں ہوتی مگر بہتر اور اچھی۔

تشریح: اللہ تعالی کا علم کائنات پر سابق ہے:۔

اس عقیدہ کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے جس کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ اللہ تعالی کا علم کائنات پر سابق ہے اور اس نے کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی ان کی تقدیرات مقدر فرمادی تھیں کما مر فی الحدیث الشریف۔ اور معتزلہ نے اللہ تعالی کے علم ازلی کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی بندوں کے افعال کو اسی وقت جانتے ہیں جب وہ ان افعال کو کر لیتے ہیں اور جب تک بندہ فعل نہیں کرتا اُس وقت تک اللہ کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ بندہ فلاں فعل کرے گا وتعالی اللہ عَمَّا یَقُولُونَ عُلُوّاً کَبِیراً۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ تعالی جانتا ہے کہ یہ بندہ فلاں کام کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور وہ اس فلاں کام کو کرے گا، اللہ تعالی اس کام کے کرنے پر اس کو ثواب عطا فرماتا ہے، اسی طرح اللہ تعالی یہ بھی جانتا ہے کہ یہ بندہ اس کام پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کو کرے گا نہیں، پس اس پر اللہ تعالی اس کو عذاب دیتا ہے کیونکہ باوجود قدرت کے اس نے وہ کام نہیں کیا حالانکہ اللہ کے علم میں یہ ہے کہ وہ اس پر قادر ہے۔

اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس سے لازم آتا ہے کہ بندہ اللہ تعالی کے علم کے بدل دینے پر قادر ہے، کیونکہ اللہ تعالی کے علم میں یہ بات ہے کہ وہ نہیں کرے گا، پس

اگراس کے باوجود بھی وہ اس کے کرنے پر قادر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کے علم میں تبدیلی پر قادر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت ایک مغالطہ ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بندہ کا فعل پر محض قادر ہونا اللہ کے علم میں تبدیلی کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ معترض جو علم میں تبدیلی کا گمان رکھتا ہے تو اس وقت جبکہ بندہ وہ فعل کرلے، اب اگر بندہ نے وہ فعل کرلیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم میں یہ تھا کہ وہ نہیں کرے گا اس کے باوجود اس نے کرلیا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علم میں یہی تھا کہ وہ اس فعل کو کرے گا، اس لئے کہ ہمیں اللہ کا علم اسی وقت معلوم ہوتا ہے جبکہ وہ فعل واقع ہو یا واقع نہ ہو، جب فعل واقع ہوا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ کے علم میں یہی تھا اور جب نہیں واقع ہوا تو یہ اس کی دلیل ہے کہ اللہ کے علم میں یہی تھا کہ واقع نہ ہوگا۔

قوله: "وذالك من عقد الايمان واصول المعرفة والاعتراف بتوحيد الله تعالى وربوبيّته كما قال تعالى وَخَلَقَ كُلَّ شيءٍ فَقَدَّرَهُ تَقدِيراً. وقال الله تعالى وَكَانَ اَمرُ اللهِ قَدَراً مَقدُوراً".

ترجمہ: اور یہ ایمان کی پختگی اور معرفت کے اصول اور اللہ کی توحید اور اس کی ربوبیت کے اعتراف سے ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا "اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا" اور اللہ تعالی نے فرمایا "اور اللہ کا حکم تجویز کیا ہوا (پہلے سے) ہوتا ہے"۔

تشریح:۔ اس عبارت سے ایمان بالقدر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر اوپر گذرا۔ "والاعتراف بتوحيد الله تعالى" مطلب یہ ہے کہ توحید اور اقرار ربوبیت اس وقت تک تام نہیں ہوسکتا جب تک صفات پر ایمان پورے طور پر صحیح نہ ہو مثلاً "خلق وتخلیق" اللہ کی ایک صفت ہے، اب جو شخص غیر اللہ کو کسی چیز کا خالق سمجھے تو وہ شرک کا مرتکب

ہے، پھر یہیں سے یہ بھی معلوم کر لینا چاہئے کہ جو لوگ تمام بندوں کو اپنے اپنے افعال کا خالق سمجھتے ہیں وہ کس زمرہ میں آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"القدریة مجوس هذه الامة ان مرضوا فلا تعودوهم وان ماتوا فلا تشهدوهم"۔(رواه ابوداؤد واسناده ضعيف قال الالبانى لكن له طرق يتقوى بها)

(قدریہ اس امت کے مجوس ہیں اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت کو مت جاؤ اور اگر وہ مر جائیں تو ان کے جنازہ میں شریک نہ ہوؤ)۔

قوله:"فويلٌ لمن صار لله فى القدر خصيماً واحضر للنظر فيه قلباً سقيماً لقد التمس بوهمه فى فحص الغيب سراً كتيماً وعاد بما قال فيه أفّاكاً أثيماً"۔

ترجمہ: پس ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر کے معاملہ میں اللہ تعالی کا مقابل بنے اور اس میں غور و فکر کرنے کے لئے بیمار دل لائے، اس نے اپنے وہم کے ذریعہ غیب کا ایک مخفی راز معلوم کرنا چاہا اور اس نے اس کی بابت جو کچھ کہا اس میں وہ بدترین جھوٹا اور گنہگار رہا۔

تشریح:۔ جس طرح جسم کے اوپر حیات و موت اور مرض و صحت طاری ہوتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قلب پر حیات و موت اور مرض و صحت طاری ہوتے ہیں، قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

"أَوَمَن كَانَ مَيتاً فَاحيينه وَجَعَلنَالَه نُوراً يَمشِى بِه فِى النَاسِ كَمَن مَثَلُه فِى الظُلُمٰتِ لَيسَ بِخَارِجٍ مِنهَا"۔

(الانعام:۱۲۲)

ایسا شخص جو کہ پہلے مُردہ تھا ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے کیا ایسا

شخص اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحت منداور زندہ قلب وہ ہے کہ جب اس کے سامنے باطل اور بُری چیزیں آئیں تو اس کی طبیعت اس سے متنفر ہو اور وہ اس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ ہو، اس کے برخلاف مُردہ دل وہ ہے جو حسن وقبح اور اچھے وبُرے کے درمیان تمیز نہ کرے چنانچہ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ "هلك من لم يكن له قلب يعرف به المعروف والمنكر" (جس کے پاس ایسا قلب نہ ہو جس کے ذریعہ وہ معروف ومنکر کو پہچان سکے وہ ہلاک ہوگیا) اسی طرح جو قلب مُردہ تو نہ ہو لیکن مریض ہو تو چونکہ بسبب مرض کے اس کے اندر ضعف پیدا ہوجاتا ہے اس لئے وہ بھی بلحاظ شدّت وضعف مرض کے امور باطلہ وقبیحہ کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔

قلب کی بیماری دوطرح کی ہے:۔

یہاں پر یہ بات یادرکھنے کی ہے کہ قلب کی بیماری دوطرح کی ہے: ایک شہوت کی بیماری اور دوسری شبہ کی بیماری۔ ان دونوں میں شبہ کا مرض زیادہ خطرناک ہے اور شبہات میں بھی وہ شبہ زیادہ پُرخطر ہے جو تقدیر کے متعلق ہو کہ شبہات سے بالعموم اور معاملہ تقدیر میں شبہہ سے علی الخصوص ایمان ہی جاتے رہنے کا خوف رہتا ہے جو درحقیقت قلب کی موت ہے۔

قوله: "والعرش والكرسي حق"۔

ترجمہ: اور عرش وکُرسی حق ہے۔

تشریح: عرش وکرسی حق ہے:۔

قرآن کریم میں ہے:

"لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ"۔ (المومنون:١١٦)

(اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں، عرش عظیم کا مالک ہے)۔

دوسری جگہ ہے:

"ذُوالعَرْشِ المَجِيدُ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ"۔(البروج:۱۵۔۱۶)

(عرش کا مالک، عظمت والا ہے، وہ جو چاہے سب کچھ کر گذرتا ہے)۔

اور بھی بہت سی آیات واحادیث میں عرش کا ذکر موجود ہے اور کرسی کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے جو آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے فرمایا: "وَسِعَ كُرسِيُّهُ السمٰوٰتِ والارضَ" (البقرہ:۲۵۵) (اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے) متکلمین کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ عرش اس فلک کا نام ہے جو مستدیر ہے اور سارے عالم کو ہر جہت سے محیط ہے اور اسی کا نام "فلک اطلس" ہے اور یہی نواں آسمان ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، کیونکہ نصوص شرعیہ سے یہ بات ثابت اور محقق ہے کہ "عرش" کے پائے ہیں جس کو فرشتے اُٹھائے ہوئے ہیں، چنانچہ بخاری ومسلم کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فان الناس يصعقون فاكون اول من يفيق فاذا انا بموسى آخذ بقائمة من قوائم العرش .فلاادري أفاق قبلي ام جوزي بصعقة الطور"۔

لوگ بیہوش ہوجائیں گے میں پہلا شخص ہوں گا جس کو ہوش آئے گا تو دیکھوں گا کہ موسیٰ عرش کے پایوں میں سے ایک پایہ پکڑے ہوئے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ انہیں مجھ سے پہلے ہوش آگیا یا طور کی غشی کا بدلہ انہیں دیا گیا۔

نیز لغت میں بھی عرش "تخت شاہی" کو کہتے ہیں نہ کہ فلک (آسمان) کو اور عرب جو اہل زبان ہیں وہ بھی "عرش" کے لفظ سے "فلک" کے معنی نہیں سمجھتے، اس لئے ازروئے شرع ولغت دونوں ہی عرش سے فلک کا مراد لینا درست نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "کرسی اور عرش" دونوں ایک ہی چیز ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ دونوں دوالگ الگ چیزیں

ہیں ،چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''کرسی موضع القدمین ہے اور عرش کا اندازہ اللہ تعالیٰ ہی کو ہے''۔اور سدیؒ نے کہا کہ'' آسمان اور زمین عرش کے سامنے کرسی کے وسط میں ہیں''۔نیز حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کرسی عرش میں ایسی ہی ہے جیسے لوہے کا چھلا زمین کے کسی بڑے میدان میں ڈال دیا گیا ہو''۔(ملخص ازشرح العقیدۃ الطحاویہ)

قوله:"وهو مستغن عن العرش وما دُونه محيطٌ بكل شيء وفوقه وقد اعجز عن الاحاطة خلقه"۔

ترجمہ: اور وہ عرش اور اس کے علاوہ چیزوں سے مستغنی ہے، ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ان سے اوپر ہے،اور اس نے اپنی مخلوق کو (اپنے) احاطہ سے عاجز کر رکھا ہے۔

تشریح:۔عرش اور کرسی کے ذکر کے بعد مصنفؒ یہ ذکر فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش وکرسی سے مستغنی اور بے نیاز ہے،معاذ اللہ!ان کا کچھ محتاج نہیں ہے،ان کی تخلیق بمقتضائے حکمت فرمائی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :''اِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنِ العالَمِينَ''۔(العنکبوت:٦) (بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہان سے بے نیاز ہے) اور فرمایا:''واللهُ هُوَ الغَنِيُّ الحَمِيدُ''(الفاطر:١٥)(اور اللہ بے نیاز،خوبیوں والا ہے) پس جب ایک مخلوق میں یہ بات مشاہد ہے تو خالق تعالیٰ کی شان تو ادراک سے بہت ہی ارفع واعلیٰ ہے،امام مالکؒ سے آیت ''ثُمَّ استوىٰ على العَرشِ'' کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا کہ ''استواء تو معلوم ہے،لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے''الاستواء معلوم والكيف مجهول"ويروى هذا الجواب عن ام سلمةؓ ۔

''محيطٌ بكل شيءٍ وفوقه'' اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:''اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيءٍ مُّحِيط''۔(حٰمٓ السجدہ:٥٤)(یادرکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے)۔دوسری جگہ ارشاد ہے:''وَاللهُ مِن وَّرَاۗئِهِم مُّحِيطٌ''(البروج:٢٠)(اور اللہ ان

کو ادھر ادھر سے گھیرے ہوئے ہے) اس احاطہ (گھیرنے) سے مُراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالی مخلوق کو اس طرح گھیرے ہوئے ہے جس طرح آسمان اپنے محتویات کو گھیرے ہوئے ہے یا یہ کہ تمام مخلوقات اللہ تعالی کی ذاتِ اقدس میں داخل ہیں، تعالی اللہ عن ذالك، بلکہ اس سے مراد اللہ تعالی کے علم وعظمت اور قدرت کا احاطہ ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کو بلحاظ اپنے علم وقدرت کے احاطہ کئے ہوئے ہے اور ساری کائنات اس کی عظمت کے مقابلہ میں ایک رائی کے دانہ کے برابر ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ: ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور جو کچھ ان کے اندر اور ان کے درمیان ہے رحمان کے ہاتھ میں ایسے ہی ہیں جیسے تم میں سے کسی کے ہاتھ میں رائی کا ایک دانہ"۔ اب غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی شخص کے پاس رائی کا ایک دانہ ہو تو وہ اس کو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے خواہ اس کو مکمل طور پر اپنی مٹھی میں رکھ کر بند کرلے اور خواہ اپنے نیچے رکھ لے، جس طرح بھی رکھے ہر حال میں یہی کہا جائے گا کہ یہ شخص اس رائی کے دانہ سے الگ اور علٰحدہ ہے اور بہمہ وجوہ اس سے عالی اور اس سے اوپر ہے، جب ایک انسان مخلوق کی ایک دانہ رائی کے مقابلہ میں یہ کیفیت ہے تو حق تعالی کی ذات یا عظمت کا کیا ٹھکانہ؟ وہ اگر چاہے تو تمام آسمان وزمین کی بساط کو آج ہی اس طرح لپیٹ دے جس طرح قیامت کے روز لپیٹے گا، پس عقلِ سلیم کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ اللہ تعالی بعض مخلوقات کے قریب کس طرح آجاتے ہیں یا وہ عرش وکرسی پر کس طرح جلوہ فرما ہیں، یہ سب کچھ اسی طرح اس کی ذات کے لئے ثابت ہیں جس طرح اس کی شایانِ شان ہیں، اس سے زیادہ کا ہمیں علم نہیں کہ اس کے آگے عقلِ انسانی سے ماوراء اور فہم وادراک کی حدود سے باہر کی باتیں ہیں۔

"فوقه" اللہ تعالی کی صفت فوقیت یعنی مخلوقات کے اوپر ہونے کے دلائل کثیرہ میں سے ایک دلیل یہ آیت قرآنی ہے: "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ"۔ (الانعام:٦١) (اور وہ اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے) دوسری جگہ ہے: "يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ"۔ (النحل:٥٠) (وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان پر بالادست ہے) اور

ایک اور جگہ ارشاد ہے: "اِلَیہ یَصعَدُ الکَلِمُ الطیّبُ"۔(الفاطر:۱۰)(اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے) اور بخاری میں ہے کہ اُمّ المؤمنین حضرت زینبؓ نبی اکرم ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات پر فخر کیا کرتی تھیں اور فرماتی تھیں "زوجکن اھالیکن وزوجنی اللہ من فوق سبع سمٰوٰت" (تم لوگوں کی شادی تمہارے گھر کے لوگوں نے کی ہے اور میرا نکاح اللہ نے سات آسمان کے اوپر سے کیا ہے) نیز صحیح حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک باندی سے دریافت فرمایا کہ "این اللہ؟" اللہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا "فی السماء" (آسمان میں) آپ نے فرمایا "من انا" میں کون ہوں؟ اس نے کہا "انت رسول اللہ" (آپ اللہ کے رسول ہیں) اس کے بعد آپ نے فرمایا "اعتقھا فانھا مؤمنة" (اس کو آزاد کردو اس لئے کہ یہ ایمان والی ہے) یہ اور اسی طرح کی دوسری آیات واحادیث سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالی کے لئے صفت علو وفوقیت ثابت ہے، اور اس کا انکار کرنا ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ؎

حق بات جانتے ہیں مگر مانتے نہیں
ضد ہے جناب شیخ تقدس مآب میں

"وقد اعجز عن الاحاطة خلقه" یعنی مخلوق اللہ تعالی کا احاطہ نہ بطور علم کرسکتی ہے اور نہ بطور روایت بلکہ کسی بھی طرح اس کا احاطہ نہیں کرسکتی کیونکہ وہ پاک ذات خود ہر شے کو محیط ہے۔

قوله:"ونقول ان الله تعالی اتخذ ابراهيم خليلا وكلم موسیٰ تكليما ايمانا وتصديقا وتسليما"۔

ترجمہ: اور ہم ایمان وتصدیق اور تسلیم کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خلیل بنایا اور موسیٰ (علیہ السلام) سے کلام کیا۔

تشریح: محبت اور خُلّت کے متعلق معتزلہ کا عقیدہ:۔

"خُلّت" محبت کے درجہ کمال کو کہتے ہیں۔ جہمیہ اور معتزلہ نے اللہ تعالی کی محبت کا

انکار کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ محبت، محب اور محبوب کے درمیان مناسبت کے بغیر نہیں ہوسکتی، اور ذاتِ قدیم اور حادث (مخلوقات) کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان محبت اور خُلّت بھی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح انہوں نے صفت کلام کی بھی نفی کی ہے۔

جعد بن درہم کا واقعہ:۔

اس عقیدۂ فاسدہ کا بانی جعد بن درہم ہے جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں ہوا ہے، اس وقت کے امیر عراق خالد بن عبداللہ القسری نے اپنے زمانہ کے علمائے حق کے فتووں کے بموجب اس کو قتل کر دیا تھا، جس کا واقعہ یہ ہے کہ امیر خالد نے مقام واسط میں عیدالاضحیٰ کا خطبہ دیا جس میں اس نے کہا کہ لوگو! قربانی کرو اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے، میں جعد بن درہم کی قربانی کروں گا کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ تو ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا، پھر وہ منبر سے نیچے اُترا اور جعد کو ذبح کر دیا۔ بعد میں جہم بن صفوان نے اسی مذہب کو اختیار کیا۔ اس کی اشاعت کی اور مناظرے کئے اس کو بھی امیر خراسان مسلم بن احوز نے قتل کر دیا، اس کے بعد معتزلہ نے اس عقیدہ کو اپنالیا، جنہوں نے مامون کے عہد میں بہت قوت اور اقتدار حاصل کرلیا تھا، جس کے نتیجے میں بڑے بڑے ائمہ اسلام اور بالخصوص امام احمد بن حنبلؒ کو مصائبِ عظیمہ جھیلنے پڑے، جس کا سلسلہ خلیفہ متوکل کے زمانہ میں ختم ہوا۔

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت وخلت اور کلام کو مخلوق کی محبت وکلام پر قیاس کرنا ہی غلط اور بنائے فساد ہے، کیونکہ ذات باری تعالیٰ کی تمام صفات کی طرح اس کی محبت وخلت بھی اس کی ذات والاشان کے شایان شان ہے، چنانچہ قرآنِ حکیم میں ہے: ''وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا''۔(النساء:۱۲۵)(اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا خلیل بنایا تھا) اور موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمانے کی نسبت ارشاد فرمایا: ''وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا''۔(النساء:۱۶۴)(اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا) نیز حدیث

صحیح میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"لو کنت متخذاً من اهل الارض خلیلا لاتخذت ابا بکر خلیلا ولکن صاحبکم خلیل الله".

(اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا لیکن تمہارے صاحب (اس سے مُراد خود آپ کی ذات ہے) اللہ کے خلیل ہیں)۔

قوله: "ونُؤمن بالملائکة والنبیین والکتبِ المنزلةِ علی المرسلین ونشهد انهم کانوا علی الحق المبین".

ترجمہ: اور ہم فرشتوں، نبیوں اور پیغمبروں پر نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ وہ سب واضح اور صریح حق پر تھے۔

تشریح: ارکانِ ایمان:۔

یہ سب امور منجملہ ارکانِ ایمان کے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"اٰمَنَ الرَّسُولُ بِمآ اُنزِلَ اِلَیه مِن رَّبِّه والمؤمِنُونَ کلٌّ اٰمَنَ بِاللهِ وَمَلائِکَته وَ کُتُبِه وَرُسُلِه"۔(البقرة:۲۸۵)

(اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اور مومنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ)۔

نیز حدیثِ جبرئیل میں ایمان کی بابت سوال کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا:

"ان تؤمن بالله وملائکته وکتبه ورسله والیوم الاٰخر وتؤمن بالقدر خیره وشره"۔

(کہ تو اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے
رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے اور اچھی و بُری تقدیر پر
ایمان رکھے)۔

یہ وہ اصول وارکان ایمان ہیں جن پر اعتقاد ویقین رکھنا ہر مومن کے لئے ضروری ہے تمام انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام ان پر متفق ہیں، اور ایمان اسی وقت ایمانِ صحیح وحقیقی اور ایمان شرعی ومطلوب ہوگا جبکہ اسی کیفیت کے ساتھ ہو جو کتاب وسنت میں وارد اور ان سے ثابت ہے اور جیسا کہ سلف صالحین وصحابہ کرامؓ کا ایمان تھا کما جاء فی القرآن الکریم ''وَاِذَا قِيلَ لَهُمۡ اٰمِنُوا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ''الآیۃ والمراد بالناس فی الآیۃ الصحابۃ رضی اللہ عنھم۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ ایمان اپنا مزعوم ایمان ہوگا نہ کہ وہ ایمان جو شرعاً مطلوب ہے، چنانچہ فلاسفہ اور مبتدعین بھی بزعمِ خویش ایمان رکھتے ہیں مگر اس طرح کہ انہوں نے اس کا نام تو باقی رکھا لیکن تفصیل وتشریح ایسی کی جس سے حقیقت مسخ ہو کر اس کی صورت تبدیل ہوگئی۔

فلاسفہ کا مذہب:۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے متعلق فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ موجود ہے لیکن اس کی کوئی ماہیت اور حقیقت نہیں ہے، وہ جُزئیات کا عالم نہیں ہے اور اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی صفت سمع وبصر اور تمام صفات کا انکار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آسمانی کتابوں کو وہ اللہ کا کلام نہیں مانتے کہ ان کے نزدیک نہ وہ کلام کرتا ہے اور نہ متکلم ہے، چنانچہ قرآنِ کریم ان لوگوں کے نزدیک ایک فیض ہے جو ایک پاکیزہ نفس انسان کے اوپر عقل فعّال سے فائض ہوا ہے اور وہ پاکیزہ نفس انسان دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں تین خصوصیات سے ممتاز ہے:

(۱) اس کے اندر قوتِ ادراک زیادہ قوی اور سریع ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں علم کا زیادہ بڑا حصہ حاصل کر پاتا ہے۔

(۲) اس کے اندر قوتِ نفس ہوتی ہے جس کے سبب وہ عالم کے ہیولیٰ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

(۳) وہ قوتِ تخیّل کا مالک ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ قوائے عقلیہ کو محسوس اشکال کا جامہ پہناتا ہے فلاسفہ اسی قوت کو "ملائکہ" (فرشتے) کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک فرشتے کوئی الگ مخلوق نہیں ہیں جو آسمان سے اُترتے اور رسول کے پاس وحی اِلٰہی اور پیغامِ ربانی لاتے ہوں بلکہ وہ محض امورِ ذہنیہ ہیں جن کا خارج میں کوئی وجود نہیں، اسی طرح یومِ آخرت کے متعلق بھی ان کے عقائد و مزعومات سراسر باطل ہیں، ان کے نزدیک یہ دنیا نہ تو ویران و برباد ہوگی، نہ آسمان پھٹیں گے، نہ چاند تارے اور سورج ماند ہوں گے اور نہ لوگ دوبارہ زندہ کر کے جنت یا دوزخ میں ڈالے جائیں گے، یہ سب امور قرآن و حدیث میں محض عوام کو سمجھانے اور راہ پر لگانے کے لئے آئے ہوئے ہیں، جن کا خارج میں نہ کوئی وجود ہے اور نہ کوئی حقیقت۔

معتزلہ کے اُصول خمسہ:۔

اسی طرح معتزلہ نے بھی ان ارکانِ ایمان اور ضروریات دین کے بجائے دوسرے پانچ اصول کا اختراع کیا جن پر اپنے دین و ایمان کی بنیاد رکھی، اور پھر ان اصول خمسہ کی اپنی اصطلاح کے مطابق تشریح کی، ان کے یہ اصول حسب ذیل ہیں: (۱) توحید (۲) عدل (۳) منزلۃ بین المنزلتین (۴) وعد و وعید (۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ چنانچہ "توحید" سے ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات کے ساتھ موصوف نہیں ہے اور اسی بناء پر وہ قرآن کے کلامُ اللہ ہونے کے منکر ہیں اور "عدل" سے یہ مُراد لیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت فساد اور شر کے ساتھ متعلق نہیں ہوتی اس بناء پر ان کو اس کا قائل ہونا پڑا کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق نہیں ہے، بندے اپنے افعال کے خالق خود ہیں۔ اور "منزلۃ بین المنزلتین" یہ ہے کہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب اور فسق ایمان کے منافی ہے لیکن کُفر بھی نہیں بلکہ یہ ایمان و کفر کے درمیان ایک درجہ ہے، چنانچہ ان کے نزدیک فاسق (مرتکب کبیرہ) ابدی

جہنمی ہوگا البتہ اس کے ساتھ یہ رعایت ہوگی کہ کافر کے مقابلہ میں اس کا عذاب کم ہوگا۔ اور "وعد وعید" یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے اور وعیدیں فرمائی ہیں وہ ضرور نافذ ہو کر رہیں گی چنانچہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ بلا توبہ کوئی گناہ معاف نہ فرمائیں گے۔ اور "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" یعنی اچھی باتوں کا حکم کرنا اور خلاف شرع سے روکنا مسلمانوں پر واجب ہے، جس کے لئے ہر ممکن مساعی سے دریغ نہ کرنا چاہئے اسی اصل کی بناء پر ان کے نزدیک ائمہ اگر ظلم کریں تو ان کے خلاف بغاوت جائز ہے۔

(ملخص از اسلامی مذاہب للشیخ محمد ابوزہرۃ)

شیعوں کے اصول اربعہ:۔

اسی طرح شیعوں نے اپنے مذہب کے چار اصول مقرر کئے: (۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت۔ عقیدۂ امامت کے پیش نظر فرقہ امامیہ کے نزدیک "امام" معصوم اور مفترض الطاعۃ ہوتا ہے، اس کو قانون سازی اور تشریع کا پورا اختیار ہوتا ہے، اس کی ہر بات شریعت کا درجہ رکھتی ہے۔ (ملخص از شرح العقیدۃ الطحاویہ واسلامی مذاہب)

اہل سنت کے نزدیک ارکانِ ایمان کی تفصیل:۔

صرف اہل سنت والجماعت وہ فرقہ ناجیہ ہے جو تمام ارکانِ ایمان پر اعتقاد رکھنے میں اس کی تشریح وتفصیل کا پابند ہے جو آنحضور ﷺ اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ توحید ورسالت کی بحث تو گذشتہ اوراق میں بالتفصیل گذر چکی۔ اب دوسرے ارکان کی تفصیل سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں: "ملائکہ" (فرشتے) اہل سنت والجماعت کے نزدیک نورانی مخلوق ہیں جن کی مختلف جماعتیں ہیں، نظام عالم فرشتوں ہی کے سپرد ہے، ان میں سے تین فرشتے تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔

(۱) جبرئیل علیہ السلام جن کے سپرد انبیاء علیہم السلام کے پاس وحی لانا تھا۔

(۲) میکائیل علیہ السلام جن کے سپرد بارش کا نظام ہے۔

(۳) اسرافیل علیہ السلام جن کے سپرد قیامت کے روز صور پھونکنا ہے۔

اسی طرح آسمان وزمین اور ساری کائنات کا نظام فرشتوں کی مختلف جماعتوں کے سپرد ہے جن کو وہ پوری مستعدی کے ساتھ حسب منشاء خداوندی سرانجام دیتے ہیں۔

ملائکہ افضل ہیں یا انبیاء وصلحاء:۔

اہل سنت کے نزدیک انبیاء اور صلحاء فرشتوں سے افضل ہیں، کذا فی شرح العقیدة الطحاویہ، اور اصول الدین للامام ابی منصور البغدادی المتوفی (سنہ ۴۲۹ھ) میں ہے کہ ہمارے جمہور اصحاب ملائکہ پر تفضیل انبیاء کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مومن ملائکہ سے افضل ہو لیکن انہوں نے معین طور پر کسی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ انتہی

اور شرح عقائد میں ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے اور رُسُل ملائکہ عام انسانوں یعنی اولیاء وصلحاء سے نہ کہ فُسّاق سے لانھم کالبھائم کذا فی النبراس اور عام انسان عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ انتہیٰ

اور اکثر معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں یہاں تک کہ جہنم کے داروغہ بھی ہر نبی سے افضل ہے، اور معتزلہ کے دوسرے فریق کے نزدیک جن ملائکہ سے معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا، وہ انبیاء سے افضل ہیں اور جن فرشتوں سے معمولی معصیت کا بھی ارتکاب ہوا ہے جیسے ہاروت وماروت تو انبیاء ان سے افضل ہیں۔ اور شیعہ امامیہ کے نزدیک ائمہ ملائکہ سے افضل ہیں۔ کذا فی اصول الدین للبغدادی۔

شرح العقیدة الطحاویہ کے مصنف فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے اس مسئلہ میں سکوت وتوقف اختیار فرمایا ہے اور حق بھی یہی ہے۔ ہمارے ذمہ تو صرف ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے کسی کی افضلیت کا اعتقاد واجب نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ (اعتقاد افضلیت) واجب ہوتا تو کتاب وسنت میں بصراحت بیان کر دیا گیا ہوتا کہ ارشاد

خداوندی ہے: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ '' اس لئے اس مسئلہ میں سکوت ہی بہتر ہے۔(ملخصاً انتہی ص ۳۳۸)

انبیاء ومرسلین پر ایمان:۔

ان انبیاء ومرسلین پر ایمان لانا علی التعیین ضروری ہے جن کا ذکر نام کے ساتھ قرآن کریم میں آیا ہے، ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اور بھی بہت سے نبی اور رسول مبعوث فرمائے جن کے ناموں اور تعداد کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، ان سب حضرات پر اجمالاً ایمان لانا ہمارے لئے ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِن قَبلِكَ مِنهُم مَن قَصَصنَا عَلَيكَ وَمِنهُم مَن لَم نَقصُص عَلَيكَ"۔(المومن:۷۸)

(اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے قصہ بیان نہیں کیا)۔

اسی طرح یہ ایمان رکھنا بھی ضروری ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے فریضہ رسالت پورے طور پر بلاکم وکاست ادا فرمایا اور تمام اوامر ونواہی اس طرح واضح طور پر بیان فرمائے کہ کسی کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''فَهَل عَلَى الرُّسُلِ اِلاَّ البلاغُ المُبِين'' (النحل:۳۵)(سو پیغمبروں کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے)۔

انبیائے اولوالعزم پانچ ہیں:۔

اولوالعزم پیغمبروں کی بابت سب سے بہتر قول وہ ہے جو بغوی نے ابن عباسؓ اور قتادہؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ پانچ حضرات ہیں:(۱) حضرت نوح (۲) حضرت ابراہیم (۳) حضرت موسیٰ (۴) حضرت عیسیٰ) اور (۵) خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ چنانچہ آیت

ذیل میں ان ہی حضرات کا ذکر ہے:

"وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَ

إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ"۔(الاحزاب:۷)

(اور جبکہ ہم نے تمام پیغمبروں سے ان کا اقرار لیا اور آپ سے بھی اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی۔)

(شرح العقیدۃ الطحاویہ)

آسمانی کتابوں پر ایمان:۔

اللہ تعالی نے جن کتابوں کا نام ذکر فرمایا ہے یعنی توریت، انجیل اور زبور ان پر ہم علی التعیین ایمان لاتے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے انبیاء کرامؑ پر اور بھی کتابیں نازل فرمائی ہیں جن کے نام اور تعداد کا علم اللہ تعالی ہی کو ہے اور قرآن کریم پر ہمارے ایمان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے آسمانی کتاب ہونے کا اقرار کرنے کے ساتھ اس کے اوامر و نواہی کے اتباع کے بھی پابند ہیں۔ پس تمام آسمانی کتابیں حق ہیں اور قرآن کریم حق ہونے کے ساتھ ساتھ واجب الاطاعت بھی ہے۔

قوله: "ونسمي اهل قبلتنا مسلمين مؤمنين ما داموا بما جاء به النبي ﷺ معترفين وله بكل ما قاله واخبر مصدقين"۔

ترجمہ: اور ہم اہلِ قبلہ کو مسلمان اور مومن کہتے ہیں، جب تک وہ ان تمام باتوں کا اقرار کریں جو نبی اکرم ﷺ لائے ہیں اور آپ کے ہر قول وخبر کی تصدیق کریں۔

تشریح: سب اہلِ قبلہ مسلمان ہیں:۔

دلیل اس کی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

"من صلی صلاتنا واستقبل قبلتنا وَاکل ذبیحتنا فهو المسلم له مالنا وعلیه ما علینا"۔

(جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلمان ہے اس کے وہ حقوق ہیں جو ہمارے ہیں اور اس کے ذمہ وہ حقوق ہیں جو ہمارے ذمہ ہیں۔)

مصنف کی مراد یہ ہے کہ مسلمان ارتکابِ معصیت سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا جب تک کہ معصیت کو جائز نہ سمجھے، چنانچہ حدیث مذکور میں "اھل قبلتنا" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے مسلمان ہونے کے مدّعی ہوں اور کعبہ کی طرف منہ کرتے ہوں گو وہ اہل ہوا اور اہل معاصی ہوں بشرطیکہ ضروریات دین میں سے کسی امر کے منکر اور مکذب نہ ہوں۔

قوله:"ولا نخوض فی الله ولا نُمَاری فی دین الله"۔

ترجمہ: اور ہم اللہ تعالی کی ذات میں غور وخوض اور بحث ومباحثہ نہیں کرتے اور اللہ کے دین کے متعلق اہل حق سے جھگڑا نہیں کرتے۔

تشریح:۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی کنہ ذات کے متعلق بحث وکلام نہ کرنا چاہئے، امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالی کی ذات کے متعلق کلام کرے بلکہ اس کے ان اوصاف کا اقرار کرنا چاہئے جن کو اس نے اپنے لئے بیان کیا ہے۔ اور حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ:"الانبساط بالقول مع الحق ترك الادب" یعنی حق تعالی کے بارے میں بے تکلفی کے ساتھ اور بلا لحاظ بات کرنا بے ادبی ہے۔

قوله:"ولا نجادل فی القرآن و نشهد انه کلام رب العالمین نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الاَمِینُ فعلّمه سید المرسلین محمداً ﷺ و هو کلام الله تعالی لایساویه شیءمن کلام المخلوقین ولا نقول بخلقه ولا نخالف جماعة المسلمین"۔

ترجمہ: اور ہم قرآن کی بابت نہیں جھگڑتے اور گواہی دیتے ہیں کہ وہ رب العالمین کا کلام ہے اس کو جبرئیلؑ لے کر نازل ہوئے پس اس کو رسولوں کے سردار محمد ﷺ کو سکھلایا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مخلوقات کا کوئی کلام اس کے برابر نہیں ہو سکتا اور ہم اس کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں ہیں اور ہم مسلمانوں کی جماعت کے مخالف نہیں ہیں۔

تشریح: ۔"لانجادل فی القرآن" میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ کہ ہم اہلِ زیغ وضلال کی طرح قرآن میں بحث وکلام اور اختلاف نہیں کرتے بلکہ ہم اس کو رب العالمین کا کلام مانتے ہیں الخ۔

(۲) یہ کہ ہم قرآن کی ان قراءات میں نہیں جھگڑتے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں بلکہ ہر قراءت ثابتہ کے ساتھ اس کو پڑھتے ہیں جن میں سات قراءتیں بطریق تواتر ثابت ہیں، یہ دونوں احتمالات مراد لینا درست ہے۔"الرّوح الامین" سے مراد جبرائیلؑ ہیں کما فسرہ المفسرون، ان کا نام "روح" اس لئے ہے کہ یہ حاملِ وحی ہیں اور وحی سے قلوب کی حیات وابستہ ہے اور "امین" اس لئے کہ انہوں نے انبیاء تک وحی پہنچانے میں حق امانت ادا کر دیا۔

"فعلمه سيد المرسلين" فرقہ قرامطہ کا رد کیا ہے جن کا خیال یہ تھا کہ حضور ﷺ نے بطورِ الہام قرآن کا تصور کر لیا تھا۔"لانخالف جماعة المسلمين" یعنی ہم مسلمانوں کے متفقہ مسائل میں ان سے اختلاف نہیں کرتے کیونکہ جماعت مسلمین کی مخالفت زیغ وضلال اور بدعت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

قوله: "و لا نُكفِرُ احداً من اهل القبلة بذنب ما لم يستحله ولانقول لايضر مع الايمان ذنب لمن عمله".

ترجمہ: اور ہم اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے جب تک کہ وہ گناہ کو حلال نہ سمجھے اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایمان کے ساتھ

گناہ اس کو ضرر نہیں پہنچا تا جو اس کا ارتکاب کرے۔

تشریح: مسئلہ تکفیر اہلِ قبلہ:۔

مصنف کا مقصود خوارج کا رد ہے جو گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے ہیں، اس مسئلہ تکفیر میں قدیماً وحدیثاً بڑا اختلاف رہا، لوگ حد اعتدال پر قائم نہ رہے اور افراط وتفریط کا شکار ہو گئے لیکن اس وقت کی صورت حال اور زیادہ افسوس ناک ہے کہ باوجود اہل سنت کی جماعت سے وابستگی کے مدعی ہونے کے بھی بعض جماعتیں اعتدال پر قائم نہ رہیں اور مسلمانوں بلکہ اکابر علمائے مسلمین کی تکفیر میں انہوں نے اس بے باکی، دیدہ دریلی اور بے حیائی سے کام لیا کہ خود بے حیائی کو بھی حیا آ گئی اور اس کے برخلاف بعض افراد نے اس میں اس قدر تفریط سے کام لیا کہ انہوں نے صرف ''ووٹر لسٹ'' میں مسلمان نام ہونے کو مسلمان ہونے کے لئے کافی سمجھا خواہ وہ کتنی ہی ضروریاتِ دین کا انکار کیوں نہ کرے لیکن ان کے نزدیک اس سے اس کے اسلام میں کوئی فرق نہ آئے گا فنعوذ باللہ من هذا الافراط والتفريط، اس لئے ضروری ہے کہ ''اہل قبلہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے، پس معلوم ہونا چاہئے کہ اہلِ قبلہ سے مُراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اوپر ''ونسمی اهل قبلتنا مسلمين الخ'' سے کیا ہے۔

صاحبِ ''نبراس'' کی عبارت اہل قبلہ کی تعریف میں بہت واضح اور جامع ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "ومن قواعد اهل السنة ان لايكفر مجهول من التكفير وهو النسبة الى الكفر احد من اهل القبلة معناهُ اللغوى من يصلى الى الكعبة اويعتقد هاقبلةً وفى الاصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين اى الامور التى علم ثبوتها فى الشرع واشتهر فمن انكر شيئاً من الضروريات كحدوث العالم وحشر الاجساد وعلم الله

13

سبحانه بالجزئیات وفرضیة الصلوٰة والصوم لم یکن من اهل القبلة ولوکان مجاهداً فی الطاعات و کذالك من باشر شیئاً من امارات التکذیب کسجود الصنم والاهانة بامرشرعی والاستهزاء علیه فلیس من اهل القبلةومعنی عدم تکفیرا هل القبلةان لایکفر بارتکاب المعاصی ولا بانکار الامور الخفیة غیرالمشهورة هذا ما حققه المحققون فاحفظه"۔

(نبراس:ص:۳۴۱،۳۴۲)

(اہل سنت کا اصول ہے کہ اہلِ قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کی جائے گی اس کے لغوی معنی ہیں جو شخص کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتا ہو یا کعبہ کو قبلہ باور کرتا ہو اور متکلمین کی اصطلاح میں وہ شخص جو ضروریات دین کی یعنی ان امور کی تصدیق کرتا ہو جن کا ثبوت شریعت میں معلوم اور مشہور ہو، پس جو شخص ضروریات دین میں سے کسی چیز کا مثلاً حدوثِ عالم، حشرِ اجسام، اللہ تعالیٰ کے علمِ جزئیات اور روزہ کی فرضیت کا انکار کرے تو وہ اہلِ قبلہ میں سے نہ ہوگا، اگرچہ طاعات کی بجا آوری میں خوب کوشش کرتا ہو اور اسی طرح جو شخص تکذیب کی نشانیوں میں سے کسی نشانی کا ارتکاب کرے مثلاً بُت کا سجدہ یا کسی امرِ شرعی کی اہانت کرے اور اس کا مذاق اُڑائے تو وہ بھی اہل قبلہ میں سے نہ ہوگا اور اہل قبلہ کی عدم تکفیر کا مطلب یہ ہے کہ معاصی کے ارتکاب اور امور خفیہ غیر مشہورہ کے انکار کی وجہ سے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔

الفاظ کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ اسی مفہوم ومراد کی عبارتیں تقریباً تمام علمائے اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہیں جو بخوف طوالت درج نہیں کی گئیں جب "اہل

قبلہ" کے معنی مراد کی تعیین ہوگئی تو اب معلوم ہونا چاہئے کہ اہل سنت جو اہل قبلہ کے عدم تکفیر کے قائل ہیں تو یہ اسی وقت ہے کہ جب اس پر اہل قبلہ کی تعریف پورے طور پر صادق آتی ہو اور اس میں بھی یعنی حد کے محدود پر انطباق میں غایت احتیاط سے کام لیا جائے گا چنانچہ ملا علی قاری المتوفی (۱۰۱۴ھ) "شرح فقہ اکبر" میں فرماتے ہیں:

"وان المراد بعدم تکفیر احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لایکفر مالم یوجد شیء من امارات الکفر وعلاماته ولم یصدر عنه شیء من موجباته"۔

(اہل قبلہ میں سے کسی کے عدم تکفیر سے مراد اہل سنت کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک اس میں کفر کی کوئی نشانی اور علامت نہ پائی جائے اور موجباتِ کفر میں سے کوئی چیز اس سے صادر نہ ہو اس وقت تک وہ کافر قرار نہیں دیا جائے گا)۔(شرح فقہ اکبر: ص:۱۸۹ مجتبائی دہلی)

اسی سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ اہل سنت کے نزدیک گناہ کا مرتکب کافر نہیں ہوتا البتہ اگر وہ گناہ کو حلال اور مباح سمجھے تو اس فسادِ عقیدہ کی بناء پر کافر ہو جائے گا اور خوارج کے نزدیک ہر گناہ کا مرتکب یا صرف گناہِ کبیرہ کا مرتکب علی اختلاف القول کافر ہو جاتا ہے اور معتزلہ کے نزدیک مرتکب گناہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا جس کے نتیجہ میں ایسا شخص خلود فی النار کا مستحق ہوگا لیکن بہ نسبت کافر کے اس کے عذاب میں تخفیف ہوگی اسی کا نام ان کے یہاں "منزلۃ من المنزلتین" ہے اور مرجئہ کے نزدیک ایمان کے ساتھ کوئی گناہ مضر نہیں ہے یعنی مومن کوئی بھی گناہ کرے اس سے اس کے ایمان پر کوئی اثر نہ پڑے گا یہ فرقہ خوارج کے بالکل برعکس ہے کہ ان کے نزدیک تو ارتکاب گناہ سے دائرۂ اسلام سے خارج اور ان کے نزدیک کتنا ہی گناہ کر ڈالے لیکن اس کا کچھ اثر ہی نہیں، فشتان ما بینهما۔

پس مصنفؒ نے "لانقول لایضر مع الایمان ذنب لمن عمله" سے مرجئہ

کے اسی عقیدۂ فاسدہ کا رد کیا ہے، کیونکہ اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق مرتکب کبیرہ نہ تو کافر ہوجاتا ہے کہ ملتِ اسلام سے خارج ہوجائے کما قالت الخوارج، ورنہ زنا، سرقہ اور مے نوشی وغیرہ ذنوب وجرائم کے مرتکب کے لئے حدود مقرر نہ کی جاتیں بلکہ مرتد ہونے کی بناء پر انہیں قتل کردیا جاتا، اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ ملتِ اسلام سے خارج تو ہوجائے لیکن کفر میں داخل نہ ہو اور خلود فی النار کا مستحق ہو کما قالت المعتزلہ کیونکہ یہ بھی نصوص صریحہ کے خلاف ہے اس لئے کہ حدود اور سزائیں مومنین مرتکبینِ کبائر ہی کے لئے مقرر ہوئی ہیں اور ارتکاب کبیرہ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں ''مومن'' قرار دیا ہے، فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى"۔

(البقرۃ:۱۷۸)

(اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (بقتل عمد) کے بارے میں)۔

اور اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایمان لانے کے بعد کسی بھی گناہ کے ارتکاب سے کوئی ضرر ہی نہ لاحق ہو کما قالت المرجئہ ورنہ یہ حدود واحکام کیوں نازل ہوتے اور بے شمار احادیث ونصوص میں ترک فرائض اور ارتکابِ محرمات پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کا جواز رہ جاتا ہے، بلکہ صحیح وہ جادۂ اعتدال ہے جو حضرات اہلِ سنت کا تمغۂ امتیاز ہے کہ ایسا شخص نہ تو ملتِ اسلام سے خارج ہوگا اور نہ دائرہ کفر میں داخل ہوگا بلکہ مومن خطا کار ہوگا اور قواعد شرعیہ کے موافق توبہ کرلینے سے اس کی وہ خطائیں بھی معاف ہوجائیں گی بلکہ اگر حق تعالیٰ چاہیں گے تو یوں بھی معاف فرمادیں گے، ارشاد ہے: ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ'' (ھود:۱۱۵) (بے شک نیک کام مٹادیتے ہیں بُرے کاموں کو) اور ''التائب من الذنب کمن لاذنب لہ''۔ (گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس نے گناہ ہی نہ کیا ہو۔)

اہل بدعت اور اہل علم کا امتیازی وصف:۔

"عقیدۂ طحاویہ" کے شارح نے بہت خوب تحریر فرمایا ہے کہ:

"فمن عیوب اهل البدع تکفیر بعضهم بعضا ومن ممادح اهل العلم انهم یخطئون ولا یکفرون".

(شرح العقیدة الطحاویه :ص:۳۵۹)

یعنی یہ اہل بدعت کا عیب ہے کہ وہ ایک دوسرے کو کافر کہا کرتے ہیں اور یہی اہل علم کی منقبت ہے کہ وہ حضرات خاطی قرار دیتے ہیں کافر نہیں کہتے۔

قوله:"ونرجو للمحسنین ان یعفوَ عنهم ویدخلهم الجنة برحمته ولانأمن علیهم ولانشهد لهم بالجنة ونستغفر لمسیئهم ونخاف علیهم ولانقنُطهم".

ترجمہ: اور نیکوکار مومن بندوں کے لئے ہم اُمید کرتے ہیں کہ اللہ تعالی انہیں معاف فرمائے گا اور ہم ان کے بارے میں مطمئن نہیں ہیں اور نہ ان کے لئے جنت کی شہادت دیتے ہیں اور ہم گنہگار مومنین کے لئے مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے لیے خطرہ بھی محسوس کرتے ہیں اور ہم ان کو نا اُمید نہیں کرتے۔

تشریح: ہر مومن پر رجاء لازم ہے:۔

یہاں جو مضمون رجاء مصنفؒ نے بیان فرمایا ہے ہر مومن پر لازم ہے کہ خود اپنے متعلق اور دوسرے مسلمانوں کے متعلق اس کا اعتقاد رکھے، چنانچہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

"أُولٰئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُم

أَقرَبُ وَيَرجُونَ رَحمَتَه وَيَخَافُونَ عَذَابَه اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحذُوراً". (بنی اسرائیل:۵۷)

(یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈھ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے قابل)۔

دوسری جگہ اہل خوف کی مدح کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اِنَّ الذینَ هُم مِن خَشيَةِ رَبِّهِم مُشفِقُونَ والذین هُم بِاٰيَاتِ رَبِّهِم يؤمِنُونَ والذين هُم بِرَبِّهِم لَايُشرِكُونَ والذين يؤتُونَ مآ اٰتَوا وَّقُلُوبُهُم وَجِلَةٌ اَنَّهُم اِلىٰ رَبِّهِم راجِعُونَ اُولٰئِكَ يُسارِعُونَ فِى الخَيراتِ وَهُم لَهَا سَابِقُونَ"۔

(المومنون:۵۷تا۶۱)

(اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کرتے اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (باوجود دینے کے) ان کے دل اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جانے والے ہیں، یہ لوگ اپنے فائدے جلدی جلدی حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان کی طرف دوڑ رہے ہیں)۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ''الذينَ يؤتُونَ مآاٰتوا وَّقُلُوبُهم وَجِلَةٌ'' (سے مراد کیا) وہ شخص ہے جو زنا کرتا ہو، شراب پیتا ہو اور چوری کرتا ہو؟ آپ نے فرمایا نہیں اے صدیق کی صاحبزادی! لیکن (اس سے مراد وہ) شخص ہے جو روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، صدقہ کرتا ہو اور (ساتھ ہی) اس

کو یہ خوف بھی لگا ہو کہ یہ قبول نہ کیا جائے گا۔ (مسند احمد و ترمذی بحوالہ شرح العقیدۃ)

پس ان آیات واحادیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے رجاء اور اُمید رکھنا مومن کے لئے لازم اور ضروری ہے وہیں یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس کے ساتھ اسباب رجاء وامید یعنی طاعات وامتثال احکام کا ہونا بھی ضروری ہے اور بدون اعمال صالحہ کے اُمید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنے کھیت میں تخم ریزی اور آب پاشی تو نہ کرے لیکن فصل کی کٹائی کے زمانہ میں پیداوار کا اُمیدوار ہو۔ چنانچہ علماء نے لکھا ہے رجاء کے لئے چند امور لازم ہیں بغیر ان کے رجاء کا تحقق نہیں ہوگا۔

وہ امور جو رجاء کے لئے لازم ہیں:۔

(۱) جس چیز کی رجاء اور اُمید کرتا ہو اُس سے محبت ہو۔ (۲) اس چیز کے فوت ہوجانے کا خوف اور کھٹکا لگا رہے۔ (۳) اپنی طاقت بھر اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ پس اگر اُمید اور رجاء ہی ہے اور اس کے یہ تینوں لوازم نہیں ہیں تو در حقیقت یہ رجاء اور اُمید ہی نہیں ہیں بلکہ اس کا نام "آرزو" ہے جس کو عربی میں "اُمنیہ" کہتے ہیں جس کی جمع "امانی" ہے اور نری آرزو سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اُمید اور خوف دونوں میں تلازم ہے، جب اُمید پائی جائے گی تو خوف بھی ضرور پایا جائے گا، راہ رَو کو جب منزل تک پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے اور ساتھ ہی خطرات کا خوف بھی تو وہ منزل کی طرف تیز گامی سے رواں دواں ہوتا ہے کہ مبادا شاید مقصود تک پہنچنے میں کوئی رُکاوٹ نہ پیش آجائے۔

سزائے جہنم سے خلاصی کے گیارہ اسباب:۔

مضمونِ خوف ورجاء کی مناسبت سے یہ ذکر کر دینا بھی بہت مفید بلکہ ضروری ہے کہ کبھی مرتکب کبیرہ اپنی بعض قلبی کیفیات یعنی ارتکابِ گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے حیاء، خوف، اپنے سراپا قصوروار ہونے کے احساس اور پھر مجسم عجز و نیاز ہوجانے کی وجہ سے

آبشار رحمتِ الٰہی سے ایسا فیض یاب ہوجاتا ہے کہ مرتکبِ صغیرہ کو اس درجہ کی عفو و مغفرت نہیں ہو پاتی بلکہ بسا اوقات ایسے شخص کو بتوفیقِ الٰہی بہت بلند درجات تک رسائی حاصل ہوجاتی ہے، چنانچہ علماء نے لکھا ہے کہ کتاب وسنت کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً گیارہ چیزیں ایسی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف فرمادیتے اور جہنم سے نجات عطا فرمادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے اجتناب کی اور آتشِ دوزخ سے خلاصی کے ان اسباب کے اختیار کرنے کی توفیق محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائیں۔وہ گیارہ اسباب یہ ہیں:

(۱) توبہ: ارشاد ہے: "اِلَّا الَّذِینَ تَابُوا" (مگر جن لوگوں نے توبہ کی) اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی آیات واحادیث ہیں جن میں توبہ کا مضمون ہے۔

(۲) استغفار: قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

"وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ"۔ (الانفال:۳۳)

(اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔)

توبہ اور استغفار کا فرق:۔

تنبیہ:۔ توبہ استغفار کو متضمن ہے اور استغفار توبہ کو، پس جب صرف استغفار کا لفظ استعمال ہو تو وہ توبہ کے مفہوم کو بھی شامل ہوگا اسی طرح جب تنہا توبہ کا لفظ بولا جائے تو وہ استغفار کے معنی کو بھی شامل ہوگا، اور جب دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوں تو استغفار کے معنی ہوں گے گذشتہ گناہوں کے شر سے حفاظت طلب کرنا اور توبہ کے معنی ہوں گے رجوع کرنا اور آئندہ زمانہ میں بُرے اعمال کے شر سے حفاظت طلب کرنا۔

(۳) حسنات: (نیکیاں) کیونکہ ایک نیکی کا ثواب دس گُنا ہوتا ہے اور گُناہ کی سزا اس کے برابر ہی ہوتی ہے، ارشاد ہے: "اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ" (ھود:۱۱۴) (بے شک نیک کام مٹادیتے ہیں بُرے کاموں کو) اور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"واتبع السّیئۃ الحَسَنَۃَ تَمحُھا" (بُرائی کے بعد نیکی کرو، وہ (نیکی) اس (بُرائی) کو مٹادے گی۔)

(۴) دُنیوی مصائب: نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"مایصیب المؤمن من وصب ولانصب ولاغم ولاھم ولاحزن حتی الشوکۃ یشاکھاالاکُفّربھامن خطایاہ"۔

(بخاری ومسلم)

(مومن کو کوئی تھکن، بیماری، غم، فکر اور حزن نہیں پہنچتا یہاں تک کہ کانٹا بھی نہیں چُبھتا مگر اس کی وجہ سے اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں)۔

مصائب بذاتِ خود گناہوں کا کفارہ ہیں کیونکہ مصیبت اللہ کا فعل ہے، بندہ کا فعل نہیں اور مصائب اللہ تعالی بندہ کے گناہ کے سبب نازل فرماتے ہیں اور اس کے گناہوں کا کفارہ بنادیتے ہیں اور کبھی رفع درجات کے لئے مبتلائے مصیبت فرماتے ہیں۔اب اگر بندہ اس مصیبت پر صبر کرے گا تو اس صبر کرنے کا ثواب مزید ملے گا اور اگر بے صبری کرے گا اور اظہار ناراضگی کرے گا تو گنہگار ہوگا کیونکہ یہ صبر اور بے صبری خود بندہ کا فعل ہے۔

(۵) عذابِ قبر: اس کی تفصیل اِن شاءاللہ آئندہ صفحات میں آئے گی۔

(۶) زندگی ہی میں یا موت کے بعد مومنین کا اس کے لئے دُعا اور مغفرت طلب کرنا۔

(۷) مرنے کے بعد دوسرے لوگ جو کچھ صدقہ، خیرات اور تلاوت وحج وغیرہ کے ثواب کا ہدیہ بھیج دیں۔

(۸) روزِ قیامت کے اہوال اور سختیاں۔

(۹) بخاری اور مسلم کی حدیث میں مروی ہے کہ مومنین جب پُل صراط پار کریں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پُل پر کھڑے کردیئے جائیں گے، پھر ایک کا

دوسرے سے بدلہ لیا جائے گا، پس جب وہ صاف ستھرے کردیئے جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔

(۱۰) شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کما مر سابقاً فی ذکر الشفاعۃ۔

(۱۱) بغیر شفاعت کے اللہ تعالیٰ کا معاف فرمادینا: چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَيَغْفِرُ مَادُونَ ذَالِكَ لِمَن يَشَآءُ'' (النساء:۴۸) (اور اس (شرک) کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے)۔

اب اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت نہ چاہی تو پھر جہنم کی بھٹی میں ضرور جانا پڑے گا تاکہ اس کے ایمان کا حسن معاصی کی بدنمائیوں سے نکھر جائے، پھر آخر میں جہنم کے اندر کوئی بھی ایسا شخص نہ رہے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا بلکہ جس نے ''لا الہ الا اللہ'' بھی کہا ہوگا، تفصیل مذکور سے معلوم ہوا کہ کسی کے لئے قطعی طور پر جنتی ہونے کی شہادت دینا ممنوع ہے، سوائے ان حضرات کے لئے جن کے جنتی ہونے کی شہادت اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے۔ (ملخص از شرح العقیدۃ الطحاویہ)

قوله: "والامن والاياس ينقلان عن ملة الاسلام وسبيل الحق بينهما لاهل القبلة"۔

ترجمہ: اور اللہ کے عذاب سے بے خوف ہونا اور اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا ملتِ اسلام سے دور ہٹا دیتے ہیں اور اہل قبلہ کے لئے راہِ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے۔

تشریح: خوف ورجاء:۔

بندہ پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا بھی لازم ہے اور اس سے اُمیدوار کرم ورحمت رہنا بھی لازم ہے، لیکن خوف وڈر وہی شرعاً محمود ومطلوب ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے ارتکاب سے روک دے، اور جب خوف اس حد سے آگے بڑھ جائے تو یاس وقنوط اور ناامیدی پیدا ہوجاتی ہے جو ممنوع اور مہلک ہے، اسی طرح رجاء اور اُمید وہی محمود اور

مطلوب ہے کہ بندہ اطاعت اور فرماں برداری بجالائے اور بارگاہِ الٰہی سے ثواب کی اُمید رکھے، یا گناہ سرزد ہوجائے تو توبہ کرے اور مغفرت کا اُمیدوار رہے اور اس کے برعکس جب آدمی عصیان ونافرمانی ہی میں بڑھتا چلا جاتا ہو اور اعمالِ صالحہ سے خالی ہو اور پھر رحمتِ الٰہی کا اُمیدوار رہے تو یہ رجاء کاذب، آرزوئے باطل اور فریب نفس ہے۔ حضرت ابوعلی رودباریؒ فرماتے ہیں کہ "خوف اور رجاء یہ دونوں پرندہ کے دو پَر کی طرح ہیں۔ جب دونوں پَر درست اور برابر ہوں گے تو اس کی پرواز مکمل اور اچھی ہوگی اور اگر ایک پَر میں کمی اور کمزوری ہوگی تو پرواز میں بھی کمزوری ہوگی اور جب دونوں پر ضائع ہوجائیں گے تو پرندہ موت کی حد میں داخل ہوجائے گا" انتہیٰ جو لوگ خوف ورجاء دونوں صفات کے ساتھ متصف ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوا رَحْمَةَ رَبِّهٖ"۔(الزمر:۹)

(بھلا جو شخص اوقاتِ شب میں سجدہ وقیام کی حالت میں عبادت کررہا ہو آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے پروردگار کی رحمت کی اُمید کررہا ہو)۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو وفات سے تین دن پہلے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "لَا يَمُوتَنَّ اَحَدُكُمْ الا وهو يحسن الظن بربه" (بخاری ومسلم) (تم میں سے کوئی نہ مرے مگر اس حال میں کہ اپنے رب کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو) اسی لئے بعض حضرات کا قول ہے کہ صحت اور تندرستی کی حالت میں خوف غالب ہونا چاہئے اور مرض وبیماری کی حالت میں رجاء اور اُمید۔

قوله: "ولا يخرج العبد من الايمان الا بجحود ما ادخله فيه"۔

ترجمہ: اور بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر ان ہی چیزوں کے انکار کرنے سے جس (کے اقرار) نے اس کو اس میں داخل کیا ہے۔

تشریح:۔اس سے بھی مصنف رحمہ کا مقصود خوارج اور معتزلہ کا رد کرنا ہے کہ ارتکابِ کبیرہ کی وجہ سے کوئی دائرۂ ایمان سے خارج نہیں ہوتا، وقدمر تفصیله سابقاً۔

قوله:"والایمان هوالاقرار باللسان والتصدیق بالجنان وان جمیع ماصح عن رسول الله ﷺ من الشرع والبیان کله حق والایمان واحد واهله فی اصله سواء والتفاضل بینهم بالخشیة والتقویٰ ومخالفة الهویٰ وملازمة الاولیٰ"۔

ترجمہ: اور ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا ہے اور یہ کہ تمام وہ احکام وتوضیحات جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں سب کی سب حق ہیں، اور ایمان ایک ہے اور اہلِ ایمان اصل ایمان میں برابر ہیں، اور ان کے درمیان باہم ایک دوسرے پر فضلیت خشیت وتقویٰ اور خواہش نفس کی مخالفت اور اَولیٰ وافضل پر عمل و پابندی سے ہے۔

تشریح: ایمان کی تعریف میں علماء کے اقوال:۔

یہاں مصنف ؒ نے ایمان کی تعریف بیان فرمائی ہے۔اس مسئلہ میں علماء کے اقوال بہت مختلف ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) ایمان تصدیق کا نام ہے، یہ امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدیؒ وغیرہ کا مذہب ہے، ان حضرات کے نزدیک اقرار باللسان اجراء احکام کے لئے شرط ہے جزء ایمان نہیں ہے۔

(۲) ایمان تصدیق بالجنان اور اقرار باللسان کا نام ہے، یہ امام اعظم ابوحنیفہؒ اور مصنفِ کتاب امام طحاویؒ اور جمہور فقہاء کا مذہب ہے۔

(۳) ایمان تصدیق، اقرار اور عمل تینوں کے مجموعہ کا نام ہے، اور عمل سے مراد یہ ہے کہ تمام مامورات پر عمل کیا جائے حتیٰ کہ مندوبات اور مستحبات پر بھی عمل ہو اور تمام ممنوعات کو ترک کیا جائے ان لوگوں کے نزدیک کسی امر مندوب کا ترک اور گناہِ صغیرہ کا

ارتکاب بھی کفر ہے، یہ مذہب خوارج کی طرف منسوب ہے۔

(۴) ایمان، تصدیق واقرار اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے لیکن ترکِ عمل مندوب سے بھی ایمان سے خارج ہوجائے گا لیکن کفر میں داخل نہ ہوگا، یہ قاضی عبدالجبار معتزلی اور ابوالہذیل کا مذہب ہے۔

(۵) ایمان مذکورہ امورِ ثلاثہ کا مجموعہ ہے۔ ترکِ واجب اور ارتکابِ حرام سے ایمان سے خارج ہوگا اور کفر میں داخل نہ ہوگا، یہ ابوعلی الجبائی اور اس کے بیٹے ابوہاشم کا مذہب ہے۔

(۶) ایمان تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے لیکن ترک طاعت سے ایمان سے خارج نہ ہوگا، یہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ، محدثین اکثر سلف اور متکلمین کی ایک جماعت کا مذہب ہے۔

(۷) ایمان معرفت بالقلب کا نام ہے، یہ جہم بن صفوان کا مذہب ہے۔ معرفت کا درجہ تصدیق سے بہت کم ہے کیونکہ معرفت ہوتے ہوئے بھی انکار وعناد ہوسکتا ہے۔

(۸) ایمان صرف اقرار باللسان کا نام ہے، یہ کرامیہ کا مذہب ہے۔ ان کے نزدیک منافقین بوجہ اقرار کے کامل الایمان ہیں لیکن مستحق وعید ہیں۔

(۹) اقرار بشرط معرفت کا نام ہے یعنی معرفت ایمان کا رکن نہیں ہوگی جس طرح وضو نماز کے لئے شرط ہے لیکن اس کا رکن نہیں، یہ رقاشی کا مذہب ہے۔

(۱۰) اقرار کا نام ہے ایسی تصدیق کی شرط کے ساتھ جو اختیار کسب سے حاصل ہوئی ہو۔ یہ قطان اشعری کا مذہب ہے۔ (از نبراس: ص: ۲۵۳ وشرح العقیدہ: ص: ۳۷۳)

خلاصہ ان تمام مذاہب کا یہ ہے کہ ایمان یا تو قلب وزبان اور جوارح کے ساتھ قائم ہے، یہ ائمہ ثلاثہؒ اور جمہور سلفؒ کا مذہب ہے، اور یا صرف قلب اور زبان کے ساتھ قائم ہے، یہ امام ابوحنیفہؒ ان کے اصحاب اور مصنفؒ کا مذہب ہے، اور یا صرف زبان کے ساتھ قائم ہے، یہ کرامیہ کا مذہب ہے اور یا صرف قلب کے ساتھ قائم ہے تو پھر یا تو معرفت

کا نام ہے یہ جہم کا مذہب ہے اور یا تصدیق کا نام ہے، یہ امام ابومنصور ماتریدیؒ کا مذہب ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ائمہ ثلاثہ کا اختلاف نزاع لفظی ہے:۔

امام ابوحنیفہؒ اور ائمہ ثلاثہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ محض لفظی اختلاف ہے، کیونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گو عمل بالارکان ایمان کی تعریف میں داخل ہے لیکن ان کے نزدیک بھی مرتکب کبیرہ اور تارکِ واجبات ایمان سے خارج نہیں ہوتا بلکہ فاسق ہوتا ہے، اور احنافؒ کے نزدیک عمل بالارکان گو ایمان کے اجزاء میں داخل نہیں لیکن تارکِ واجبات اور مرتکبِ کبیرہ ان کے نزدیک بھی فاسق ہے پس جبکہ مآل دونوں اقوال کا ایک ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اختلاف لفظی ہے۔

اب رہا یہ کہ ائمہ ثلاثہ میں سے بعض کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کافر ہوجاتا ہے تو ان کے نزدیک یہ کُفر دوسرے دلائل اور نصوص کی وجہ سے لازم آتا ہے۔

الایمان لایزید ولاینقص:۔

پھر اس اختلاف کے نتیجہ میں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں یا نہیں ایک دوسرا اختلاف رونما ہوا کہ ایمان بڑھتا اور گھٹتا ہے یا نہیں؟

پس جو حضرات یعنی ائمہ ثلاثہ اور اکثر سلفؒ اس کے قائل ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں ان کے نزدیک لازمی طور پر ایمان زیادت ونقصان کے ساتھ متصف ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ حضرات ذیل کی آیات اور اسی طرح کی دوسری آیات ونصوص بھی اپنے استدلال میں پیش کرتے ہیں، قال اللہ تعالیٰ: "وَاِذَاتُلِیَت عَلَیھِم اٰیٰتُہ زَادَتھُم اِیمَاناً" (الانفال:۲) (اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو زیادہ کردیتی ہیں) نیز فرمایا: "وَیَزدَادَالَّذِینَ اٰمَنُوا اِیمَاناً" (المدثر:۳۱) (اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے) ان حضرات کی طرف سے بروایت حضرت

معاذ بن جبلؓ ایک حدیث بھی روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الایمان یزید وینقص" رواہ الجوزقانی، لیکن امام مجد الدین اللغوی صاحب القاموس نے فرمایا کہ "لم یصح فی رفعه حدیث" (اس باب میں کوئی مرفوع حدیث بطریق صحیح ثابت نہیں ہے) اور جو حضرات یعنی امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب واتباع اعمال کو ایمان کا جزء نہیں مانتے ان کے نزدیک ایمان زیادت ونقصان کے ساتھ متصف نہیں ہوتا کیونکہ ایمان تصدیق یقینی کا نام ہے اور اس کے افراد میں زیادت ونقصان کے ساتھ تفاوت نہیں ہے۔ نیز قرآن حکیم کی آیات میں عمل کا ایمان پر عطف کیا ہے چنانچہ "الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات" آیا ہے اور عطف مغایرت کو مقتضی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل ایک دوسرے کے مغائر ہیں۔ اور جن آیات میں ایمان کی زیادتی کا ذکر ہے وہ محمول ہیں:

(۱) اس زیادت پر جو بلحاظ "مومن بہ" کے ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اوّلاً اجمالی طور پر ایمان لائے کیونکہ ابھی تمام احکام نازل نہیں ہوئے تھے، پھر یکے بعد دیگرے جوں جوں احکام وآیات کا نزول ہوتا رہا وہ ان احکام وآیات پر بھی ایمان لاتے رہے، پس اس اعتبار سے ایمان کی زیادتی ہوئی۔

(۲) یا ان آیات میں زیادت فی الایمان سے مراد ایمان پر ثبات واستقامت ہے کہ ہر زمانہ آئندہ میں جب ایمان پر ثابت قدم رہے گا تو ازدیاد زمان کے ساتھ ازدیاد ایمان بھی ہوتا رہے گا۔

(۳) یا اس سے مراد ثمرۂ ایمان یعنی صفائے قلب، قُرب حق، حلاوتِ ذکر وغیرہ کی زیادتی مراد ہے کیونکہ یہ ثمرات اعمال صالحہ کی زیادتی سے زیادہ ہوتے ہیں اور معاصی کے ارتکاب سے کم ہوتے ہیں۔

(۴) زیادت ونقصان سے مراد ضعف وقوت ہے۔

پس مصنفؒ نے ''واھلہ فی اصلہ سواء'' سے شاید اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اصل ایمان وتصدیق میں سارے مومن مساوی ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ من کل الوجوہ تساوی ہو کیونکہ اہلِ توحید کے قلوب میں ''لا الہ الا اللہ'' کے نور کے درجات ومراتب اتنے متفاوت ہیں کہ جن کا صحیح علم حق تعالیٰ ہی کو ہے کہ کسی کے قلب میں ''لا الہ الا اللہ'' کا نور مثل آفتاب کے درخشندہ ہے اور کسی کے دل میں مثل ماہتاب کے تاباں اور کسی کے دل میں مثل روشن ستارہ کے درخشاں اور کسی کے دل میں طاقت ور بلب کی طرح روشن اور کسی کے دل میں ٹمٹماتے چراغ کی طرح مضمحل۔ پس جس طرح سارے عقلائے عالم نفس عقل میں مساوی ہیں لیکن اس کے باوجود کوئی عقلمند ہے اور کوئی زیادہ عقلمند اور کوئی اس سے بھی زیادہ صاحبِ عقل، اسی طرح اہلِ ایمان اصل ایمان میں مساوی ہونے کے باوجود اس کے ثمرات کے لحاظ سے ضعف وقوت کے ساتھ متصف ہیں۔

ایمان اور اسلام ایک ہیں:۔

یعنی ہر مومن مسلم ہے اور ہر مسلم مومن، دونوں میں اپنے مصداق کے لحاظ سے تساوی کی نسبت ہے، اس میں بعض علمائے حدیث کا اختلاف ہے، وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایمان تصدیق اور اقرار کو کہتے ہیں اور اسلام ادائے طاعات یعنی تصدیق واقرار اور نماز وروزہ احکام کی ادائیگی اور منہیات شرعیہ سے اجتناب کو کہتے ہیں، پس ان لوگوں کے نزدیک ہر مسلم مومن ہے اور ہر مومن مسلم نہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے الفاظ کو نقل کر دوں جو ادائے مطلب میں بہت واضح اور تقریباً تمام عبارات کُتبِ فن کا خلاصہ ہے، مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے اور اسلام اطاعت وفرماں برداری کا، ایمان کا محل قلب ہے اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء وجوارح، لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی محض دل میں تصدیق کر لینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق

کا اظہار اور اطاعت وفرماں برداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرماں برداری کا اقرار اس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں اور قرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔ جب اسلام یعنی ظاہری اقرار وفرماں برداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے: ''اِنَّ الْمُنافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الاسفلِ مِنَ النار'' (یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے) اسی طرح ایمان یعنی تصدیق قلبی کے ساتھ اگر اقرار واطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے، ارشاد ہے: ''يَعرِفُونه كمايَعرِفُونَ اَبنَاءَ هُم'' (یعنی یہ کفار رسول اللہ ﷺ اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو) اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ''وَجَحَدُوابِهَاوَاستَيقَنَتهَا اَنفُسُهُم ظُلماً وعُلُوّاً'' (یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ ان کے دلوں میں ان کا یقین کامل ہے، اور ان کی یہ حرکت محض ظلم وتکبر کی وجہ سے ہے)۔

میرے اُستاذ محترم حضرۃ العلامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہے، فرق صرف ابتداء وانتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہنچ کر مکمل ہوتا ہے اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہنچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی ظاہری اقرار واطاعت تک نہ پہنچے تو وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت واقرار تصدیق قلبی تک نہ پہنچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔ امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے اور امام ابن ہمام نے مسایرہ میں اس تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق

ذکر کیا ہے۔(معارف القرآن: جلد: اول ص: ۱۱۱، ۱۱۲)

استثناء فی الایمان کا مسئلہ:۔

اسی سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ استثناء فی الایمان صحیح ہے یا نہیں؟ یعنی یہ کہنا کہ ''میں ان شاء اللہ تعالیٰ مومن ہوں'' جائز ہے یا نہیں؟ تو اس میں تین اقوال ہیں:

(۱) اپنے مومن ہونے کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا واجب ہے۔

(۲) حرام ہے۔

(۳) ایک اعتبار سے جائز ہے اور ایک اعتبار سے منع ہے، وہذا اصح الاقوال۔

جو لوگ وجوب کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایمان معتبر وہ ہے جس پر انسان کا خاتمہ ہو، اس سے پہلے کوئی اعتبار نہیں، کوئی شخص اگر معاذ اللہ! ایمان کے بعد کفر اختیار کرلے اور اسی حالت میں مرجائے تو درحقیقت وہ پہلے بھی ایمان نہیں رکھتا تھا جس طرح کہ نماز اور روزہ شروع کرنے کے بعد اگر فاسد کردے تو جو اجزاء ان کے ادا کرچکا ہے وہ بھی نماز و روزہ شمار نہیں ہوتے، وھذا ماخذ کثیر من الکلابیۃ وغیرھم۔

اور جو لوگ ان شاء اللہ کہنے کے عدم جواز کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں اپنا مومن ہونا ٹھیک اسی طرح جانتا ہوں جس طرح یہ جانتا ہوں کہ میں نے کلمہ شہادت پڑھا اور اس کا اقرار کیا ہے، جس میں کوئی شک نہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں ان شاء اللہ مومن ہوں تو وہ اپنے ایمان میں شک کررہا ہے چنانچہ یہ لوگ قائلین استثناء کو ''شکاکہ'' کہتے ہیں۔ اور جو حضرات استثناء اور ترک استثناء دونوں کے قائل ہیں وہ ''خیرُ الأُمور أوسطھا'' کے مصداق ہیں، چنانچہ وہ حضرات فرماتے ہیں کہ کہنے والا اگر اپنے ایمان میں شک کے ارادہ سے انشاء اللہ کہے تو یہ منع ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ وہ منجملہ ان مومنین کے ایک مومن ہے جن کے اوصاف قرآن کریم میں مذکور ہیں تو یہ استثناء جائز ہے، اور اسی طرح اگر اس کی مراد یہ ہے کہ انجام کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے یا اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہنے سے سب ہے اپنے ایمان میں شک کی بناء

پر نہیں تو یہ بھی جائز ہے۔(از شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص:۳۵۷، ۳۹۸)

اخبار متواترہ وآحاد میں معتزلہ کا اختلاف:۔

"وجمیع ما صح عن رسول اللہ ﷺ الخ" حضرت مصنفؒ اس سے معتزلہ کا رد فرما رہے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ "اخبار" کی دو قسمیں ہیں: (۱) متواتر اور (۲) آحاد۔ ان کے نزدیک اخبارِ متواترہ بھی اگرچہ قطعی الثبوت ہیں لیکن قطعی الدلالۃ نہیں ہیں، کیونکہ دلالتِ لفظیہ مفید یقین نہیں ہے اور اسی واسطے وہ صفات باری تعالیٰ پر آیاتِ قرآنیہ کی دلالت کو تسلیم نہیں کرتے، اور اخبارِ آحاد کو وہ مفید علم ہی نہیں مانتے کہ وہ ان کے نزدیک نہ بلحاظ متن والفاظ حجت ہیں اور نہ بلحاظ اسناد وثبوت، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علوم الٰہیہ کے ایک بڑے باب سے محروم ہو گئے اور اپنے اوہام باطلہ وخیالاتِ خام کو براہین قطعیہ وعقلیہ گمان کر بیٹھے۔

علمائے اہل سنت کا مسلکِ حق یہ ہے کہ متواتر تو علمِ یقینی کو مفید ہے ہی، خبر واحد بھی جب اُمت میں تلقی بالقبول کے درجہ پر پہنچ جائے تو وہ بھی متواتر ہی کی ایک قسم ہو جاتی اور علمِ یقینی کو مفید ہوتی ہے "ولم یکن بین سلف الامۃ فی ذالک نزاع"۔(از شرح العقیدہ: ص:۳۹۹) اور "من الشرع والبیان" سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مرویاتِ صحیحہ کی دو قسمیں ہیں: ایک تو شرعِ ابتدائی یعنی وہ احکام جو آنحضور ﷺ نے اپنے الفاظ میں بیان فرمائے نہ کہ کسی قرآنی آیت کی توضیح میں اور دوسرے ان احکام کی توضیح وتشریح جو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے۔

"واھلہ فی اصلہ سواء والتفاضل بینھم بالخشیۃ والتقوی ومخالفۃ الھوی وملازمتہ الاولی" بعض نسخوں میں "بالحقیقۃ" کے بجائے "بالخشیۃ والتقی" ہے پس "بالحقیقۃ" کا مطلب تو یہ ہے کہ اصل تصدیق میں سب مشترک ہیں لیکن تصدیق کے افراد قوت وضعف میں متفاوت ہوتے ہیں اور "بالخشیۃ والتقی" سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ مؤمنین کے درجات میں تفاوت قلوب کے اعمال کے

اعتبار سے ہے کیونکہ تصدیق میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

قوله:"والمؤمنون كلهم اولياء الرحمن واكرمهم عند الله اطوعهم بالتقى والمعرفة واتبعهم للقرآن"

ترجمہ: اور مومن سب کے سب اللہ کے ولی ہیں اوران میں سب سے افضل وہ ہے جوان میں تقوی اور معرفت میں سب سے زیادہ تابعدار اور قرآن کا سب سے زیادہ اتباع کرنے والا ہو۔

تشریح: سب مومن اللہ کے ولی ہیں:۔

اولیاء ولی کی جمع ہے، اور ولی "ولایۃ" بفتح الواؤ ضد عداوت سے مشتق ہے اور بعض نے کہا کہ "وِلایۃ" بالکسر بھی ایک لغت ہے، اور ایک قول یہ بھی ہے کہ "وَلایۃ" بالفتح کے معنی نصرت کے ہیں اور بکسر الواؤ کے معنی إمارت (امیر ہونے) کے ہیں، اور زجاج نے کہا کہ کسرہ واؤ بھی جائز ہے کیونکہ "تولی بعض القوم بعضا" (قوم کے بعض نے بعض کی نصرت کی) میں ایک طرح سے صناعت اور عمل کے معنی پائے جاتے ہیں، اور جو لفظ ایسا ہو وہ مکسور ہوا کرتا ہے جیسے لفظ "خِیاطۃ" (سلائی کرنا) وغیرہ، پس اس میں بھی یہ معنی اس طرح پائے جاتے ہیں کہ مومنین اللہ کے ولی ہیں اور اللہ تعالی مومنین کا ولی ہے۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص: ۴۰۳)

اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ"۔ (یونس: ۶۲،۶۳)

(یادرکھو! اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ"۔

(البقرۃ: ۲۵۷)

(اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے وہ ان کو تاریکیوں سے
نکال کر نور کی طرف لاتا ہے)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ
فِیْ سَبِیْلِ اللهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَنَصَرُوْا اُولٰئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَاءُ
بَعْضٍ"۔(الانفال:۷۲)

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مال اور
جان سے اللہ کے راستے میں جہاد بھی کیا اور جن لوگوں نے رہنے کو جگہ دی
اور مدد کی یہ لوگ باہم ایک دوسرے کے ولی وارث ہیں)۔

ان تینوں آیتوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مومنین اللہ کے ولی ہیں اور اللہ ان کا ولی ہے اور اسی طرح مومنین باہم بھی ایک دوسرے کے ولی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو یہ ولایت کا معاملہ ہے وہ محض اس کا فضل واحسان ہے اس کو اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے کہ جس طرح مخلوق ایک دوسرے کے ساتھ ولایت، نصرت اور دوستی کا معاملہ حاجت اور احتیاج کی بناء پر کرتی ہے، وہ اس سے بے نیاز ہے، فرماتے ہیں:

"وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا"۔

(بنی اسرائیل:۱۱۱)

(اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے، اور اس کی خوب
بڑائیاں بیان کیا کیجئے)۔

ولایت کے درجات میں تفاوت ہے:۔

جس طرح ایمان کے درجات متفاوت ہیں اسی طرح ولایت کے درجات میں بھی تفاوت ہے پس (اصل ولایت میں سب اہل ایمان) مشترک ہیں، لیکن ولایت کاملہ انہیں مومنین کے لئے ہے جو متقی ہیں، فرماتے ہیں:

"اَلاَاِنَّ اَولیاءَ اللهِ لَاخَوفٌ عَلَیہِم وَلَاھُم یَحزَنُونَ اَلّذِینَ اٰمَنُوا وَکَانُوا یَتَّقُونَ لَھُم البُشریٰ فِی الحَیٰوۃِ الدُّنیا وَ فِی الاٰخِرَۃِ"۔(یونس:۶۴،۶۳،۶۲)

(یادرکھو!اللہ کے دوستوں پرنہ کوئی اندیشہ ہےاورنہ وہ مغموم ہوتے ہیں وہ،وہ ہیں جوایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں ان کے لئے دُنیوی زندگی میں بھی اورآخرت میں بھی خوشخبری ہے)۔

متقی کی تعریف:۔

اور''متقی کی تعریف اوراوصاف سورۂ بقرہ کی اس آیت میں مذکورہیں:

"وَلٰکِنَّ البِرَّ مَن اٰمَنَ بِاللهِ وَالیومِ الاٰخرِ وَالملائکۃ والکتٰب والنّبین واٰتَی المالَ علیٰ حُبّہٖ ذَوِی القُربیٰ وَالیتامیٰ وَالمساکین وابنَ السبیلِ والسآئلین وَفِی الرِّقابِ وَاَقَامَ الصلوٰۃَ وَاٰتَی الزّکوٰۃَ والمُوفُونَ بِعَھدِ ھِم اِذا عاھَدُوا والصابرینَ فی البأساءِ والضّرآءِ وَحِینَ البأسِ اُولئك الذینَ صَدَقُوا وَاُولئك ھُمُ المُتّقُونَ"(البقرہ:۱۷۷)

(لیکن نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالی پر یقین رکھےاورقیامت کے دن پراورفرشتوں پراور(سب) کتب (سماویہ) پراورپیغمبروں پراور مال دیتاہواللہ کی محبت میں رشتہ داروں کواوریتیموں کواورمحتاجوں کو اور مسافروں کواورسوال کرنے والوں کواورگردن چھڑانے میں اورنماز کی پابندی رکھتاہواورزکوۃ بھی اداکرتاہواورجواشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب عہدکرلیں اوروہ لوگ صبرکرنے والے ہوں تنگدستی میں اوربیماری میں اورقتال میں یہ لوگ ہیں جوسچے ہیں اوریہی لوگ ہیں جومتقی ہیں)۔

متقین کی دو قسمیں:۔

پھر متقین کی دو قسمیں ہیں: (۱) مقتصدین اور (۲) مقربین۔ مقتصدین وہ حضرات ہیں جو قلوب و جوارح کے ان اعمال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرتے ہیں جو فرض ہیں۔ اور مقربین وسابقین وہ حضرات ہیں جو فرائض اعمال کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قُرب حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے:

"قال رسول الله ﷺ يقول الله تعالىٰ من عادلى وليا فقد بارزنى بالمحاربة وماتقرب الىّ عبد ى بمثل اداء ما افترضتُ عليه ولايزال عبدى يتقرب الىّ بالنوافل حتىٰ اُحبَّه فاذااحببتُه كنتُ سمعَه الذى يسمع به وبصره الذى يبصربه ويده التى يبطش بهاورجله التى يمشى بها. ولئن سألنى لاعطينه ولئن استعاذ نى لاعيذ نه وماترد دت عن شيء اناٰفاعله ترد دى عن قبض نفس عبد مؤمن يكره الموت واكرهُ مساء ته".

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس نے میرے کسی ولی سے دُشمنی کی تواس نے مجھ کو جنگ کا چیلنج کیا۔ اور میرے بندہ نے اس چیز کی ادائیگی کے مثل (کسی دوسری چیز سے) میرا قُرب حاصل نہیں کیا جو میں نے اس پر فرض کی ہے اور میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا قُرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے اور اس کی آنکھ ہوجاتا ہوں جس

سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پیر ہوجاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو ضرور دوں گا اور اگر وہ میری پناہ مانگے تو میں اس کو ضرور پناہ دوں گا، اور جس چیز کو میں کرنے والا ہوتا ہوں اس سے تردد نہیں کرتا جیسا کہ اپنے مومن بندہ کی جان قبض کرنے سے تردد کرتا ہوں کہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناگواری کو ناپسند کرتا ہوں۔

قوله: "والایمان هو الایمان بالله وملائکته وکتبه ورسله والیوم الآخروالبعث بعد الموت والقدر خیره وشره وحُلْوِه ومُرِّه من الله تعالی ونحن مؤمنون بذالك كله لانُفرِّقُ بین احدٍ من رُسُلِه ونُصدِّقُ کلهم علی ما جاءوا به"۔

ترجمہ: اور ایمان کا مطلب ہے، اللہ تعالی اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان لانا اور اچھی وبری اور شیریں وتلخ تقدیر پر ایمان لانا کہ وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہے، اور ہم ان سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم ان تمام حضرات کی لائی ہوئی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

تشریح: اثبات آخرت:۔

ایمان سے متعلق ضروری تفصیل گذشتہ اوراق میں سپردِ قلم ہوچکی ہے، البتہ ایمانِ آخرت سے متعلق ملحدینِ زمانہ اور منکرینِ مذہب کے شکوک واوہام کے ازالہ کے لئے کم از کم "علم جدید کا چیلنج" مؤلفہ وحیدالدین خان کے باب "دلیل آخرت" کا مطالعہ ضروری ہے، جو تقریبا پچاس صفحات پر مشتمل ہے، فاضل موصوف نے جدید اصول کے مطابق

عقیدۂ آخرت کے اثبات کا حق ادا کر دیا ہے۔ ہم یہاں پر اس کے چند ضروری اقتباسات پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں، وہ قیامت کے امکان پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سب سے پہلا تجربہ جو ہم کو قیامت کے امکان سے باخبر کرتا ہے وہ زلزلہ ہے، زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے، جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلنے والے لاوا کی شکل میں ہوتا ہے، یہ مادّہ مختلف شکلوں میں زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے، جس کی وجہ سے بعض اوقات زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ کی آواز محسوس ہوتی ہے اور کش مکش کی وجہ سے جھٹکے پیدا ہوتے ہیں اسی کا نام زلزلہ ہے۔

یہ زلزلہ آج بھی انسان کے لئے سب سے زیادہ خوفناک لفظ ہے، یہ انسان کے اوپر قدرت کا ایک ایسا حملہ ہے جس میں فیصلہ کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، زلزلہ کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس ہے، یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادے کے اوپر آباد ہیں، جس سے صرف پچاس کیلومیٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہہ ہم کو الگ کرتی ہے، جو زمین کے مقابلہ میں ویسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا۔ ایک جغرافیہ دان کے الفاظ میں ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم (physical hell) دہک رہا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ ہم ایک عظیم ڈائنامیٹ کے اوپر کھڑے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر سارے نظامِ ارضی کو درہم برہم کرسکتا ہے۔ (علم جدید کا چیلنج: ص: ۱۱۷، ۱۱۸)

اس کے بعد دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اوقات میں آنے والے زلزلوں اور ان سے نقصانات کی مختصر تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:

''زلزلہ دراصل چھوٹے پیمانے کی قیامت ہے، جب دہشت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے۔ جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، جب انسانوں کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں۔ یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں، درحقیقت زلزلے

کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا؟ یہ زلزلے گویا اچانک آنے والی قیامت کی پیشگی اطلاع ہیں، یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا مالک کس طرح زمین کے موجودہ نظام کو توڑنے پر قادر ہے"۔ (ایضاً ص:۱۹۹)

آگے مزید لکھتے ہیں:

"یہی حال بیرونی کائنات کا ہے کائنات نام ہے ایک ایسے لامحدود خلا کا جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھا دُھند گردش کررہے ہیں، جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں، یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کر سکتی ہے، اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر ایسی ہی ہوگی جیسے ہزاروں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اُڑ رہے ہوں اور یکا یک سب کے سب باہم ٹکرا جائیں، اجرام سماوی کا اس قسم کا ٹکراؤ کسی بھی درجہ میں حیرت انگیز نہیں ہے، بلکہ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکراتے کیوں نہیں جاتے، علم الافلاک کا مطالعہ بھی بتاتا ہے کہ ستاروں کا باہم ٹکرا جانا ممکن ہے۔ نظریہ آخرت کا یہ دعویٰ کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہوجائے گا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو واقعہ کائنات کے اندر ابتدائی شکل میں موجود ہے، وہی ایک روز انتہائی شکل میں پیش آنے والا ہے، قیامت کا آنا ہمارے لئے ایک معلوم حقیقت ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے امکان کی حد تک جانتے ہیں اور کل اسے واقعہ کی صورت میں دیکھیں گے"۔ (ایضاً ص:۱۲۰)

اس کے بعد فاضل مصنف نے "زندگی بعد موت" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی ہے جو خاصی طویل ہے، ہم یہاں اس کا آخری صفحہ درج کرتے ہیں:

"براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی، جے ڈوکاس (C.J.DUCASSE) نے اپنی کتاب کے سترہویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے، پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اُخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں

رکھتے ہگران کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کر کے زندگی کے بقاء کو ہمیں ماننا پڑتا ہے، اس باب کے آخری حصے میں وہ سائی کیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنہوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کم از کم شواہد ایسے ضرور ہیں جن میں صرف بقائے روح کا فریضہ (survival hypo thesis) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، ان کی دوسری کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی، اس فہرست کے انتہائی نمایاں افراد میں سے چند کے نام یہ ہیں: الفرڈ رسل ویلس۔ سر ولیم کروکس۔ ایف، ڈبلو ایچ، میرس۔ کیسر لو مبراسو۔ کیمل فلیمیرین۔ سر اولیو لاج۔ ڈاکٹر رچرڈ ہاکسن۔ مسٹر ہنری سڈوک۔ پروفیسر ہسلوپ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں، نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل (empirical proof) سے ثابت کیا جاسکتا ہے، اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس من گھڑت بات کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کر لی ہے، قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں معلوم ہو سکیں گی، مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں"۔

(A philosophical scrutiny of religion,p.412)

"یہاں تک پہنچنے کے بعد زندگی بعد موت کے متعلق مذہبی عقیدے کو نہ ماننا ایسا ہی ہے جیسے کسی دیہاتی آدمی کا اصرار ہو کہ ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دو آدمی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کریں، اس کے بعد اس کے ایک عزیز کو دور کے شہر سے ٹیلی فون کر کے ریسیور اس کے کان پر لگا دیا جائے مگر جب وہ بات کر چکے تو کہے۔" کیا ضروری ہے کہ وہ میرے عزیز کی آواز ہو، ممکن ہے کہ کوئی مشین بول رہی ہو"۔ (ایضاً ص:۱۶۱ تا ۱۶۹)

قوله:-واهل الکبائر من امة محمد ﷺ فی النار لا یخلدون اذا ماتوا وهم موحدون وان لم یکونوا تائبین بعد ان لقوا الله عزوجل عارفین وهم فی مشیئته وحکمه ان شاء غفرلهم وعفا عنهم بفضله کما ذکرالله عزوجل فی کتابه ویغفر مادون ذالك لمن یشآء وان شاء عذبهم فی النار بقدر جنایتهم بعدله ثم یُخرجهم منها برحمته وشفاعة الشافعین من اهل طاعته ثم یبعثهم الی جنته و ذالك بان الله جل جلاله مولیٰ لاهل معرفته ولم یجعلهم فی الدارین کاهل نَکِرَتِه الذین خابوا من هدایته ولم ینالوا من ولایته اللهم یاولیّ الاسلام واهله ثبتنا بالاسلام حتی نلقاك به"۔

ترجمہ: اور اُمت محمدیہ میں سے گناہ کبیرہ کرنے والے جب توحید پر ہونے کی حالت میں مریں تو وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، اگرچہ انہوں نے توبہ نہ کی ہو، بعد اس کے کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملیں کہ اس کی معرفت رکھتے ہوں، اور یہ لوگ اس کی مشیت اور حکم کے تحت ہوں گے اگر وہ چاہے گا تو اپنے فضل سے ان کی مغفرت کر دے گا اور معاف فرمادے گا، جیسا کہ اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے کہ "شرک کے علاوہ گناہ کو جس کے لئے چاہے گا معاف فرمادے گا" اور اگر چاہے گا تو ان کو اپنے عدل کی رو سے جہنم میں عذاب دے گا، پھر ان کو اس سے اپنی رحمت اور اپنے اطاعت کرنے والے بندوں کی شفاعت سے نکالے گا پھر ان کو جنت میں بھیج دے گا، اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اہلِ معرفت کا ولی ہے، اور ان کو ان کافروں جیسا دُنیا وآخرت میں نہیں بنایا ہے جو اس کی

ہدایت سے نامراد اور اس کی ولایت سے محروم ہوئے۔اے اللہ! اے
اسلام کے ولی ہم کو اسلام پر ثابت قدم رکھ یہاں تک کہ ہم تجھ سے اسلام
کے ساتھ ملیں۔

تشریح:۔ ''واھل الکبائر الخ'' اس سے خوارج اور معتزلہ کا رد فرمایا ہے کہ اول الذکر تو مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں اور ثانی الذکر منزلۃ بین منزلتین کے قائل ہو کر ان کے خلود فی النار کے قائل ہیں۔اور ''من امۃ محمد'' کی قید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء کی اُمتوں کے مرتکبین کبائر کا حکم (ان کی شرائع کے نسخ سے پہلے) دوسرا ہے، لیکن اس میں نظر ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان ''۔متفق علیہ (جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ جہنم سے نکالا جائے گا'')۔اس میں آپ نے اپنی اُمت کی تخصیص نہیں فرمائی۔علاوہ بریں بعض نسخوں میں ''اُمۃ'' کا لفظ نہیں پایا جاتا۔

کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف میں علماء کا اختلاف:۔

گناہِ کبیرہ اور صغیرہ کی تعریف میں علماء کے کئی اقوال ہیں، بعض نے کہا کبائر کی تعداد سات ہے اور بعض نے کہا سترہ، اور بعض نے کہا کبائر وہ ہیں جن کی حرمت پر تمام شرائع کا اتفاق ہو اور بعض نے کہا یہ اضافی چیز ہے، لیکن اصح اور ارجح تعریف یہ ہے کہ کبیرہ اس کو کہتے ہیں جس کے مرتکب پر حد مرتب ہو یا قرآن وحدیث میں اس کے لئے جہنم یا لعنت یا غضب الٰہی کی وعید آئی ہو۔اسی طرح صغیرہ کی تعریف میں بھی متعدد اقوال ہیں، بعض نے کہا کہ صغیرہ وہ ہے جس پر نہ دنیا میں حد جاری ہو اور نہ آخرت میں اس پر وعید شدید ہو اور بعض نے کہا جس پر لعنت یا غضب یا جہنم کی وعید نہ آئی ہو۔وان لم یکونوا تائبین۔یہ اس لئے فرمایا کہ توبہ سے بلا اختلاف تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔حضرت مصنف عارفین کے بجائے اگر مومنین کہتے تو زیادہ مناسب ہوتا، کیونکہ معرفت کے لئے

ایمان لازم نہیں ہے، ابلیس اللہ تعالیٰ کو جانتا تھا لیکن اس کے باوجود کافر ہو گیا، اسی طرح فرعون اور دوسرے بہت سے کفار بھی۔ اور یہود رسول اللہ ﷺ کی معرفت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود کافر ہے۔ پس حضرت مصنفؒ کی مراد یہاں معرفت سے معرفتِ کاملہ ہے جس کے لئے ایمان اور ہدایت لازم ہے اور جو اہلِ طریقت کی اصطلاح میں استعمال کی جاتی ہے۔ "اللهم یاولی الاسلام الخ" بعض نسخوں میں "مسکنا" ہے بجائے "ثبتنا" کے، شیخ الاسلام ابواسماعیل الانصاری نے اپنی کتاب "الفاروق" میں حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعا میں فرماتے تھے "یاولی الاسلام واهله مسکنی بالاسلام حتی القاك علیه" ایمان واسلام کی بحث کو اس دعا پر ختم فرما کر اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ مومن کی حالت میں الرجاء والخوف ہے لہٰذا اس کو کسی بھی وقت بارگاہِ الٰہی میں استقامت اور استدامت علی الایمان کی دعا سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

قوله: "ونری الصلوٰة خلف کل بروفاجر من اهل القبلة وعلی من مات منهم"۔

ترجمہ: اور ہم اہلِ قبلہ میں سے ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھنے کو اور ان میں سے جو مر جائے ان پر نمازِ جنازہ پڑھنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

تشریح:۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "صَلُّوا خَلفَ كُلِّ بَرٍّ وَّ فَاجِر" (ہر نیک اور فاجر کے پیچھے نماز پڑھ لو)۔

قال فی شرح العقیدة الطحاویه رواه مکحول عن ابی هریرة ﷺ واخرجه الدارقطنی وقال مکحول لم یلق اباهریرة وفی اسناده معاویة بن صالح متکلم فیه وقد احتج به مسلم فی صحیحه۔ (ص:۴۲۱)

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"صلوا خلف من قال لا الہ الا اللہ وصلوا علی من مات من اہل لا الہ الا اللہ"۔ اخرجہ الدارقطنی من طرق وضعّفھا۔

ہر اس شخص کے پیچھے نماز پڑھ لو جو لآ الہ الا اللہ کہے اور ہر اُس شخص کی نماز جنازہ پڑھو جو لا الہ الا اللہ والوں میں سے مرے۔

ہر نیک وبد کے پیچھے نماز پڑھنے کا مسئلہ:۔

جو شخص مستور الحال ہو اس کا بدعتی اور فاسق ہونا معلوم نہ ہو باتفاق ائمہ اس کے پیچھے نماز جائز ہے اور اس کے اعتقاد کی تحقیق اقتداء کے لئے شرط نہیں ہے۔ اور اگر بدعتی بدعت کا داعی ہو یا فاسق ظاہر الفسق ہو اور وہ امام راتب ہو کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے کی مجبوری ہو مثلاً جمعہ اور عیدین کا امام ہو تو عامہ سلف وخلف کے نزدیک اس کے پیچھے نماز پڑھ لے، اور اگر کوئی امام فاجر ہونے کی وجہ سے جمعہ اور جماعت ترک کر دے تو اکثر علماء کے نزدیک ایسا شخص بدعتی ہوگا، اور صحیح یہ ہے کہ نماز پڑھ لے اور دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ فاجر اماموں کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے اور دوہراتے نہیں تھے۔ لیکن اگر امام نیکوکار کے پیچھے جمعہ اور جماعت ممکن ہو تو امام فاجر کے پیچھے پڑھنے سے اس کی اقتداء اولیٰ ہے، پس اگر بلا عذر فاجر کی اقتداء کی تو اس میں علماء کا اختلاف ہے، بعض نے کہا نماز کا اعادہ کرے اور بعض نے کہا اعادہ نہ کرے۔

(از شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص: ۴۲۳، ۴۲۴)

"وعلی من مات منہم" اس میں سے باغیوں اور رہزنوں کا استثناء ہے، کیونکہ ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ (ایضاً ص: ۴۲۵)

قولہ: "ولا ننزل احداً منہم جنۃً ولا ناراً ولا نشھد علیھم بکفر ولا بشرکٍ ولا بنفاقٍ ما لم یظھر منہم شیء من ذالک ونذر سرائرھم الی اللہ تعالیٰ"۔

ترجمہ: اور ہم ان میں سے کسی کو جنتی اور جہنمی نہیں قرار دیتے اور نہ ان

کے اوپر کفر و شرک اور نفاق کا حکم لگاتے ہیں جب تک اس میں سے کوئی چیز ان سے ظاہر نہ ہو، اور ہم ان کے باطن کو اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔

تشریح:۔ "ولا ننزل الخ" مطلب یہ ہے کہ ہم کسی معین شخص کے متعلق جو اہلِ قبلہ میں سے ہو یہ نہیں کہتے کہ وہ جنتی یا جہنمی ہے، مگر جن کے جنتی ہونے کی رسول اللہ ﷺ نے خود خبر دی ہے جیسے حضرات عشرہ مبشرہؓ۔ کسی شخص کے جنتی ہونے کی شہادت دینے کے متعلق سلفؒ کے تین اقوال ہیں:

(۱) انبیائے کرامؑ کے علاوہ کسی کے جنتی ہونے کی شہادت نہ دی جائے گی، یہ قول محمد بن حنفیہؒ اور اوزاعیؒ سے منقول ہے۔

(۲) ہر وہ مومن جس کے جنتی ہونے پر نص وارد ہو، اس کی شہادت دی جائے گی، یہ اکثر علماء اور محدثین کا قول ہے۔

(۳) جن کے متعلق نص وارد ہوئی ہے ان کے لئے اور جس کے جنتی ہونے کی شہادت مومنین دیں اس کے لئے شہادت دی جائے گی۔

چنانچہ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی تعریف کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا واجب ہوگئی، اور دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی بُرائی کی تو آپ نے فرمایا واجب ہوگئی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے "واجب ہوگئی" تین مرتبہ فرمایا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا چیز واجب ہوگئی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کی تم نے تعریف کی، اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس کی تم نے مذمت کی اس کے لئے جہنم واجب ہوگئی، تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

"ولا نشهد عليهم بكفر الخ" کیونکہ ہمیں ظاہرِ حال پر حکم لگانے کا حکم ہوا ہے اور بدگمانی کرنے سے روکا گیا ہے، ارشاد فرمایا:

"يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ"۔ (الحجرات: ۱۲)

(اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں)۔

اور فرمایا:

"وَلَا تَقفُ مَا لَيسَ لَكَ بِهِ علمٌ اِنَّ السمعَ والبَصَرَ والفؤادَ كُلُّ اولئك كَانَ عَنهُ مسئولاً"۔ (بنی اسرائیل:۳۶)

(اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کرو، کیونکہ کان اور آنکھ اور دل ہر شخص سے ان سب کی پوچھ ہوگی)۔

قوله: "ولانرىٰ السيفَ على احدٍ من اُمّةِ محمد ﷺ الامن وجب عليه السيفُ ولانرىٰ الخروجَ على ائمتنا ووُلاةِ اُمورِنا وان جاروا ولاندعوا عليهم ولاننزعُ يداً من طاعتهم ونرىٰ طاعتهم من طاعةِ الله عزوجل فريضةً مالم يأمروا بمعصية وندعو لهم بالصلاح والمعافاتِ"۔

ترجمہ: اور ہم محمد ﷺ کی اُمت میں سے کسی کے قتل کو جائز نہیں سمجھتے مگر جس پر (شرعاً) تلوار واجب ہوگئی ہو، اور ہم اپنے اماموں اور حاکموں کے خلاف بغاوت جائز نہیں سمجھتے اگر چہ وہ ظلم کریں، اور نہ ہم ان پر بددعا کرتے ہیں اور نہ ہم ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں اور ہم ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی میں سے سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ اِس کی نافرمانی کا حکم نہ دیں اور ہم ان کی بھلائی اور عافیت کے لئے دُعا کرتے ہیں۔

تشریح: ہمارے نزدیک نہ کسی کا ناحق خون جائز اور نہ امیر کے خلاف بغاوت جائز:۔

"ولانرىٰ السيف الخ" حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ سے روایت ہے کہ آپ

نے فرمایا:

"لایحل دم امریء مسلم یشھد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلاث الثیب الزانی والنفس بالنفس والتارك لدینہ المفارق للجماعۃ"۔(متفق علیہ)

کسی مسلمان کا خون جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں حلال نہیں ہے مگر تین چیزوں میں سے ایک چیز سے، شادی شدہ زنا کرنے والا، اور جان کے بدلہ جان اور اپنے دین کو چھوڑنے والا جماعت سے علیحدہ ہونے والا۔

"ولا نخرج الخروج الخ" اولوالامر یعنی اہلِ حکومت جب تک اللہ کی نافرمانی اور شریعت کے خلاف حکم نہ دیں، ان کی اطاعت واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"یآایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ وَاطیعوا الرسولَ واُولی الامر منکم"۔(النساء:۵۹)

(اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں جو لوگ اہلِ حکومت ہیں ان کا بھی)۔

اور حضرت ابوذرؓ سے صحیح مسلم میں روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

"ان خلیلی اوصانی ان اسمع واطیع وان کان عبداً حبشیاً مجدع الاطراف"۔

(میرے خلیل نے مجھ کو وصیت فرمائی کہ میں (امیر کا حکم) سنو اور مانوں اگرچہ وہ ناک، کان کٹا حبشی غلام ہی ہو)۔

نیز بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے:

"علی المرء المسلم السمع والطاعۃ فیما احبَّ و کرِہَ الا اَن یؤمر بمعصیۃ فلا سمع ولا طاعۃ"۔

(مسلمان آدمی کے اوپر سُننا اور ماننا لازم ہے اس چیز کو بھی جس کو پسند کرے اور اس کو بھی جس کو پسند نہ کرے مگر یہ کہ اس کو معصیت کا حکم دیا جائے، پس اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سُننا لازم ہے اور نہ ماننا)۔

اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"من رأى من اميره شيئاً يكرهه فليصبر فانه من فارق الجماعة شبراً فمات ميتة جاهلية"۔مسلم

(جو شخص اپنے امیر سے کوئی ایسی چیز دیکھے جو اس کو ناپسند ہو تو صبر کرے اس لئے کہ جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا اس کی موت جاہلیت کی موت ہے)۔

اور ایک روایت میں ہے کہ: "فقد خلع رِبقة الاسلام من عنقه"۔احمد (اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے نکال دی)۔

نیز حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخِر منهما"۔مسلم واحمد (جب دو خلیفہ کی بیعت لی جائے تو ان دونوں میں سے آخر والے کو قتل کردو) وان جاروا یعنی اگر چہ وہ ظالم ہی ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر ان کے ظلم کی وجہ سے ان سے بغاوت کی گئی تو اس سے جو مفاسد اور تباہیاں ہوں گی وہ ان کے ظلم کے مفاسد سے بہت زیادہ ہوں گے، لہٰذا اھون البلیتین کو اختیار کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں ان کے مظالم پر صبر کرنے میں تکفیر سیئات اور اجر ہی ہے لہٰذا بجائے بغاوت کرنے کے توبہ واستغفار اور اپنے اعمال کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کیونکہ بُرے حُکام اعمالِ بد ہی کے نتیجہ میں مسلط کئے جاتے ہیں، ارشاد ہے:

"وَمَآ اَصَابَكُم مِن مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَت اَيدِيكُم وَيَعفُوا عَن كَثِيرٍ"۔(الشوریٰ:۳۰)

(اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے

کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو در گذر ہی کر دیتا ہے)۔

حضرت مالک بن دینار سے منقول ہے کہ بعض آسمانی کتابوں میں لکھا ہے کہ: "میں اللہ ہوں، ملک کا مالک ہوں، بادشاہوں کے دل میرے ہاتھ میں ہیں، پس جو میری اطاعت کرے گا میں اُن کو اس پر رحمت بنادوں گا اور جو میری نافرمانی کرے گا میں ان کو اس پر عذاب بنادوں گا، پس تم اپنے کو بادشاہوں کو بُرا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو بلکہ توبہ کرو میں اُن کو تم پر مہربان بنادوں گا"۔

قوله: "ونتبع السنة والجماعة ونجتنب الشذوذ والخلاف والفرقة"۔

ترجمہ: اور ہم سنت اور جماعت کی پیروی کرتے ہیں، اور جماعت سے علیحدگی اور اختلاف اور فرقہ بندی سے دور رہتے ہیں۔

تشریح: سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے اور جماعت سے مراد جماعتِ مسلمین یعنی صحابہ وتابعین ہیں کہ انہیں حضرات کی اتباع ہدایت اور ان کی مخالفت ضلالت وگمراہی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ"۔ (آل عمران: ۳۱)

(آپ فرمادیجئے کہ اگر خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو خداوند تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے عنایت فرمانے والے ہیں)۔

اور فرمایا:

"وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ

مَصِيراً"۔(النساء:۱۱۵)

(اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہولے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے جانے کی)۔

نیز فرمایا:

"وَلَاتَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ"۔(آل عمران:۱۰۵)

(اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا جبکہ ان کے پاس احکامِ واضحہ پہنچ چکے تھے اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی)۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن اهل الكتابين افترقوا في دينهم على ثنتين وسبعين ملة وان هذه الامة ستفترق على ثلاث وسبعين ملة كلها في النار الاواحدة وهي الجماعة"۔

(یہود و نصاریٰ اپنے دین میں بہتر فرقوں میں بٹے اور بے شک یہ اُمت تہتر فرقوں میں بٹے گی۔سب کے سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک کے اور وہ جماعت ہے۔)

اور ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا" ما انا عليه واصحابي "(جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"من كان منكم مستنا فليستن بمن قد مات فان الحي

لاتؤمن علیه الفتنة اولئك اصحاب محمد ﷺ کانوا افضل هذه الامة ابرّهاقلوباً واعمقهاعلماً واقلها تکلفا قوم اختارهم الله لصحبة نبیه واقامة دینه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم فی آثارهم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقهم ودینهم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم"۔

(شرح العقیدۃ الطحاویہ:ص:۴۳۱۔۴۳۲)

تم میں سے جو شخص کسی کا طریقہ اختیار کرنا چاہے تو ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو وفات پا چکے کیونکہ زندہ فتنہ سے مامون نہیں ،اور وہ محمد ﷺ کے صحابہ ہیں، یہ حضرات اس اُمت میں سب سے افضل، سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرے علم والے اور سب سے زیادہ بے تکلف اور سادہ تھے، یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اللہ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب فرمایا، پس تم ان کا فضل ومرتبہ پہچانو اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو، اور ان کے اخلاق ودین پر ہر ممکن عمل کرو، کیونکہ وہ حضرات سراسر ہدایت پر تھے۔

قوله:"ونحب اهل العدل والامانة ونبغض اهل الجور والخیانة ونقول الله اعلم فیما اشتبه علینا علمه"۔

ترجمہ:اور ہم انصاف وامانت والے لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور ظلم وخیانت والے لوگوں سے بغض رکھتے ہیں اور جس چیز کا علم ہم پر مشتبہ ہوجاتا ہے تو اس کے بارے میں ہم "اللہ اعلم" (اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے) کہتے ہیں۔

تشریح: اہلِ انصاف سے محبت اور ظالم وخائن سے بغض کمالِ ایمان کی نشانی ہے:۔

اہلِ عدل وانصاف اور نیک لوگوں سے محبت کرنا اور ظالموں، خائنوں اور بُرے لوگوں سے بغض کرنا کمالِ ایمان کی علامت اور نشانی ہے، کیونکہ مومن اللہ کے محبوب کو محبوب اور اس کے مبغوض کو مبغوض رکھتا ہے، پس اول الذکر سے اللہ محبت کرتا اور مؤخر الذکر سے بغض کرتا ہے تو ہم بھی اوّل سے محبت اور ثانی سے بغض رکھتے ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کے دوست ہیں وہ ان کے بھی دوست ہیں اور جو اللہ اور رسول کے دُشمن ہیں وہ اس کے بھی دُشمن ہیں۔

"ونقول اللہ اعلم الخ" اور "ماسلم فی دینه الامن سلم اللہ الخ" کے تحت اس موضوع پر گفتگو گذر چکی ہے۔ فلیراجع الیہ

قوله: "ونری المسح علی الخفین فی السفر والحضر کما جاء فی الاثر والحج والجهاد فرضیان ماضیان مع اولی الامر من ائمة المسلمین برّهم وفاجرهم الی یوم القیامة لایُبطلهما شیء ولا ینقضهما"۔

ترجمہ: اور ہم سفر وحضر میں خفین پر مسح کرنا جائز سمجھتے ہیں جیسا کہ حدیث میں آیا ہے اور حج اور جہاد مسلمان حکام کے ساتھ خواہ وہ نیک ہوں یا بد قیامت تک جاری رہے گا، ان دونوں کو کوئی چیز باطل یا منسوخ نہیں کر سکتی۔

تشریح: مسح الخفین اہل سنت کی نشانی ہے:۔

"ونری المسح الخ" مسح علی الخفین سُنت متواترہ سے ثابت ہے، امام کمال الدین ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

"قال ابو حنیفة ماقلت بالمسح حتی جاءنی فیه مثل ضوء

النھار وعنه اخاف الکفرعلی من لم یرالمسح علی الخفین"۔

(امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ میں مسح علی الخفین کا قائل اس وقت ہوا ہوں جب دن کے اُجالے کی طرح مجھ پراس کا ثبوت روشن ہوگیا ہے اور امام صاحب ہی سے ایک روایت یہ ہے کہ مجھے اس شخص پر کُفر کا اندیشہ ہے جو مسح علی الخفین کا قائل نہ ہو)۔(فتح القدیر:ج:۱ص:۱۴۳)

اور پھر آگے تحریر فرمایا ہے کہ:

"وروی ابن المنذر فی اخرین عن الحسن البصری قال:حدثنی سبعون رجلا من اصحاب رسول الله ﷺ انه علیه الصلوٰۃ والسلام مسح علی الخفین"۔

(امام حسن بصریؒ نے فرمایا کہ مجھ سے ستر صحابہ کرامؓ نے حدیث بیان کی کہ آنحضور ﷺ نے مسح علی الخفین فرمایا ہے)۔(حوالہ بالاومن اراد البسط فلیراجع الی کتب الفقه وشروح الحدیث)

اور پھر اس مسئلہ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ یہی روافض خفین پر مسح کے قائل تو نہیں ہیں لیکن اس کے برعکس وضوء میں غسل رجلین کے بجائے مسح رجلین کے قائل ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ کا وضوء مع غَسلِ رجلین ایسے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ جس کا انکار آفتابِ نصف النہار کا انکار ہے،والتفصیل فی کتب الفقه والشروح۔

''والحج والجهاد الخ'' اس سے بھی روافض پر رد فرمایا ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ جب امام معصوم نکلیں گے اور آسمان سے ایک منادی پکارے گا کہ ان کی اتباع کرو اس وقت جہاد فرض ہوگا،اور پھر اس سے متعلق ان کے اندر بہت ہی عجیب وغریب خرافات،بے سروپا اباطیل اور اسلام وایمان کے منافی،عقل سے دور ایسی داستانیں ہیں کہ جن کو سُن کر ایک معمولی عقل کے انسان کو بھی ہنسی آئے،مذہب شیعہ کے متعلق ضروری

معلومات حاصل کرنے کے لئے کم از کم "تحفہ اثنا عشریہ، نصیحۃ الشیعہ اور ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

"مع اولی الامر الخ" حاکمِ وقت خواہ صالح ہو یا فاجر لیکن اس کی ماتحتی میں جہاد اور حج دونوں ادا کئے جائیں گے کیونکہ یہ دونوں ہی فریضے ایسے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں لہذا اس میں ایک سربراہ کا ہونا ضروری ہے جو لوگوں کی رہنمائی کرے اور اس کی رہنمائی میں فریضہ حج ادا کیا جائے اور اسی طرح دشمن کا مقابلہ بھی اس کی سربراہی میں انجام پائے، اور اس قیادت و امامت کے تحقق کے لئے بشرط صلاحیتِ امامت جس طرح امامِ صالح کافی ہے اسی طرح امام فاجر بھی کافی ہے۔

قوله: "ونؤمن بالكرام الكاتبين فان الله قد جعلهم علينا حافظين ونؤمن بملك الموت المؤكل بقبض ارواح العالمين"۔

ترجمہ: اور ہم کراماً کاتبین پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمارا نگراں بنایا ہے، اور ہم موت کے فرشتہ پر ایمان رکھتے ہیں جو لوگوں کی جان نکالنے پر مامور ہیں۔

تشریح:۔ "ونؤمن الخ" اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: "وَاِنَّ عَلَيكُم لَحافِظِينَ كِراماً كاتِبِينَ يَعلَمُونَ ماتَفعَلُونَ" (الانفطار: ۱۰۔۱۲) (اور تم پر یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے مقرر ہیں جو تمہارے سب اعمال کو جانتے ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"اِذيَتَلَقَّى المُتَلَقِّيٰنِ عَنِ اليَمِينِ وَعَنِ الشِمالِ قَعِيدٌ مَايَلفِظُ مِن قولٍ اِلّالَدَيهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ"۔ (ق: ۱۸،۱۷)

(جب دو اخذ کرنے والے فرشتے اخذ کرتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس

کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہوتا ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"یتعاقبون فیکم ملائکة باللیل وملائکة بالنہار و یجتمعون فی صلوٰة الصبح وصلوٰة العصر فیصعد الیه الذین کانوا فیکم فیسالهم والله اعلم بهم کیف ترکتم عبادی فیقولون اتیناهم وهم یصلون وفارقناهم وهم یصلون"۔(بخاری ومسلم)

(تمہارے درمیان کچھ فرشتے رات میں اور کچھ دن میں باری باری آتے ہیں اور نماز فجر و نماز عصر میں اکٹھے ہوتے ہیں پس وہ فرشتے جو تمہارے درمیان تھے چڑھ جاتے ہیں پس اللہ ان سے پوچھتا ہے اور اللہ ان کو خوب جانتا ہے کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا، وہ کہتے ہیں ہم ان کے پاس گئے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ان سے جدا ہوئے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔)

ہر انسان پر چار فرشتے مامور ہیں:۔

کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ چار فرشتے دن میں اور چار فرشتے رات میں ہر انسان پر مامور ہیں، ایک دائیں طرف ہوتا ہے جو نیکی لکھتا ہے اور دوسرا بائیں طرف جو بدی لکھتا ہے، یہ دونوں کاتبانِ اعمال ہیں۔ اور دوسرے دو فرشتے حفاظت کے لئے ہوتے ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔(شرح العقیدة الطحاویہ:ص:۴۳۹)

آیت شریفہ "لَه مُعَقِّبٰتٌ مِن بینِ یَدَیهِ وَمِن خَلفِه یَحفَظُونَه مِن اَمرِ الله" (الرعد:۱۱) (ہر شخص کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں) کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ فرشتے آگے اور پیچھے سے انسان کی حفاظت

کرتے رہتے ہیں اور جب کوئی تقدیری بات پیش آنی ہوتی ہے تو وہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ (ایضاً)

"ونؤمن بملك الموت الخ" قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

"قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ"۔ (السجدۃ:۱۱)

(آپ فرما دیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے جو تم پر متعین ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے)۔

نفس اور روح کی حقیقت:۔

اوّلاً اس میں اختلاف ہے کہ نفس اور روح دونوں ایک ہی مسمیٰ کے دو نام ہیں یا دونوں الگ الگ دو چیزیں ہیں۔اس باب میں تحقیق یہ ہے کہ نفس اور روح کے درمیان عموم وخصوص من وجہ کی نسبت ہے کیونکہ "نفس" ایک لفظ مشترک ہے جو چند معنی میں استعمال ہوتا ہے مثلاً خون، نظرِ بد، بدن، شخص اور روح وغیرہ لیکن روح پر اس کا اطلاق عموماً اسی وقت ہوتا ہے جب روح بدن کے ساتھ متصل ہو، اور جب مجرد ہو تو اس پر "روح" کا اطلاق اغلب ہے، پس روح کا اطلاق بدن پر نہ منفرداً ہوتا ہے اور نہ بدن مع النفس پر، اسی طرح "روح" کا استعمال بھی چند معانی میں ہوتا ہے مثلاً قرآن، جبرئیل امین، وحی، حکمِ خداوندی اور وہ ہوا جو انسانی جسم میں سرایت کئے ہوئے ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ نفس اور روح کا مدلول کبھی ایک ہوتا ہے اور وہی مادۂ اجتماع ہے اور کبھی مختلف کہ نفس کا اطلاق ہوگا لیکن روح کا نہیں یا روح کا اطلاق ہوگا اور نفس کا نہیں، اور یہ دونوں مادۂ افتراق ہیں۔

نفس کی تین قسمیں مطمئنہ، لوّامہ اور امّارہ:۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ انسان کے اندر تین نفس ہیں: (۱) مطمئنہ کما قال اللہ تعالیٰ: "یاَ اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّه" (الفجر:۲۷) (۲) لوّامہ کما قال تعالیٰ: "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَه" (القیامۃ:۲) (۳) امّارہ: اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ

بالسوء" (یوسف: ۵۳) اور یہ تینوں مستقل الگ الگ ہیں، لیکن تحقیق یہ ہے کہ یہ تینوں الگ الگ تین نفس نہیں بلکہ ایک ہی نفس ہے جن کی یہ تین صفات ہیں پس نفس امارہ بالسوء (برائی کا حکم دینے والی) ہے لیکن جب ایمان کے ساتھ اس کا سابقہ پڑتا ہے تو وہ لوّامہ (ملامت کرنے والی) ہوجاتی ہے کہ گناہ کرتی ہے پھراس کے بعد اس کے ارتکاب پر ملامت بھی کرتی ہے، پھر جب ایمان قوی ہوجاتا ہے کہ خواہش نفس پر غالب ہوجاتا ہے تو وہ نفس مطمئنہ (اطمینان والی) ہوجاتی ہے۔

روح کی تعریف:۔

روح کی تعریف میں ایک سو اقوال ہیں: ایک قول یہ ہے کہ وہ جسم ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ عرض ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ ہم اس کی حقیقت کی بابت کچھ نہیں جانتے کہ جوہر ہے یا عرض۔ بعض نے کہا کہ روح طبائع اربعہ کے اعتدال سے زیادہ کوئی چیز نہیں اور بعض نے کہا کہ روح وہ دمِ صافی ہے جو کدورت اور عقوبات سے خالص ہے اور بعض کا قول ہے کہ وہ حرارتِ غریزیہ ہے اور وہی حیات ہے اور بعض نے کہا کہ روح وہ سانس ہے جو اندر باہر آتا جاتا ہے، اور متکلمین کا مسلک یہ ہے کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو بدن میں اس طرح سرایت کئے ہوئے جس طرح پانی سبز و تر لکڑی میں۔ عادۃ اللہ یہ ہے کہ جب تک یہ جسم میں رہتی ہے وہ زندہ رہتا ہے اور جب یہ جسم سے علیحدہ ہوتی ہے تو موت آجاتی ہے۔

"انه (الروح) جسم لطيف شابك الجسد مشابكة الماء بالعود الاخضر اجرى الله العادة بأن يخلق الحيوٰة ما استمرت هى فى الجسد فاذا فارقته توفت الموت الحيوٰة"۔

(شرح الفقه الاكبر: ص: ۱۲۴)

شارح عقیدۂ طحاویہ فرماتے ہیں کہ کتاب وسنت، اجماعِ صحابہ اور دلائلِ عقلیہ

سے معلوم ہوتا ہے کہ روح ایک ایسا جسم ہے جو ماہیت کے لحاظ سے اس محسوس جسم میں مختلف ہے، وہ ایک نورانی علوی خفیف حی متحرک جسم ہے جو جوہر اعضاء میں نفوذ کئے ہوئے ہے، اور اس میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے جس طرح پانی گلاب کے پھول میں اور تیل زیتون میں اور آگ کوئلہ میں۔ پس جب تک یہ اعضاء اس جسم لطیف کے ان آثار کی قبولیت کی صلاحیت رکھتے ہیں جو ان پر فائض ہوتے رہتے ہیں، وہ جسم لطیف ان اعضاء میں ساری رہتا ہے اور ان آثار یعنی حس اور حرکتِ ارادیہ کا فائدہ دیتا ہے، اور جب اعضاء اخلاطِ غلیظہ کے استیلاء کے سبب فاسد ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر ان آثار کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہ جاتی تو روح بدن سے مفارقت اختیار کر لیتی ہے اور عالمِ ارواح کی طرف منتقل ہو جاتی ہے چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الانفُسَ حِينَ مَوتِهَا وَالَّتِى لَم تَمُت فِى مَنَامِهَا فَيُمسِكُ الَّتِى قَضىٰ عَلَيهَا الموتَ وَيُرسِلُ الأُخرىٰ إِلىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى إِنَّ فِى ذَالِكَ لَآيٰتٍ لِقَومٍ يَتَفَكَّرُونَ"۔ (الزمر: ۴۲)

(اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جس پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعاد معین تک کے لئے رہا کر دیتا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں دلائل ہیں)۔

اور فرمایا:

"يَآ أَيَّتُهَا النَّفسُ المُطمَئِنَّةُ ارجِعِى إِلىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرضِيَّةً فَادخُلِى فِى عِبَادِى وَادخُلِى جَنَّتِى"۔ (الفجر: ۲۷،۳۰)

(اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا

اور میری جنت میں داخل ہوجا۔)

روح قدیم ہے یا حادث؟ایک سوال اور جواب:۔

اب رہا یہ سوال کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں ''روح'' کو''امر رب''فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

-قُلِ الرُّوحُ مِن اَمرِ رَبِّي وَمَآ اُوتِيتُم مِّنَ العِلمِ اِلّا قَلِيلاً۔

(بنی اسرائیل:۸۵)

(آپ فرمادیجئے روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ روح ''امر رب'' ہے اور امر مخلوق نہیں ہے لہذا روح مخلوق اور حادث نہیں ہے پس اوپر روح کی جو تعریف مذکور ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّلاً تو قطعی طور پر یہی متعین نہیں ہے کہ اس آیت میں روح سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ اس میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا کہ اس سے فرشتہ مُراد ہے اور بعض نے اسی روح کو مُراد لیا ہے جس سے انسان زندہ ہے وغیرھا من الاقوال ،لہذا اس سے استدلال صحیح نہیں کہ اذاجاء الاحتمال بطل الاستدلال- ثانیاً یہ کہ ''روح'' کو ''امر'' اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالی نے اس کو اپنے امر یعنی لفظ ''کُن'' سے پیدا فرمایا برخلاف کائنات کی اکثر چیزوں کے کہ ان کو تدریجاً پیدا فرمایا۔اسی واسطے تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ روح حادث اور مخلوق ہے۔)(انہامحدثة مخلوقة مصنوعة مربوبة مدبرة)

روح مرتی ہے یا نہیں؟

پھر اس میں اختلاف ہے کہ روح مرتی ہے یا نہیں؟ایک جماعت اس کی قائل ہے کہ روح مرجاتی ہے کیونکہ روح ''نفس'' ہے اور ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے ''کُلُّ نَفسٍ ذَائِقَةُ المَوتِ''۔اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ روح نہیں مرتی کیونکہ وہ باقی رہنے

کے لئے پیدا کی گئی ہے البتہ جسم مرتا ہے اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح اجسام سے مفارقت کے بعد نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں یا عذاب سے دوچار۔ ان دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ نفوس وارواح کی موت سے مُراد اُن کا اپنے اجسام سے خروج اور مفارقت ہے، پس روح کی موت سے مُراد اگر یہی ہے تو یہی "ذائقۃ الموت" کا مصداق ہے اور اگر یہ مُراد ہے کہ وہ بالکلیہ معدوم اور فنا ہوجائے گی تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ارواح باقی رہیں گی خواہ جنت ونعمت میں یا دوزخ ونقمت میں علیٰ حسب الاعمال۔

روح کا تعلق جسم کے ساتھ پانچ طریقہ پر ہے:۔

پھر واضح ہو کہ بدن کے ساتھ روح کا تعلق پانچ طرح سے ہے: اول: ماں کے پیٹ میں جنین ہونے کی حالت میں۔ دوم: شکمِ مادر سے نکل کر روئے زمین پر آنے کے بعد۔ سوم: سونے کی حالت میں کہ من وجہٖ بدن کے ساتھ روح متعلق ہوتی ہے اور من وجہٖ اس سے مفارق۔ چہارم: عالمِ برزخ میں بدن کے ساتھ روح کا تعلق کیونکہ اندریں صورت بھی روح کو جسم سے مفارقتِ کلیہ نہیں ہوتی بلکہ کچھ تعلق باقی رہتا ہے چنانچہ سلام کرنے والے کا جواب دینے کے لئے روح لوٹائی جاتی ہے لیکن یہ لوٹانا اس طرح کا نہیں ہوتا جس سے اس کا زندہ ہونا لازم آئے۔ پنجم: قیامت کے روز دوبارہ زندہ کئے جانے کے وقت جسم کے ساتھ اس کا تعلق اور تعلق کی یہ قسم سب سے زیادہ کامل ہے کیونکہ پھر نہ موت آئے گی اور نہ نیند اور نہ کسی اور طرح کا فساد۔

قوله: "ونؤمن بعذاب القبر لمن کان لذالك اهلاً وبسوال منکرٍ ونکیرٍ للمیت فی قبره عن ربه ونبیّه ودینه علیٰ ماجاء ت به الاخبار عن رسول الله ﷺ وعن اصحابه رضی الله عنهم اجمعین والقبر روضةٌ من ریاض الجنة اوحُفرة من حُفرِ النیران۔ (ومثله فی الحدیث)

ترجمہ: اورہم اس شخص کے لئے عذاب قبر پرایمان رکھتے ہیں جواس کا مستحق ہواور قبر میں رب، دین اور نبی کے متعلق منکرونکیر کے سوال پر بھی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرامؓ کے آثار میں وارد ہے۔ اور قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔

عذاب قبر برحق ہے:۔

تشریح:۔اس کا ثبوت قرآنِ کریم کی ان آیات سے ہوتا ہے:

"وَحاق بآل فرعون سوء العذاب النار يُعرضُون عليها غُدوا وعشيا وَيَومَ تَقُومُ الساعَةُ اَدخِلُوا الَ فرعونَ اَشَدَّ العذابِ"۔(المومن:۴۶،۴۵)

(اورفرعون والوں پر موذی عذاب نازل ہوا، وہ لوگ (برزخ میں) صبح اور شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا کہ) فرعون والوں کو (مع فرعون کے) نہایت سخت آگ میں داخل کرو)۔

اور فرمایا:

"فَذَرهُم حَتّیٰ يُلٰقُوا يَومَهُمُ الذى فِيهِ يُصعَقُونَ يَومَ لايُغنِى عَنهم كَيدُ هُم شَيئاً وَلَاهُم يُنصَرُونَ وَاِنَّ لِلَّذِين ظَلَمُوا عَذَاباً دُونَ ذَالِكَ وَلٰكِنَّ اَكثَرَهُم لايَعلَمُونَ"۔

(الطور:۴۵ تا ۴۷)

(تو ان کو رہنے دیجئے یہاں تک کہ ان کو اپنے اُس دن سے سابقہ ہو جس میں ان کے ہوش اُڑ جائیں گے جس دن ان کی تدبیریں اُن کے کچھ بھی کام نہ آئیں گی اور نہ ان کو مدد ملے گی اوران ظالموں کے لئے قبل اس کے بھی عذاب ہونے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر کو معلوم نہیں۔)

اور حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں جس میں مومن وکافر کی روح نکلنے کا حال اور قبر کے عذاب وغیرہ کی کیفیت مفصل مذکور ہے۔ آنحضور ﷺ سے یہ منقول ہے کہ آپ نے تین بار فرمایا: ''اعوذ باللہ من عذاب القبر'' - رواہ الامام احمد وابوداؤد وغیرھما۔

نیز حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ دو قبروں کے پاس سے گذرے تو آپ نے فرمایا:

"انهما ليعذبان ومايعذبان في كبير اما احدهما فكان لايستبرىء من البول واما الأخر فكان يمشي بالنميمة فدعا بجريدة رطبة فشقها نصفين وقال لعله يخفف عنهما مالم ييبسا"۔ رواہ البخاری ومسلم۔

(یہ دونوں عذاب میں مبتلا ہیں اور ان کو کسی بڑے گناہ کے سبب عذاب نہیں دیا جارہا ہے۔ بہرحال ان میں سے ایک تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چغلی کھاتا تھا پھر آپ نے کھجور کی ایک تازہ شاخ منگوائی اور اس کو دو حصوں میں چیر دیا اور فرمایا شاید جب تک یہ دونوں خشک نہ ہوں ان دونوں سے عذاب ہلکا کر دیا جائے)۔

اور صحیح ابی حاتم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اذاقُبر احدُکم او الانسان اتاه ملكان اسودان ازرقان يقال لاحدهما المنكر والاخر النكير"۔ [1]

(جب تم میں سے کوئی یا فرمایا کہ انسان دفن کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس

---

[1] ۔ قال الالبانی فی حاشیۃ شرح العقیدۃ الطحاویۃ: حسن اخرجہ الترمذی ایضا وقال حدیث حسن غریب: قلت واسنادہ حسن، وفیہ رد علی من انکر من المعاصرین تسمیۃ الملکین بالمنکر والنکیر۔ (ص: ۴۵۰)

دو سیاہ نیلگوں آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں ان میں ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے)۔

الغرض قبر کے عذاب ونعمت اور نکیرین کے سوال کی بابت احادیث درجہ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں لہٰذا اس کا اعتقاد اور اس پر ایمان واجب ہے۔

قبر میں سوال روح اور بدن دونوں سے ہوگا:۔

پھر یہ کہ باتفاق اہل سنت والجماعت قبر میں سوال روح اور جسم دونوں سے ہوگا، صرف روح سے نہ ہوگا کما قال ابن حزم اور نہ صرف بدن بلا روح سے ہوگا۔کما قال الآخرون۔اور اسی طرح اہل سنت کے نزدیک عذاب قبر بھی روح اور بدن دونوں کو ہوگا۔

دار تین ہیں اور قبر عالم برزخ کو کہتے ہیں:۔

نیز معلوم ہوا کہ دار تین ہیں:(۱)دارِ دُنیا(۲)دارِ برزخ(۳)دارِ قرار یا دارِ آخرت، اور ان تینوں دار کے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ احکام مقرر فرمائے ہیں، اور پھر انسان کو جسم اور روح سے مرکب بنایا، اور دُنیا کے احکام اجسام کے اوپر نافذ فرمائے اور ارواح کو جسم کے تابع بنایا، اور برزخ کے احکام ارواح پر نافذ فرمائے اور اجسام کو ارواح کے تابع قرار دیا، اور دارِ آخرت میں جزاء وسزا ساری چیزیں ارواح واجسام سب پر ہوں گی۔اور یہیں پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ قبر اس گڑھے کا نام نہیں ہے جس میں مردہ کو دفن کیا جاتا ہے بلکہ قبر عالم برزخ کا نام ہے، پس کوئی شخص خواہ قبر میں دفن کیا جائے یا آگ میں جلا دیا جائے یا درندے اس کو کھا جائیں یا جو بھی صورت پیش آئے عالمِ برزخ میں اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو اس قبر(گڑھے)میں مدفون شخص کے ساتھ ہوگا۔

اور اسی سے قبر کے "روضة من رياض الجنة او حفرة من حفر النار" کا مطلب بھی واضح ہو جاتا ہے۔(والتفصیل فی الاحادیث الشریفہ)

سوال نکیرین اس اُمت کے ساتھ مخصوص ہے یا نہیں؟

کیا منکر نکیر کا سوال اس اُمت کے ساتھ مخصوص ہے؟ اس میں تین اقوال ہیں: (۱) توقف (۲) اس اُمت کے ساتھ خاص ہے (۳) عام ہے - وھوالظاھر واللہ اعلم-

اسی طرح اس میں بھی اختلاف ہے کہ بچوں سے بھی سوال ہوگا یا نہیں؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ عذاب قبر قیامت تک برابر ہوتا رہے گا یا منقطع ہو جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عذاب قبر کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ جو دائم رہے گا اور دوسرے وہ جو ایک مدت تک رہنے کے بعد ختم ہو جائے گا، یہ ان نافرمان بندوں کا عذاب ہوگا جن کے جرائم ہلکے ہوں گے کہ ان کے جُرم کے مطابق سزا دے کر تخفیف کر دی جائے گی۔

موت کے بعد قیامت تک ارواح کا مستقر کہاں ہے؟

اس میں کافی اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ ارواح مومنین جنت میں اور ارواح کافرین دوزخ میں رہتی ہیں، اور بعض نے کہا کہ ارواح مومنین جنت کے دروازے کے سامنے میدان میں رہتی ہیں، جہاں ان کے پاس جنت کی ہوائیں اور نعمتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں، اور امام مالکؒ نے فرمایا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ روح چھٹی رہتی ہے جہاں چاہتی ہے جاتی ہے، اور ایک جماعت کا قول ہے کہ ارواحِ مومنین اللہ تعالیٰ کے پاس رہتی ہیں۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ارواحِ مومنین دمشق کے مقامِ جابیہ میں اور ارواحِ کافرین شہر حضرموت کے کنویں برہوت میں رہتی ہیں، اور کعبؓ نے کہا کہ مومنین کی ارواح ساتویں آسمان میں مقام علیین میں اور کافروں کی ارواح ساتویں زمین میں ابلیس کے رُخسار کے نیچے مقام سجّین میں رہتی ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ ارواحِ مومنین زمزم میں اور ارواحِ کافرین چاہِ برہوت میں اور ایک قول یہ ہے کہ مومنین کی ارواح حضرت آدمؑ کے دائیں جانب اور ارواحِ کُفاران کے بائیں جانب رہتی ہیں، اور ابن عبدالبرؒ نے کہا کہ

شہداء کی ارواح جنت میں اور عام مومنین کی اپنی قبروں کے میدان میں رہتی ہیں اور ابن شہاب سے روایت ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کی طرح عرش سے معلق رہتی ہیں صبح وشام جنت کی کیاریوں میں جاتی ہیں، ہر دن اپنے پروردگار کے پاس آکر سلام کرتی ہیں وغیرہا من الاقوال۔(از شرح العقیدۃ الطحاویہ)

عقیدۂ طحاویہ کے شارح لکھتے ہیں کہ ان اقوال کے دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ برزخ میں ارواح کے درجات میں تفاوت ہوگا اور کافی تفاوت ہوگا اور اسی کے لحاظ سے ان کے مقامات ومنازل میں بھی تفاوت ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

قوله:"ونؤمن بالبعث وجزاءِ الاعمال يومَ القيامة والعرضِ والحسابِ وقراءةِ الكتاب والثوابِ والعقابِ والصراطِ والميزانِ.

ترجمہ: اور ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور قیامت کے دن اعمال کی جزاء اور پیشی اور حساب اور اعمال نامہ کے پڑھنے اور ثواب وعذاب اور پُل صراط اور میزان پر ایمان رکھتے ہیں۔

تشریح: بعث کی تفصیل:۔

"ونؤمن بالبعث" اس مسئلہ پر کافی روشنی یومِ آخرت کی بحث میں ڈالی جاچکی ہے، دوبارہ زندگی کے اثبات میں قرآن وسنت کی نصوص بے شمار ہیں جن کا احاطہ مقصود نہیں قرآن حکیم سے صرف سورۂ حج کی آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

يآ أيُّهاالنّاسُ اِن كُنتُم فِي رَيبٍ مِنَ البَعثِ فَاِنّا خَلَقنَا كُم مِن تُرابٍ ثُمَّ مِن نُطفَةٍ ثُمَّ مِن عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُضغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُم وَنُقِرُّ فِي الارحَامِ مَانَشَاءُ اِلىٰ اَجَلٍ مُسَمّىً ثُمَّ نُخرِجُكُم طِفلاً ثُمَّ لِتَبلُغُوا اَشُدَّكُم وَمِنكُم مَن يُتَوَفّىٰ وَمِنكُم مَن يُرَدُّ اِلىٰ اَرذَلِ

الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ج وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ"۔(الحج:۵۔۷)

(اے لوگو! اگر تم دوبارہ زندہ ہونے سے شک میں ہو تو ہم نے تم کو مٹی سے بنایا پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے جو پوری بھی ہوتی ہے اور ادھوری بھی تا کہ ہم تمہارے سامنے ظاہر کر دیں اور ہم رحم میں جس کو چاہتے ہیں ایک مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تم کو بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں پھر تا کہ تم اپنی بھری جوانی تک پہنچ جاؤ اور بعض تم میں وہ بھی ہیں جو مر جاتے ہیں اور بعض تم میں وہ ہے جو نکمی عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے جس کا اثر یہ ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے اور اے مخاطب! تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے یہ اس سبب سے ہوا کہ اللہ تعالی ہی ہستی میں کامل ہے اور وہی بے جانوں میں جان ڈالتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے اور قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالی قبر والوں کو دوبارہ پیدا کر دے گا۔)

پس جس طرح انسان اپنی پہلی پیدائش میں نطفہ، علقہ اور مضغہ وغیرہ مختلف احوال واطوار سے گزرتا ہوا ایک تنومند جوان بن گیا، اسی طرح اپنی دوسری پیدائش (بعث) میں بھی بوسیدہ اور فنا ہو جانے کے بعد زندہ ہو جائے گا، چنانچہ حدیث صحیح میں روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کل ابن ادم یبلی الّا عجب الذ نب منه خلق ابن اٰد م ومنه یُر کب"(رواہ البخاری ومسلم واحمدواللفظ له)

(ابن آدم کا ہر جزو بوسیدہ ہوجائے گا سوائے دُم کی جڑ والی ہڈی کے اسی سے ابن آدم پیدا کیا گیا اور اسی سے ترکیب دیا جائے گا۔)

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

"ان السماء تمطرمطراً کمنی الرجال ینبتون فی القبور کماینبت النبات"(ضعیف اخرجه الطبرانی فی المعجم الکبیر)

(بلاشبہ آسمان سے مینہ مردوں کی منی کی طرح برسے گا، لوگ قبروں میں اس طرح اُگیں گے جس طرح گھاس اُگتی ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز جو لوگ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے وہ درحقیقت اسی پہلے ہی مادّہ سے ہوگا کہ سارا جسم بوسیدہ ہوجانے کے باوجود "عَجْبُ الذنب" (دُم کی جڑ کی ہڈی) باقی رہے گی پھر اس کے تمام اجزاء کا اعادہ کردیا جائے گا۔ البتہ اس پہلی دُنیوی پیدائش اور اس دوسری اُخروی پیدائش میں بلحاظ صفات کے اور بالخصوص اہل جنت کی صفات کے بہت فرق ہوگا، سب سے بڑا فرق تو یہی ہوگا کہ یہ پیدائش فنا ہوجانے والی اور ہمہ وقت آفات ومصائب کا شکار ہے اور وہ پیدائش باقی رہنے والی اور ہر طرح کی خرابی سے پاک ہوگی۔

"وجزاء الاعمال" سورۂ فاتحہ کی آیت ہے: "مالك یوم الدین" (جزاء کے دن کا مالک) الدین کے معنی جزاء اور بدلہ کے ہیں، عربی کہاوت ہے: "کماتَدِین تُدان" (جیسی کرنی ویسی بھرنی) اور ارشاد فرمایا:

مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَن جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰىٓ اِلَّا مِثْلَهَا وَهُم لَا يُظْلَمُونَ۔ (الانعام:۱۶۰)

(جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنے ملیں گے اور جو شخص بُرے کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی اور ان لوگوں پر ظلم نہ ہوگا)۔

اور ان کے علاوہ بہت سی آیات واحادیث جزاء وسزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

حساب اور پیشی:۔

"والعرض والحساب الخ" ارشاد فرمایا:

"وَعُرِضُوا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا لَقَد جِئتُمُونَا كَمَا خَلَقنَاكُم اَوَّلَ مَرَّةٍ"۔ (الکھف:۴۸)

(اور سب کے سب آپ کے رب کے روبرو برابر کھڑے کر کے پیش کئے جائیں گے، دیکھو آخر تم ہمارے پاس ہی آئے جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا)۔

اور ارشاد فرمایا:

فَاَمَّا مَن اُوتِیَ كِتَابَهُ بِيَمِينِه فَسَوفَ يُحَاسَبُ حِسَاباً يَّسِيراً وَيَنقَلِبُ اِلٰى اَهلِه مَسرُوراً وَاَمَّا مَن اُوتِیَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهرِه فَسَوفَ يَدعُوا ثُبُوراً وَيَصلٰى سَعِيراً اِنَّهُ كَانَ فِی اَهلِه مَسرُوراً اِنَّهُ ظَنَّ اَن لَّن يَّحُورَ"۔ (الانشقاق:۸۔۱۴)

(تو جس شخص کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا سو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا اور جس شخص کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے ملے گا سو وہ موت کو پکارے گا اور جہنم میں داخل ہوگا یہ شخص (دُنیا میں) اپنے متعلقین میں خوش رہا کرتا تھا اس نے خیال کر رکھا تھا کہ اس کو لوٹنا نہیں ہے)۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لَيسَ احد يحاسب يوم القيامة الاهلك فقلت يارسول الله! اليس قد قال الله تعالى فَاَمَّا مَن اُوتِيَ كِتابه بِيَمينه فَسَوفَ يُحاسَبُ حِسَاباً يَسِيراً فقال رسول الله ﷺ انما ذالك العرض وليس احد يناقش الحساب يوم القيامة الاعُذِّب۔

قیامت کے روز جس سے بھی حساب لیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے کہ جس کو اس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا اس سے آسان حساب لیا جائے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو پیشی ہوگی اور جس سے بھی قیامت کے دن حساب میں کچھ پوچھ گچھ ہوگی اس کو عذاب دیا جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سے حساب میں کچھ بھی پوچھ گچھ ہوئی تو بس وہ عذاب میں مبتلا ہو کر رہے گا، یوں اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے اور درگزر کرنے والے ہیں۔

پُل صراط:۔

"والصراط" جب لوگ موقِف سے چلیں گے تو ایک تاریکی ملے گی اور اس تاریکی کے بعد جہنم کے اوپر ایک پُل ہوگا وہی "صراط" ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جب زمین اور آسمان بدل جائیں گے تو لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: "ھم فی الظلمة دون الجسر" (پُل صراط سے پہلے ظلمت میں ہوں گے) اور اسی مقام پر منافقین مومنین سے علیحدہ ہو جائیں گے، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور مومنین آگے بڑھ جائیں گے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل ہو جائے گی جس کی وجہ سے منافقین مومنین کے پاس نہ پہنچ پائیں گے۔ اور لوگوں کو بقدر ان کے اعمال کے نور عطا ہوگا کسی کو پہاڑ کے برابر اور کسی کو اس سے بھی زیادہ اور کسی کو کھجور کے درخت کے برابر اور کسی کو اس سے کم، سب سے کم نور جس کو ملے گا وہ وہ ہوگا جس کو اس کے پیر کے

انگوٹھے پر نور ملے گا جو کبھی روشن ہوگا اور کبھی بُجھ جائے گا، جب چمکے گا تو وہ ایک قدم چلے گا اور جب بجھ جائے گا تو کھڑا ہو جائے گا، اس طرح لوگ پُل صراط پر سے گزریں گے جو تلوار کی دھار کی طرح اور پھسلن والا ہے، پھر ان کو حکم ہوگا کہ اپنے اپنے نور کے مطابق پُل پار کرو تو بعض لوگ اس طرح پار کر جائیں گے جس طرح ستارہ ٹوٹتا ہے اور بعض ہوا کی طرح گزر جائیں گے اور بعض پلک جھپکنے کی طرح اور بعض کاندھے ہلاتے ہوئے تیز چلیں گے الغرض اپنے اپنے عمل کے لحاظ سے گزریں گے یہاں تک کہ جس شخص کے پیر کے انگوٹھے پر نور ہوگا وہ اس حال میں گزرے گا کہ ایک ہاتھ گرے گا ایک ہاتھ لٹکا رہے گا، ایک پیر گرے گا ایک پیر لٹکا رہے گا اور اس کے اطراف کو آگ پہنچ جائے گی۔ اس طرح سب نجات پا جائیں گے۔ جب سب لوگ نجات پا جائیں گے تو کہیں گے:

-الحمد لله الذی نجانا منك بعد ان ارانكِ لقد اعطانا الله مالم یُعط احدٌ۔

(تمام تعریفیں اس اللہ کو سزاوار ہیں جس نے ہم کو تجھ سے نجات دی بعد اس کے کہ ہم کو تجھے دکھلایا، اللہ نے ہم کو وہ کچھ عطا فرمایا جو کسی کو عطا نہ فرمایا)۔(از حدیث بیہقی بحوالہ شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص:۴۶۹)

میزان:۔

"المیزان" معتزلہ نے میزان اور وزنِ اعمال کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد فیصلہ میں عدل وانصاف کرنا ہے یا اعمال کا بدلہ دینا مراد ہے کیونکہ اعمال اعراض ہیں اور عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا بلکہ معدوم ہو جاتا ہے اور وزن کرنے کے لئے اس معدوم کا اعادہ لازم ہے جو محال ہے۔ لیکن وہ بیچارے اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن، حق تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں چنانچہ اہل سنت والجماعت حسب تصریح کتاب وسنت اس کے قائل ہیں۔

ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

"وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِيْنَ"۔ (الانبیاء:۴۷)

(اور قیامت کے روز ہم میزانِ عدل قائم کریں گے سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا اور اگر عمل رائی کے برابر بھی ہوگا تو ہم اس کو حاضر کردیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں)۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ علماء فرماتے ہیں کہ جب حساب ہو چکے گا تب اعمال تولے جائیں گے کیونکہ وزن جزاء دینے کے لئے ہوگا لہذا یہ حساب کے بعد ہی ہونا چاہئے اس لئے کہ حساب تقریر اعمال کے لئے ہے اور وزن مقادیر اعمال کے اظہار کے لئے تا کہ جزاء مقادیر اعمال کے موافق ہو۔ اور فرمایا کہ "وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ" میں یہ بھی احتمال ہے کہ متعدد ترازو ہوں جن پر اعمال تولے جائیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ موازین صیغہ جمع کے ساتھ باعتبار موزونات کے آیا ہو اس لحاظ سے کہ جو اعمال تولے جائیں گے وہ مختلف اقسام کے ہوں گے۔ واللہ اعلم (انتہی کلام القرطبی از شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص: ۴۷۲)

میزان عمل حسّی ترازو ہے:۔

نیز احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ میزانِ عمل حسّی ترازو ہوگی جس کے دو پلڑے ہوں گے جو محسوس اور مشاہد ہوں گے چنانچہ بہت سی احادیث میں اس کے لئے "كِفَّة" (پلڑا) کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ایک طویل حدیث کا ایک شہ پارہ ہے "فتوضع السجلات في كفة والبطاقة في كفة" (سارے رجسٹر ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں گے اور پرچہ ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا)۔

وزنِ اعمال کس طرح ہوگا:۔

اس میں اختلاف ہے کہ اعمال کے وزن کی کیفیت کیا ہوگی؟ بعض نے کہا کہ وزنِ

اعمال سے مراد یہ ہے کہ صحائف اعمال تولے جائیں گے اور بعض نے کہا کہ اعمال ہی تولے جائیں گے اور شارحِ عقیدۂ طحاویہ نے لکھا ہے کہ اعمال، عامل اور صحائفِ اعمال تینوں ہی تولے جائیں گے۔

معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے تھے کہ بے شمار روایات حدیث اس پر شاہد ہیں کہ یہی اعمال دنیا آخرت کی جزا و سزا بن جائیں گے، ان کی شکلیں وہاں بدل جائیں گی، بُرے اعمال جہنم کی آگ اور سانپ اور بچھو بن جائیں گے، احادیث میں ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والوں کا مال قبر میں ایک بڑے سانپ کی شکل میں آکر اس کو ڈسے گا اور کہے گا ''انا مالك'' (میں تیرا مال ہوں) نیک عمل ایک حسین آدمی کی شکل میں انسان کو قبر کی تنہائی میں وحشت دور کرنے کے لئے اُنس دلائے گا۔ (معارف القرآن: ج:۵ ص:۵۵۵)

اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آیت: ''وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا'' (جو اعمال انہوں نے کئے ہیں اُن کو موجود پائیں گے) کی مشہور تفسیر تو یہ ہے کہ ''مکتوب فی الصحیفۃ (نامہ اعمال میں لکھا ہوا) مگر حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ خود اعمال حاضر ہوں گے جیسا کہ ظاہر الفاظ ''وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا'' سے معلوم ہوتا ہے یعنی قیامت کے روز سارے اعمال کو حاضر پائیں گے، اس پر اشکال یہ ہے کہ جو اعمال ختم ہو چکے وہ کیسے عود کریں گے؟

محقق دوانی نے اسے اس طرح رفع کیا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالہ ''زوراء'' میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں۔

یہ رسالہ حضرت نے میرے پاس بھیجا تھا شاید بھیجنے سے یہ مقصود ہو کہ ان کی تحقیق حضرت کو پسند آئی ہو، واللہ اعلم۔ میں اس کو یقینا کہہ نہیں سکتا کیونکہ کچھ فرمایا نہیں، میں نے اس رسالہ کو دیکھا میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آئی کہ حقائق اعمال کے جوہر ہیں، ہاں اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ معنی مصدری قیامت میں نہ ہوں گے بلکہ حسب تحریر مولانا یعقوب صاحبؒ

ان اعمال کے آثار قیامت کے روز شکلیں بن کر اہل محشر کو نظر آئیں گے مثلاً جو چوری کرتا ہے وہاں نظر آئے گا کہ چوری کر رہا ہے، جو زنا کر چکا ہو وہاں نظر آئے گا کہ زنا کر رہا ہے، غرض جو آثار اعمال کے اس کے بدن میں جمع ہیں سب وہاں اعمال بن کر نظر آئیں گے۔ اس کی مثال یہاں بھی خدا نے پیدا کر دی ہے یعنی جس طرح بائیسکوپ میں گذشتہ واقعات کی صورتیں نظر آتی ہیں اسی طرح قیامت کے دن یہ بھی بائیسکوپ بن جائے گا اور اس کے ہاتھ پیر گراموفون کی طرح جو کچھ اس نے کیا ہے بولیں گے، انتہیٰ۔

(روح القیام: ص:۴۱، ۴۲، مطبوعہ الٰہ آباد)

میزان پُل صراط سے پہلے ہوگی:۔

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ حوض میزان سے پہلے ہوگا اور پُل صراط میزان کے بعد ہوگا، صحیحین میں روایت ہے کہ مومنین جب پُل صراط پار کرلیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پُل پر کھڑے ہوجائیں گے اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے بدلہ لیا جائے گا پھر جب وہ صاف ستھرے کر دیئے جائیں گے تو ان کو دخولِ جنت کی اجازت دی جائے گی۔ امام قرطبیؒ نے اس کو پُل صراط کے علاوہ دوسرا پُل مانا ہے جو صرف مومنین کے لئے ہوگا اور اس سے کوئی بھی گر کر دوزخ میں نہیں جائے گا۔ واللہ اعلم (از شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص:۴۷۵)

قوله: "والبعث هو حشرُ الاجساد واحياءها يوم القيامة. والجنة والنار مخلوقتان لاتفنيان ابداً ولاتبيدان وان الله تعالى خلق الجنة والنار قبل الخلق وخلق لهما اهلاً فمن شاء منهم للجنة فضلاً منه ومن شاء منهم للنار عدلاً منه وكل يعمل لما فرغ منه وصار الى ما خُلق له والخير والشر مُقدّران على العباد".

ترجمہ: اور بعث قیامت کے دن جسموں کو جمع کرنا اور ان کو زندہ کرنا ہے، اور جنت اور جہنم دونوں پیدا ہو چکی ہیں جو کبھی فنا نہ ہوں گی، اللہ تعالی نے مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے جنت اور جہنم کو پیدا فرمایا اور ان دونوں کے لئے ان کے اہل کو بھی پیدا فرمایا، پس جس کو چاہے گا اپنے فضل سے جنت میں داخل فرمائے گا اور جس کو چاہے گا اپنے عدل سے جہنم میں داخل فرمائے گا اور ہر آدمی وہی کرے گا جو اس کے لئے مقدر ہو چکا ہے اور اسی کی طرف جائے گا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے اور خیر و شر بندوں کے لئے مقدر ہو چکے ہیں۔

تشریح: افناء اور اعادہ کی کیفیت میں علماء کا اختلاف:۔

''والبعث الخ'' یعنی اللہ تعالی قیامت کے روز اجسام کو دوبارہ زندہ فرمائیں گے اجسام کو فنا کرنے اور پھر ان کو دوبارہ پیدا کرنے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) افناء یعنی فناء کرنے سے مراد اجزاء جسم کی تفریق ہے اور اعادہ یعنی دوبارہ پیدا کرنے سے مراد انہیں اجزاء متفرقہ کا مجتمع کر دینا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ابراہیمؑ نے دعا کی ''رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحي المَوتیٰ'' (میرے پروردگار مجھے دکھادے تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرے گا) تو اللہ تعالی نے ان کو حکم دیا کہ وہ چار پرندے لے لیں اور ان کے اجزاء کو کاٹ کر پہاڑوں پر متفرق کر دیں پھر ان کو بلائیں، انہوں نے ایسا ہی کیا تو پرندوں کے سب اجزاء مجتمع ہو گئے اور پھر سے پرندے بن گئے، اس مذہب کی بناء پر حشر معدوم کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اجزاء متفرقہ موجودہ کا جمع کر دینا ہے۔

(۲) یہ کہ افناء سے مُراد اجسام کو معدوم کر دینا اور بعث سے مُراد اس کو دوبارہ وجود میں لانا ہے۔ ان کی دلیل اللہ کا یہ ارشاد ہے کہ ''كُلُّ مَن عَلَيها فَانٍ وَيَبقىٰ وَجهُ رَبِّكَ ذُو الجلالِ والاِكرامِ۔

(۳) تیسرا مذہب توقف کا ہے۔ وقد مر بعض التفاصیل فیما سبق۔

(نبراس: ص:۲۱۱)

جنت اور دوزخ پیدا ہو چکی ہیں:۔

"والجنة والنار الخ" اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق اس وقت جنت اور جہنم پیدا ہو چکی ہیں، اور معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں قیامت کے دن پیدا کی جائیں گی، وہ کہتے ہیں کہ جزاء وسزا سے پہلے ان کا پیدا کرنا فعلِ عبث ہے کیونکہ اس صورت میں ایک زمانہ دراز تک ان کا یوں ہی معطل اور بیکار پڑا رہنا لازم آتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ اللہ تعالی کی حکمتوں کا احاطہ انسانی قدرت سے باہر ہے قبل جزاء ان کی تخلیق میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی کیا کیا حکمتیں ہیں جو ہماری ناقص عقل وفہم سے بالا ہیں۔

اہل سنت فرماتے ہیں کہ قرآن وسنت کی بے شمار نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ودوزخ پیدا کی جا چکی ہیں، منجملہ ان کے یہ ارشاد پاک ہے: "أُعِدَّت لِلْمُتَّقِين" (پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے) اور فرمایا: "أُعِدَّت لِلْكافِرِينَ" (کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے) اور فرمایا: "اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَت مِرصَاداً لِلطَّاغِينَ مَاباً۔ (النباء: ۲۱، ۲۲) (بے شک دوزخ گھات کی ایک جگہ ہے سرکشوں کا ٹھکانا ہے) اور ارشاد فرمایا: "وَلَقَد رَاٰهُ نَزلَةً أُخرىٰ عِندَ سِدرَةِ المُنتَهىٰ عِندَهَا جَنَّةُ المَأْوىٰ" (النجم: ۱۳۔۱۵) (اور انہوں نے (پیغمبر نے) اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کے قریب جنت المأویٰ ہے)۔

اور صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے واقعہ اسراء والی حدیث کے آخر میں روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

"ثم انطلق بی جبرائیل حتی اتی سدرۃ المنتہیٰ فغشیها

الوان لا ادری ماھی قال ثم دخلت الجنة فاذاھی جنابذ
اللؤلؤ واذاترابھاالمسك"۔ بخاری ومسلم
(پھر جبرئیلؑ مجھ کو لے کر چلے یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس آئے
تو اس کو مختلف رنگوں نے ڈھانپ رکھا تھا جن کی حقیقت میں نہیں
جانتا، آپ نے فرمایا پھر میں جنت میں داخل ہوا تو وہ موتی کے شگوفے
تھے اور اس کی مٹی مشک کی تھی۔)

نیز حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ان احدکم اذامات عرض علیه مقعده بالغداة والعشی
ان کان من اهل الجنة فمن اهل الجنة وان کان من اهل
النار فمن اهل النار یقال هذا مقعدك حتی یبعثك الله
یوم القیامة"۔ رواہ البخاری ومسلم۔
(جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے سامنے صبح وشام اس کا
ٹھکانا پیش کیا جاتا ہے اگر اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو اہل جنت کا اور
اگر اہلِ جہنم میں سے ہوتا ہے تو اہلِ جہنم کا، اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا
ٹھکانا یہاں تک کہ اللہ تجھ کو قیامت کے دن اُٹھائے۔)

اور صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"وایم الذی نفسی بیده لو رأیتم ما رأیت لضحکتم
قلیلاً وبکیتم کثیراً قالوا وما رأیت یارسول الله! قال
رأیت الجنة والنار"۔
(قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم وہ چیز دیکھ
لو جس کو میں نے دیکھا ہے تو ہنسو کم اور روؤ زیادہ، لوگوں نے عرض کیا کہ
اے اللہ کے رسول! آپ نے کیا دیکھا؟ فرمایا جنت اور جہنم کو دیکھا۔)

اوران کے علاوہ بھی بہت سی آیات قرآنیہ اوراحادیث اس مضمون کی موجود ہیں فلیتد بر۔اور پھر یہ کہ حضرت آدمؑ وحواؑ کا قصہ جس جنت سے نکلنے کا پیش آیا ہے وہ جنت بھی ائمہ سلف کے نزدیک یہی جنت موعودہ ہے، پس اگر یہ جنت موجود نہ ہوتی تو ان دونوں حضرات کے اس سے نکالے جانے کا کیا سوال ہوتا ہے؟

معتزلہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ جنت اسی زمین کے باغات میں سے تھی جو ملک شام یا عراق یا فارس اور کرمان کے درمیان تھی، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آدم وحوا بغیر کوئی عمل کئے ہوئے جنت میں کیسے چلے گئے جبکہ دخولِ جنت کے لئے عمل ضروری ہے لیکن ان کے یہ دونوں اعتراضات اس لئے صحیح نہیں ہیں کہ بقول علمائے محققین اس پر سلف کا اتفاق ہے کہ وہ جنت ارضی نہیں تھی بلکہ جنت موعودہ تھی لہذا اس اتفاق کے ہوتے ہوئے معتزلہ کا قول مسموع نہیں۔

اور دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ایمان اعظم حسنات ہے جو ان دونوں حضرات کو حاصل تھا اور وہ دخولِ جنت کے لئے کافی ہے نیز حور وغلمان بھی جنت میں ہوں گے حالانکہ انہوں نے کوئی عمل نہیں کیا ہے۔

جنت وجہنم کو فنا نہیں:۔

"لا تفنیان ابداً ولا تبیدان الخ" جمہور سلف وخلف کا مذہب یہی ہے کہ جنت ودوزخ کبھی فنا نہ ہوں گی اور اسی طرح جنتی وجہنمی بھی کبھی فنا نہ ہوں گے اور فرقہ جہمیہ کہتا ہے کہ جنت ودوزخ اور اسی طرح ان کے رہنے والے ایک وقت پر سب فنا ہو جائیں گے لیکن صحابہ وتابعین اور ائمہ مسلمین میں سے کوئی اس کا قائل نہیں ہے۔

اسی طرح شیخ المعتزلہ ابوالہذیل العلاف کا یہ قول بھی کتاب وسنت اور اجماع اُمت کے خلاف اور بلا دلیل ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی حرکت منقطع ہو جائے گی اور یہ سب کے سب جمود دائم کے شکار ہو جائیں گے۔ان لوگوں کا استدلال فلسفہ کے اِن اصول ومسلمات واہیہ وخرافیہ سے ہے جو نصوص کتاب وسنت کے

منافی اوران سے متصادم ومتعارض ہونے کے سبب نہ صرف یہ کہ قابلِ تسلیم نہیں ہیں، بلکہ اپنی ذات سے بھی غیر معقول ہیں۔والتفصیل فی المطولات۔

ابدیت جنت:۔

جنت کی ابدیت پر اہلِ سنت کے دلائل یہ ہیں: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"وَاَمَّا الذین سُعِدُوا فَفِی الجنۃِ خالدین فیہامادامتِ السموٰاتُ والارضُ اِلّامَاشآءَ رَبُّكَ عَطآءً غیرَ مَجذُوذٍ"۔

(ھود:۱۰۸)

(اور رہ گئے وہ لوگ جو سعید ہیں سو وہ جنت میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ہاں اگر خدا ہی کو منظور ہو تو دوسری بات ہے وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا)۔

آیت میں "اِلّامَاشآءَ رَبُّكَ" کا استثناء ان لوگوں کے لئے ہے جو جہنم میں داخل کرنے کے بعد پھر اس سے نکالے جائیں گے، تمام لوگوں کے لئے نہیں ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مُراد وہ وقفہ ہے جتنی دیر موقف میں رہیں گے اور بعض نے کہا کہ وہ مدت مراد ہے جو وہ قبر اور موقف میں گزاریں گے۔اور بعض نے کہا کہ یہاں پر ما بمعنی "من" ہے اور مطلب یہ ہے کہ "الامن شاء اللہ دخولہ النار بذنوبہ من السعداء" یعنی اللہ تعالیٰ سعداء میں سے جس کو اس کے گناہوں کے سبب جہنم میں داخل کرنا چاہیں گے۔وغیرہا من الاقوال۔

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ ھٰذَالَرِزقُنَامَالَہٗ مِن نَّفَادٍ"۔(ص:۵۴)
(بے شک یہ ہماری عطا ہے اس کا کہیں ختم بھی نہیں)۔

اور فرمایا:

"اُکُلُھَادَآئِمٌ وَّظِلُّھَا"۔(الرعد:۳۵)

(اس کا پھل اور اس کا سایہ دائم رہے گا)۔

اور فرمایا:

"وَمَا هُم مِنها بِمُخرَجِينَ"۔ (الحجر:۴۸)

(اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے)۔

اور صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

"من يدخل الجنة ولا يبأس ويخلد ولا يموت"۔

(جو جنت میں داخل ہو جائے گا وہ خوش عیش رہے گا تنگیٔ عیش میں مبتلا نہ ہوگا اور ہمیشہ رہے گا اس کو موت نہیں آئے گی۔)

بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان موت کو ذبح کر دیا جائے گا اور کہا جائے گا:

"یا اهل الجنة خلود ولا موت ویا اهل النار خلود فلا موت"۔

اے جنت والو! اب ہمیشہ رہو موت نہیں آئے گی اور جہنم والو! ہمیشہ رہو اب موت نہیں آئے گی۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

"ينادي مناد: يا اهل الجنة إن لكم أن تصحوا فلا تسقموا ابداً وأن تشبوا فلا تهرموا ابداً وان تحيوا فلا تموتوا ابداً"۔

ایک پکارنے والا پکارے گا کہ اے اہل جنت! بے شک تمہارے لئے یہ ہے کہ تم تندرست رہو اور کبھی بیمار نہ ہو اور یہ کہ تم جوان رہو، کبھی بوڑھے نہ ہو اور یہ کہ تم زندہ رہو اور کبھی مرو نہیں۔

ابدیت جہنم:۔

اس میں آٹھ اقوال ہیں:

(۱) جو جہنم میں داخل ہو جائے گا وہ اس سے کبھی بھی نہ نکلے گا، یہ خوارج اور معتزلہ

کا قول ہے۔

(۲) اہل جہنم اس میں عذاب پاتے رہیں گے پھر ان کی طبیعت ہی آتشیں ہو جائے گی اور ان کو اسی میں لذّت محسوس ہو گی، یہ ابن عربی کا قول ہے۔

(۳) ایک معین وقت تک اس میں عذاب پاتے رہیں گے پھر نکال لئے جائیں گے اور ان کے بعد دوسرے لوگ داخل کئے جائیں گے، یہ یہود کا قول ہے۔

(۴) سب اہلِ جہنم نکالے جائیں گے اور جہنم یوں ہی خالی پڑی رہے گی۔

(۵) فنا ہو جائے گی، یہ جہمیہ کا قول ہے ان کے نزدیک جنت بھی فنا ہو جائے گی۔

(۶) اس میں رہنے والوں کی حرکات فنا ہو جائیں گی اور سب جماد ہو جائیں گے، تکلیف محسوس نہ کریں گے، یہ ابو الہذیل العلّاف کا قول ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اس سے نکال دیں گے، اور کچھ زمانہ تک اس کو باقی رکھیں گے پھر بالکل فنا کر دیں گے کیونکہ اس کی ایک انتہاء ہے، یہ بعض اہلسنت کا قول ہے۔

(۸) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اس سے نکال دیں گے اور کُفّار اس میں ہمیشہ ہمیش باقی رہیں گے جس کی کوئی انتہاء نہیں ہے، وھذا قول جمھور اھل السنة والجماعة۔

ساتواں قول جو بعض اہل سنت کا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہے: ''لَابِثِينَ فِيهَا أَحقَاباً'' [1] (النباء: ۲۳) (جس میں وہ کئی حُقب پڑے رہیں گے) اور قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی یہ دُعا نقل فرمائی ہے: ''رَبَّنَا وَسِعتَ كُلَّ شَيٍ رَحمَةً وَّعِلماً'' (المومن: ۷) (اے پروردگار! آپ کی رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے) اس لئے ناگزیر ہے کہ یہ رحمت ان معذّبین کو بھی شامل ہو، اب اگر یہ لوگ ہمیشہ عذاب ہی میں رہے تو یہ وسعتِ رحمت کے مقتضا کے خلاف ہوگا۔ اور جن آیتوں

---

[1] احقاب حُقب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اسی سال کا زمانہ۔

میں خلود و تابید کا ذکر ہے اس کی توجیہ وہ یہ کرتے ہیں کہ ہم کو یہ خلود و تابید مسلّم ہے لیکن اسی وقت تک جب تک یہ دار العذاب باقی ہے کہ اس مدت میں کوئی کافر اس سے نہ نکالا جائے گا اور جب دار العذاب ہی نہ رہ جائے گا تو پھر تعذیب بھی نہ رہے گی۔

آٹھویں قول کے قائلین کا استدلال یہ آیت ہے: ''وَمَاهُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ '' (البقرہ:۱۶۷) (اوران کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا) اور اللہ تعالی نے فرمایا: ''وَلَا يَدخُلُونَ الجنةَ حتىٰ يَلِجَ الجملُ فی سَمِّ الخِيَاطِ '' (الاعراف:۴۰) (اور وہ لوگ کبھی جنت میں نہیں جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے کے اندر سے نہ چلا جائے) وغیرھا من الآیات ۔ اوران احادیث سے جن میں یہ ہے کہ جو شخص ''لا الہ الا اللہ'' کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا نیز احادیث شفاعت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ عصاۃ مومنین جہنم سے نکالے جائیں گے اور یہ حکم انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اب اگر کفار بھی دوزخ سے نکالے جائیں گے تو اس میں اہلِ ایمان کی کیا خصوصیت رہ جائے گی؟ اور پھر یہ کہ جنت و جہنم کا دوام و بقاء ان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی کے باقی رکھنے سے وہ باقی رہیں گے، فلا اشکال۔

وخلق لها اهلاً، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ''وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيراً مِنَ الجِنِّ والانس '' (الاعراف:۱۷۹) (اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں) نیز رسول اللہ ﷺ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ:

"اِنّ اللہَ خلق للجنۃ اھلاً خلقھم لھا وھم فی اصلاب آبائھم وخلق للنار اھلاً خلقھم لھا وھم فی اصلاب آبائھم"۔ رواہ مسلم وابوداؤد والنسائی

(اللہ نے جنت کے لئے کچھ لوگوں کو پیدا کیا ہے ان کو اس کے لئے پیدا کیا حالانکہ وہ اپنے باپوں کی صلب میں تھے اور دوزخ کے لئے کچھ لوگوں کو پیدا کیا ہے، ان کو اس کے لئے پیدا کیا حالانکہ وہ اپنے باپوں کی

صلب میں تھے۔)

"فمن شاء منهم الی الجنة فضلاً منه الخ" یہ مقدمہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو ثواب سے اسی وقت محروم فرماتے ہیں جب اس کے حصول کے سبب یعنی عمل صالح سے محروم کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

"وَمَن يَعمَل مِنَ الصَّالحات وَهُوَمُؤمِنٌ فَلايَخَافُ ظُلماً وَلَاهَضماً". (طه:۱۱۲)

(اور جس نے نیک کام کئے ہوں گے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا سو اس کو نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا اور نہ کمی کا)۔

اور اسی طرح کسی کو عذاب کا مستحق اُسی وقت گردانتے ہیں جب وہ عذاب کے سبب کا مرتکب ہوتا ہے، ارشاد ہے:

"وَمَآ اَصَابَكُم مِن مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَت اَيدِيكُم وَيَعفُوا عَن كَثِير". (الشوریٰ:۳۰)

(اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سی تو وہ درگذر ہی کر دیتا ہے۔)

اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی معطی اور مانع ہیں، پس جس کو چاہتے ہیں دولتِ ایمان سے سرفراز فرماتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں کُفر وشرک اور ضلالت وگمراہی میں مبتلا رہنے دیتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی حکمت وعدل کے تقاضے سے ہے کہ ۔ کفر ہم نسبت بخالق حکمت است۔ پس اللہ تعالیٰ اگر کسی کو ایمان اور اعمال صالحہ کی نعمتوں سے سرفراز فرمادیں تو یہ ان کا فضل ہے اور اگر کسی کو اس سے محروم رکھیں تو یہ ان کا عدل ہے اور اس میں بھی ان کی حکمت ہے، لیکن جب کسی کو اسبابِ ثواب یا اسبابِ عذاب حاصل ہوجائے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے مسببات کو نہیں روکتے۔

قوله: "والاستطاعة اللتی یوجد بها الفعل نحوَ التوفیق

الذی لایجوزان یوصف المخلوق به فهی مع الفعل واما الاستطاعة من جهة الصحة والوسع والتمکن وسلامة الآلات فهی قبل الفعل وبها یتعلق الخطاب وهو کما قال الله تعالی لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفساً اِلَّا وُسعَهَا".

ترجمہ: اور وہ استطاعت کہ جس سے فعل واجب ہوتا ہے جیسے توفیق کہ اس سے مخلوق کو متصف ہی نہیں کیا جاسکتا، وہ استطاعت فعل کے ساتھ ہوتی ہے اس فعل سے پہلے اس کا وجود نہیں ہوتا، اور وہ استطاعت جو صحت، وسعت، قدرت اور آلات واسباب کی سلامتی کے اعتبار سے ہوتی ہے تو یہ استطاعت فعل سے پہلے پائی جاتی ہے اور اللہ تعالی کا خطاب اسی استطاعت سے متعلق ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے "اللہ تعالی کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو"۔

تشریح: مسئلہ استطاعت:۔

استطاعت، طاقت، قدرت اور وسع یہ سب الفاظ قریب المعنی ہیں، عامہ اہلِ سنت کے نزدیک استطاعت کی دو قسمیں ہیں جیسا کہ متن میں مذکور ہے۔ اور معتزلہ اور قدریہ کے نزدیک قدرت صرف قبل فعل ہوتی ہے فعل کے ساتھ نہیں ہوتی، اس کے مقابلہ میں اہلِ سنت کا ایک طائفہ اس کا قائل ہے کہ قدرت صرف فعل کے ساتھ ہوتی ہے فعل سے قبل نہیں ہوتی "ولکن خیر الامور اوسطها وهو ما ذکره الامام الطحاوی رحمه الله انها تنقسم الی قسمین وسیأتی التفصیل ان شاء الله تعالی۔

متن میں استطاعت کی جو دو قسمیں بیان کی ہیں اور جو عامہ اہلِ سنت کا قول ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بندہ کے اندر ایک قدرت اور استطاعت ایسی ہے جس کی بناء پر وہ احکام کا مکلف ہے اور اسی پر اوامر ونواہی کا مدار ہے، یہ قدرت کبھی فعل سے پہلے ہوتی ہے، اس کا فعل کے ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور وہ قدرت جس کے ذریعہ فعل وجود پذیر ہوتا

ہے وہ فعل کے ساتھ ہی پائی جاتی ہے اور ایسا اس لئے ضروری ہے کہ فعل قدرتِ معدومہ سے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ اور جو قدرت صحت و وسعت اور تمکن وسلامتِ آلات کی جہت سے ہوتی ہے وہ افعال سے مقدم ہوتی ہے، اس آیت شریفہ میں اسی قدرت کا ذکر ہے: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ البَيتِ مَنِ استطاعَ اِلَيه سَبيلاً''۔(ال عمران:۹۷) (اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے یعنی اس شخص کے ذمہ جوکہ طاقت رکھے وہاں تک جانے کی) کہ اللہ تعالی نے مستطیع پر حج واجب فرمایا ہے، اب اگر استطاعت مع الفعل ہی ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مستطیع یعنی حج پر استقامت رکھنے والا وہی ہوگا جو حج کر چکا ہو جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حج اس پر فرض ہے جو حج کر چکا ہے، وھذا خلاف المعلوم بالضرورۃ من دین الاسلام۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَمَن لَم يَستَطِع مِنكُم طَولاً اَن يَنكِحَ المُحصناتِ المؤمناتِ فَمِمَّا مَلَكَت اَيمانُكُم مِن فَتَياتِكُمُ المؤمِناتِ۔

(النساء:۲۵)

(اور جو شخص تم میں پوری وسعت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی مملوکہ ہیں نکاح کرے)۔

کہ یہاں آلات واسباب ہی کی استطاعت مراد ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری آیات ونصوص استطاعت من جہۃ الاسباب والآلات پر دلالت کرتی ہیں جو افعال پر مقدم ہیں۔ اور وہ استطاعت جو حقیقت قدرت اور عین قدرت ہے اس کی دلیل میں اس آیت کا ذکر کیا گیا ہے:

''مَا كَانُوا يَستَطِيعُونَ السمعَ وَما كَانُوا يُبصِرُونَ''۔(ھود:۲۰)

(یہ لوگ سن نہیں سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے)۔

کہ یہاں سننے اور دیکھنے کی حقیقتِ قدرت کی نفی مراد ہے، اس کے اسباب وآلات کی نفی مراد نہیں ہے، کیونکہ اسباب وآلات یعنی گوش، چشم وغیرہ تو ان کے اندر موجود اور ثابت تھے۔ (از شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص:۴۸۸۔۴۹۰)

قولہ "وافعال العباد ھی خلق اللہ وکسبٌ من العباد"۔
ترجمہ: اور بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اور بندوں کے کئے ہوئے ہیں۔

تشریح: افعالِ عباد اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں:۔

افعالِ اضطراریہ غیر اختیاریہ جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں وہ بالاجماع اللہ تعالیٰ کے خلق سے ہیں اس میں اختلاف نہیں ہے۔ محل نزاع بندوں کے افعالِ اختیاریہ ہیں۔ فرقہ جبریہ کا قول یہ ہے کہ مخلوق کے تمام افعال میں تدبیر ہر طرح کی اللہ تعالیٰ کی ہے اور بندے مجبورِ محض ہیں، جس طرح اس شخص کی حرکت غیر اختیاری ہوتی ہے جو مرضِ ارتعاش میں مبتلا ہو، یا جس طرح درخت کے پتے اپنے اختیار سے متحرک نہیں ہوتے اسی طرح بندوں کے تمام افعال ان سے اضطراراً صادر ہوتے ہیں جس میں ان کے اختیار کا کوئی دخل نہیں، ان کی طرف ان افعال کی نسبت مجازی ہے حقیقی نہیں۔ اور بالکل اس کے برعکس فرقہ قدریہ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ حیوانات اپنے تمام افعالِ اختیاریہ کے خالق خود ہیں، اللہ تعالیٰ کے خلق سے اس کا کچھ تعلق نہیں، پھر ان میں باہم اس امر میں اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ افعالِ عباد پر قادر ہے یا نہیں؟

اور اہل سنت والجماعت کا مذہبِ حق یہ ہے کہ افعالِ عباد بلکہ تمام حیوانات کے افعال اللہ تعالیٰ کے مخلوق اور بندوں کے مکسوب ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوقات کے خالق ہیں ان کے سوا کوئی خالق نہیں۔ پس جبریہ نے تو اثباتِ قدر میں اس حد تک غلو کیا کہ بندوں کے افعال ہی کی نفی کر دی اور قدریہ نے قدر کی نفی میں اس قدر غلو کیا کہ بندوں کو ان افعال کا خالق قرار دے کر اللہ تعالیٰ کی خالقیت میں ان کو شریک کر دیا، اسی واسطے وہ "مجوس ھذہ

الامۃ" کے لقبِ بد سے ملقب ہیں کیونکہ مجوس بھی یزداں کو خالقِ خیر اور اہرمن کو خالقِ شر مانتے ہیں اور اس طرح وہ دو خالق کے قائل ہیں۔ اسی طرح یہ بھی سب بندوں کو اپنے اپنے افعال کا خالق مان کر نہ صرف دو بلکہ بہت سے خالق کے قائل لازماً ہوئے۔ لیکن چونکہ اس لزوم کے وہ قائل نہیں ہیں اس بناء پر اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ ہونے کی وجہ سے ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ اور اہل سنت والجماعت نے اس راہِ اعتدال اور صراط مستقیم کو اختیار فرمایا جو اہلِ حق کا طرۂ امتیاز ہے کہ خالق تو تمام "اشیاء ممکنہ" کا اللہ ہے جن میں افعالِ عباد بھی شامل ہیں کیونکہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالی کے ارادہ اور مشیت ہی سے ہوتے ہیں۔ البتہ بندے اپنے افعال کے کاسب ہیں۔

جبریہ کی دلیل:۔

جبریہ کا استدلال قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ہے: "وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى" (الانفال: ١٧) (اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی لیکن اللہ تعالی نے وہ پھینکی) اللہ تعالی نے نبی اکرم ﷺ سے "رمی" (پھینکنے) کی نفی فرمائی اور اپنی ذات کے لئے اس کو ثابت فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کا اپنے افعال میں کچھ دخل نہیں، اسی طرح اس فرقہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اعمال پر جزاء مرتب نہیں ہوتی اور دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "لن یدخل الجنۃ بعملہ" (کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہ ہوگا) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "ولا انت یارسول اللہ" (اے اللہ کے رسول! آپ بھی نہیں) تو آپ نے ارشاد فرمایا "ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ منہ وفضل"۔ رواہ مسلم (اور میں بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالی مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لیں گے)۔

قدریہ کی دلیل:۔

اور فرقہ قدریہ کا استدلال اس آیت شریفہ سے ہے: "فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

الخَالِقِین ''(سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے) نیز وہ جبریہ کے بالکل برخلاف اس کے قائل ہیں کہ جزاء اعمال اس طرح پر مرتب ہوتی ہے جس طرح عوض معوض پر مرتب ہوتی ہے اور دلیل میں آیت :''جَزَاءً بِمَا کَانُوا یَعمَلُونَ'' (السجدہ:۱۷) (یہ ان کو ان کے اعمال کا صلہ ملا ہے) اور اس مضمون کی دوسری آیات کو پیش کرتے ہیں۔

جبریہ کا جواب:۔

فرقہ جبریہ کے اس آیت کریمہ میں ''وَمَارَمَیتَ'' سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت تمہارے دعویٰ کی دلیل نہیں بن سکتی بلکہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ''اِذ رَمَیتَ'' فرما کر رسول اللہ ﷺ کے لئے ''رمی'' کو ثابت فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس کی اللہ تعالیٰ نے نفی فرمائی ہے وہ امر آخر ہے اور جس کو ثابت فرمایا ہے وہ امر دیگر، جس کی توضیح یہ ہے کہ ''رمی'' کی ایک ابتداء ہے اور ایک انتہاء، ابتداء حذف (پھینکنا) ہے اور انتہاء ''اصابہ'' (ٹھیک جگہ پر پہنچ جانا) ہے اور اس ابتداء و انتہاء یعنی حذف و اصابہ دونوں کا نام ''رمی'' ہے اس لئے معنی آیت کے یہ ہوں گے ''وما اصبت اذ حذفت ولکن اللہ اصاب'' (یعنی آپ نے جب خاک پھینکی تو آپ نے اس کو صحیح جگہ پر نہیں پہنچائی بلکہ اللہ نے اس کو صحیح مقام تک پہنچایا)۔ اس لئے کہ اگر آیت کا یہ معنی تسلیم نہ کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ ''وماصلیت اذصلیت ولکن اللہ صلی '' اور ''ماصمت اذ صمت ولکن '' اور ''وماسرقت اذ سرقت'' وغیرہ جس کا نتیجہ ایمان سے ہاتھ دھونے کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب رہا اعمال پر جزاء کے ترتب کا مسئلہ اور جبریہ کا حدیث سے استدلال اور قدریہ کا آیت کریمہ سے استدلال تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں نفی کے لئے جو ''با'' آئی ہوئی ہے وہ ''باسببیہ'' ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ حدیث ''لن یدخل الجنۃ احدٌ بعملہ''

کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کے عوض اور بدلہ میں جنت میں نہیں داخل ہوگا کہ عمل دخولِ جنت کے لئے مثلِ ثمن کے عوض ہو جیسا کہ معتزلہ اس کے قائل ہیں کہ بندہ اپنے عمل کے عوض جنت میں داخل ہوگا، اور آیت: ''جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ''میں باسبب کے لئے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے عمل کے سبب جنت میں داخل ہوں گے، اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالی مسببات کے بھی خالق ہیں اور اسباب کے بھی، لہذا جو بھی جنت میں داخل ہوگا وہ محض اللہ تعالی کے فضل وکرم اور رحمت سے داخل ہوگا۔

قدریہ کا جواب:۔

قدریہ اور معتزلہ کے استدلال ''فتبارک اللہ'' کا جواب یہ ہے کہ ''احسن الخالقین'' کے معنی احسن المصورین المقدرین کے ہیں کیونکہ کبھی ''خلق'' کو ''تقدیر'' کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے اور دلیل اس کی یہ آیت ہے ''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيءٍ '' (الرعد:۱۸) (اللہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے) یعنی ہر شے مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے جس کے عموم میں بندوں کے افعال بھی شامل ہیں اور اللہ تعالی کی ذات وصفات اس سے خارج ہیں کیونکہ وہ مخلوق نہیں ہیں۔

اہل حق کی دلیل:۔

اہل سنت والجماعت کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہیں، اگر بندہ کا فعل خود بندہ ہی کی قدرت سے ہے تو اس سے ایک اثر پر دو مؤثروں کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ لازم باطل ہے اس لئے ملزوم بھی باطل ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اس عقیدہ کی بناء پر لازم آتا ہے کہ بعض بندے باعتبار خلق کے اللہ سے افضل ہوں کیونکہ ان کے نزدیک ایمان تو بندہ کا پیدا کیا ہوا (مخلوق) ہے اور شیطان اللہ کا پیدا کیا ہوا (مخلوق) ہے اور ایمان وشیطان کے درمیان جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

نیز کتاب وسنت کی وہ تمام نصوص اہلِ حق کی دلیل ہیں جن سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ہی ہر چیز کے خالق ہیں اور کوئی دوسرا اس کے سوا کسی چیز کا بھی خالق نہیں ہے مثلاً اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ '' (الصافات:۹٦) (حالانکہ تم کو اور تمہاری ان بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے) بعض حضرات نے لفظ ''ما'' کو مصدریہ مانا ہے اس بناء پر ترجمہ یہ ہوگا کہ: ''اللہ نے تم کو اور تمہارے عمل کو پیدا کیا'' اس صورت میں آیت سے استدلال بالکل واضح اور بے غبار ہے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ سباق آیت ''ما'' کے مصدریہ ہونے سے آبی ہے، بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ماتعملون'' سے مراد ان کے ہاتھوں کے تراشے ہوئے ''بت'' ہیں، تاہم آیت سے اہلِ حق کے استدلال پر کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس سے اتنا تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ اصنام اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ پتھر کے تراشے ہوئے بُت بندوں ہی کے تراشنے سے بُت بنے ہیں، پس اگر بندوں کا فعل یعنی تراشنا اللہ کی مخلوق نہ ہوگا تو اس سے لازم آئے گا کہ یہ تراشیدہ بُت بھی مخلوق نہ ہوں، واللازم باطل فالملزوم ایضاً باطل۔ نیز اس کے علاوہ دوسری بے شمار نصوص سے بھی یہ مدعا بطریق اوضح ثابت ہے مثلاً آیت کریمہ: ''اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ'' (الزمر:٦٢) (اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا) وغیرہ آیات۔ والتفصیل فی المطولات۔

قوله: "ولم يكلفهم الله الا مايطيقون ولايطيقون الا ما كلفهم وهو تفسير لاحول ولاقوة الابالله العلى العظيم نقول لاحيلة لأحدٍ ولاحول لأحدٍ ولاحركة لأحدٍ عن معصية الله الابمعونة الله ولاقوة لأحدٍ على اقامة طاعة الله والثبات عليها الابتوفيق الله وكل شيءٍ يجرى بمشيئة الله وعلمه وقضائه فغلبت مشيئة المشيئات كلها وعكست ارادته الارادات كلها وغلب قضاء ه

الحیل کلھا یفعل اللہ مایشاء وھو غیر ظالم ابداً لایُسأَلُ عما یفعَلُ وھُم یُسئَلونَ"۔

ترجمہ: اور اللہ تعالی نے بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا ہے اور جس کا مکلف بنایا ہے اس کے علاوہ ان کو طاقت بھی نہیں ہے اور یہی "لاحول ولاقوۃ الاباللہ" کی تفسیر ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی مدد کے بغیر نہ کسی کی تدبیر کارگر ہوسکتی ہے اور نہ کوئی اپنی جگہ سے حرکت کرسکتا ہے اور نہ اللہ تعالی کی نافرمانی سے باز آسکتا ہے اور نہ اللہ تعالی کی توفیق کے بغیر اللہ کی اطاعت کے قائم کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی کسی کے اندر قوت ہے اور ہر چیز اللہ تعالی کی مشیت، اس کے علم اور اس کے قضاء وقدر سے جاری ہوتی ہے، اس کی مشیت تمام مشیتوں پر غالب ہے اور اس کا ارادہ تمام ارادوں کو پلٹ دیتا ہے، اور اس کا فیصلہ تمام تدبیروں پر غالب ہے، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ ہرگز ظالم نہیں ہے، وہ اپنے کاموں کے لئے جوابدہ نہیں ہے اور سب لوگ جوابدہ ہیں۔

تشریح: مسئلہ تکلیف:۔

"لم یکلفھم اللہ تعالی الخ" اس کی دلیل یہ آیت ہے: "لَایُکَلِّفُ اللہُ نَفساً اِلّاوُسعَھَا" (البقرہ:۲۸۶) (اللہ تعالی کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اُسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو) واضح ہو کہ "مالایطاق" (جس کے کرنے کی قدرت اور طاقت نہ ہو) کی تین قسمیں ہیں:

(۱) محال لذاتہ جیسے حادث کو قدیم یا قدیم کو حادث بنانا اور متناقضین کو جمع کرنا، جمہور کے نزدیک اس کی تکلیف (مکلف بنانا) نہ جائز ہے اور نہ واقع ہے اور بعض نے اس پر سب کا اتفاق نقل کیا ہے لیکن یہ محلِ نظر ہے کیونکہ بہت سے اشاعرہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔

(۲) ممکن فی نفسہ یعنی ایسا امر جو فی نفسہ ممکن ہو لیکن عادۃً بندوں سے اس کا صدور نہ ہوتا ہو مثلاً آسمان میں اُڑنا یا پہاڑ کو سونا بنا دینا، اس میں اختلاف ہے، جمہور کے نزدیک اس کی تکلیف جائز ہے لیکن واقع نہیں ہے، جائز تو اس لئے ہے کہ بہ نسبت اللہ تعالیٰ کے کوئی چیز قبیح نہیں ہے اور عدم وقوع کا علم استقراء سے ہوا۔ اور معتزلہ کے نزدیک اس کی تکلیف بالکل جائز ہی نہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ ظلم ہے۔

(۳) وہ امر جو بندہ سے عادۃً ممکن ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ میں یہ بات پہلے سے ہے کہ وہ فعل اس بندہ سے صادر نہ ہوگا، جیسے ابولہب کا ایمان۔ اس پر سب کا اجماع ہے کہ یہ تکلیف شریعت میں واقع ہے، بلکہ تحقیق یہ ہے کہ یہ قسم "مالایطاق" کی اقسام میں سے ہے ہی نہیں۔ اور اشاعرہ نے ابولہب کے امر بالایمان کو ہی اپنے تکلیف مالایطاق کے عقلی جواز کی دلیل بنایا ہے کہ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی اور اس کی خبر بھی اللہ تعالیٰ نے دے دی تھی کہ ابولہب ایمان نہیں لائے گا لیکن اس کو ایمان لانے کا مکلف کیا گیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ایمان لائے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا کیونکہ ایمان تصدیق بماجاء به الرسول کو کہتے ہیں اور منجملہ ماجاء به الرسول کے اس کا ایمان نہ لانا بھی ہے لہٰذا اس کے ایمان لانے کے مکلف ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان نہ لانے پر ایمان لائے جو کہ جمع بین الضدّین کا مکلف کرنا ہے اور یہ محال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو یہ تسلیم نہیں کہ وہ اپنے ایمان نہ لانے پر ایمان لانے کا مکلف اور مامور تھا، کیونکہ جس استطاعت کی بناء پر آدمی ایمان لانے کی قدرت رکھتا ہے وہ اس کو حاصل تھی اس لئے وہ تحصیل ایمان سے عاجز نہیں تھا، لہٰذا اس کو "مالایطاق" کا مکلف نہیں بنایا گیا۔ صاحب نبراس نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ابولہب کے علاوہ دوسرے کفار مثلاً ابوجہل وغیرہ کے ایمان نہ لانے کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں آیا ہے بلکہ غیر مصرّح طور پر ہے مثلاً "إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ" (البقرہ:٦) (بے شک جو لوگ کافر ہو چکے

ہیں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے) اور رہا "تبت یدا أبي لَهَب" کا معاملہ تو اس میں صرف ابولہب کے دخولِ نار کا ذکر ہے جو غیر مخصوص بالکفار ہے، اور پھر اپنے اس جواب کو انہوں نے بہت سراہا ہے ولكن فيه مافيه فتدبر وتفكر۔ وههنا اسئله واجوبة مقامها المطولات۔

"ولا يطيقون الا ما كلفهم الخ" اس عبارت کا مناسب مقام صحیح ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ "اسی چیز کی طاقت رکھتے ہیں جس کی اللہ نے ان کو قدرت دی" اسی واسطے مصنف کی اس عبارت میں اشکال ہے کیونکہ انہوں نے "کلفهم" تحریر فرمایا ہے، جس کا ترجمہ "اقدرهم" نہیں آتا لیکن "کلفهم" کا جو صحیح ترجمہ ہے وہ یہاں مناسب نہیں ہے کیونکہ بندے صرف ان ہی احکام کی طاقت نہیں رکھتے جس کے مکلف ہیں بلکہ اس سے زائد کی بھی طاقت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کے ساتھ یسر و سہولت کا لحاظ فرما کر انہیں ان کی طاقت سے بہت کم احکام کا مکلف فرمایا ہے، پس اس کا جواب یہی ہے کہ اس سے مُراد وہ طاقت ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق کی جہت سے حاصل ہوتی ہے، وہ طاقت مراد نہیں ہے جو تمکن اور سلامتِ اسباب و آلات کی جہت سے ہوتی ہے۔

"وكل شيء يجري بمشيئة الله الخ" قضاء اور اسی طرح ارادہ واذن وغیرہ کی دو قسمیں ہیں: ایک تکوینی، دوسرے تشریعی، یہاں پر اس سے مراد قضائے تکوینی ہے، قضائے تکوینی کا ذکر اس آیت میں ہے: "فَقَضَاهُنَّ سَبعَ سَمٰوات فِي يَومَينِ" (حم السجدہ: ۱۲) (پس دو روز میں اس کے سات آسمان بنادیئے) اور قضائے تشریعی کا ذکر اس آیت میں ہے: "وَقَضىٰ رَبُّكَ اَلّا تَعبُدُوا اِلّا اِيّاه" (بنی اسرائیل: ۲۳) (اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے کسی کی عبادت مت کرو)۔

"يفعل ما يشاء وهو غير ظالم ابداً" جبریہ کا مذہب تو معلوم ہو چکا کہ وہ انسان کو اس کی تمام حرکات و سکنات میں مجبور محض بلکہ جمادِ محض سمجھتے ہیں اور قدریہ کا مذہب یہ ہے کہ جو چیز بندوں سے صادر ہو کر ظلم اور قبح کے ساتھ متصف ہوگی اور اس کو ظلم اور قبیح

کہا جائے گا وہ چیز اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بھی ظلم اور قبیح ہوگی العیاذ باللہ! ان لوگوں نے حق تعالیٰ سبحانہ کو مخلوق پر قیاس کیا اور ان کے ساتھ اس کو تمثیل وتشبیہ دی اس لئے گمراہی کے گڑھے میں جا گرے، اہل سنت والجماعت کا مذہبِ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام افعالِ خیر وشر کے خالق ہونے کے باوجود ان افعال کے قبح سے منزّہ ہیں پس حق تعالیٰ کی ذات کی نسبت سے کوئی فعل نہ ظلم ہے اور نہ قبیح کیونکہ ظلم کی حقیقت تصرف فی ملک الغیر ہے اور ساری کائنات اللہ کی مِلک ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں اس لئے عالَم میں جو کچھ تصرّف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ تصرف اپنی مِلک میں فرماتے ہیں نہ کہ مِلک غیر میں اس لئے ظلم کا تحقق نہ ہوگا، اسی طرح تمام اشیاء وافعال کی تخلیق میں اس کی بے شمار اور لاتعد ولاتحصی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جن کو وہی بہتر جانتا ہے اس لئے ایک فعل بندہ کے کسب وفعل کے لحاظ سے قبیح ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خلق کے اعتبار سے بھی قبیح ہو، اسی راز کو عارفِ رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے ؎

کُفر ہم نسبتِ بخالق حکمت است

قوله:- وفی دُعاء الاحیاء وصدقاتهم منفعةٌ للاموات۔

ترجمہ:- اور زندہ لوگوں کی دُعا اور ان کے صدقات سے مُردوں کو نفع پہنچتا ہے۔

تشریح: مسئلہ ایصالِ ثواب:۔

معتزلہ کے نزدیک زندوں کی دُعا واستغفار اور صدقات وعبادات کا نفع مردوں کو کچھ نہیں پہنچتا، ان کی دلیل یہ ہے کہ قضاء میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی خواہ وہ میت کے حق میں نعمت وراحت کے لئے ہوئی ہو یا عذاب ونقمت کے لئے، بہر دوصورت زندوں کی دُعا وصدقہ کا اُس کو کوئی نفع نہ ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے زندوں کی دُعا وصدقہ وغیرہ کا نفع مردوں کو پہنچنے کی خبر ہم کو دی ہے تو ہمارے لئے اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ گو ہماری

عقلِ ناقص قضاء وقدر کے اسرار سمجھنے سے قاصر ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر قضاء کو مبطلِ اسباب مانتے ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ تمام معاشی اور شرعی اسباب مثلاً زراعت وتجارت وملازمت اور دشمنوں سے حفاظت کے لئے تدابیر کا اختیار کرنا اور بیماری کا علاج اور اسی طرح طاعات کی بجا آوری اور معاصی سے احتراز وغیرہ کو ترک کر دیا جائے اور قضاء کو بہانہ بنالیا جائے، ولا قائل بہ۔ ان کی دوسری دلیل یہ آیت کریمہ ہے: "وَان لیس للانسانِ اِلاماسعی" (النجم: ۳۹) (اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی) لیکن اس آیت سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ آیت میں سعی سے مراد سعی ایمانی ہے یعنی یہ کہ ایک کا ایمان دوسرے کے کام نہیں آئے گا وھذا الذی اختارہ مولانا الکنکوھی ومولانا التھانوی قدس سرھما اور اگر سعی عملی ہی مراد ہو تو اس کے مختلف جواب علماء نے دیئے ہیں جن میں سے دو جواب جن کو شارح عقیدۂ طحاویہ نے اصح قرار دیا ہے نقل کئے جاتے ہیں:

اول: یہ کہ انسان کی اولاد وازواج بلکہ اس کے دوست واحباب جن کو اس نے اپنے حسن اسلام اور حُسن اخلاق ومعاشرت کی بدولت کمایا ہے، اور جن کے ساتھ اس نے حسن سلوک کیا ہے، وہ جب اس کے لئے دعا واستغفار کرتے اور اپنی طاعات وعبادات کے ثواب کی سوغات بھیجتے ہیں تو درحقیقت یہ اسی شخص کے سعی وعمل کا اثر ونتیجہ ہوتا ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو مسلمان کا حلقہ اسلام میں داخل ہونا اور جماعتِ مسلمین کے ساتھ اس کی وابستگی سب ہی آپس میں ایک دوسرے مسلمان بھائی سے زندگی اور بعد موت دونوں ہی حال میں حصولِ نفع کے اعظمِ اسباب میں سے ہے، چنانچہ قرآن کریم اور سنت نبوی میں مسلمانوں کے لئے دعا واستغفار کرنے اور انہیں نفع پہنچانے کی ترغیب بلکہ حکم موجود ہے جس کی بنیاد یہی قبولِ ایمان ہے، پس محض نعمت ایمان سے مشرف ہونا ہی گویا اس سعی کے ساتھ مشرّف ہونا ہے۔

دوسرا جواب جو اس سے اقویٰ ہے، یہ ہے کہ آیت میں اس کی نفی ہی نہیں ہے کہ

ایک شخص دوسرے کی سعی وعمل سے منتفع نہیں ہوسکتا بلکہ نفی اس کی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی سعی وعمل کا مالک نہیں ہوسکتا، وبین الامرین بون بعید۔ پس آیت میں اللہ تعالی نے یہ بات بتلائی ہے کہ ہر شخص صرف اپنی سعی وعمل کا مالک ہے اور دوسرا شخص خود ہی اپنی سعی کا مالک ہے، اب اگر وہ چاہے تو اس کو دوسرے کے لئے خرچ کرسکتا ہے۔

تمام اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ مُردے زندوں کی سعی وعمل، طاعات وعبادات اور دُعا واستغفار سے منتفع ہوجاتے ہیں، اسی طرح مُردہ کی طرف سے جو صدقہ اور حج کیا جائے اُس سے بھی وہ منتفع ہوتے ہیں، البتہ حج میں یہ اختلاف ہے کہ میت کو حج کا ثواب ملے گا یا ان اخراجات کا جو حج میں ہوئے ہیں۔ امام محمدؒ کے نزدیک مُردہ کو حج میں جو کچھ خرچ ہوا ہے اس کا ثواب ملے گا اور حج کا ثواب حج کرنے والے کو ملے گا اور عامہ علماء کے نزدیک حج ہی کا ثواب اس کو پہنچے گا، وھوا لصحیح۔ اور عباداتِ بدنیہ مثلاً نماز و روزہ، تلاوتِ قرآن اور ذکر میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد اور جمہور سلفؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس کا بھی ثواب پہنچتا ہے اور امام شافعیؒ وامام مالکؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ عباداتِ بدنیہ کا ثواب نہیں پہنچتا۔

اب اس کے بعد یہ معلوم ہو کہ مذہبِ اہلِ سنت کی دلیل کتاب وسنت اور اجماع وقیاس صحیح ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

"وَالذین جآءُ وا مِن بعدِ ھم یَقولونَ رَبَّنا اغفرلنا وَلاخواننا الذین سبقونا بالایمان"۔ (الحشر:۱۰)

(اور جو ان کے بعد آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں)۔

اور سنن ابی داؤد میں حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوجاتے تو وہاں کھڑے ہوتے اور ارشاد فرماتے: "استغفروا

لاخیکم واسألوا له التثبیت فانه الآن یسأل" (اپنے بھائی کے لئے مغفرت طلب کرواور اس کے لئے (نکیرین کے جواب دینے میں) ثابت رہنے کی دعا کرو، کیونکہ اس وقت اس سے سوال کیا جارہا ہے) نیز نماز جنازہ میں میت کے لئے دعا کرنے پر امت کا اجماع ہے اور نماز جنازہ میں جو دعائیں پڑھی جاتی ہیں وہ بطریق تواتر ثابت ہیں۔

اور صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری ماں کا اچانک انتقال ہوگیا وہ وصیت نہیں کرسکیں اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ بولتیں تو صدقہ کرتیں، اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کردوں تو کیا ان کو اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا، ہاں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ جہینہ کی ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میری والدہ نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہیں کرسکیں اور ان کا انتقال ہوگیا تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرلوں؟ آپ نے فرمایا:

حجی عنها ارأیتِ لو کان علی امك دینٌ اکنت قاضیته اقضوا الله فالله احق بالوفاء۔

(اس کی طرف سے حج کرلو، تیرا کیا خیال ہے کہ اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو کیا تو اس کو ادا کرتی؟ اللہ کا قرض ادا کرو اس لئے کہ اللہ ادا کئے جانے کا زیادہ حق دار ہے۔)

جس طرح نصوص کتاب وسنت اور اجماع سے یہ ثابت ہے اسی طرح قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ ثواب عمل کرنے والے کا حق ہے لہٰذا اگر وہ اپنا حق دوسرے مسلمان بھائی کو ہبہ کردے تو اس سے کوئی امر مانع نہیں ہے، جس طرح کہ زندگی میں اگر اس کو کوئی چیز ہبہ کرتا یا مرنے کے بعد ہی اس سے اپنے قرض کو معاف کردے تو کوئی مانع نہیں، ولا فارق بینهما۔

اور جن حضرات نے عباداتِ مالیہ اور عباداتِ بدنیہ میں تفریق کی ہے ان کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مینڈھے کی قربانی فرمائی اور فرمایا: "بسم الله الله اکبر اللهم هذا عني وعمن لم يضح من امتي". رواه احمد وابوداؤد والترمذي من حديث جابر رضی اللہ عنہ۔ نیز حج بھی عبادت بدنیہ ہے اور اس کے متعلق اوپر حدیث گذر چکی ہے اور حج کی عبادت بدنیہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اہل مکہ پر جب وہ عرفات تک پیدل چل کر جا سکتا ہو تو حج کرنا بدون شرطِ مال فرض ہے، لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حج مال وبدن سے مرکب عبادت ہے اس لئے اس سے استدلال تام نہیں، كما قد نص عليه جماعة من اصحاب ابي حنيفة المتأخرين۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص:۵۱۶)

البتہ جو لوگ قرآن پڑھنے والوں کو اُجرت پر مقرر کرتے ہیں تاکہ وہ تلاوت کر کے اس کا ثواب ان کے مُردوں کو بخش دیں یہ سراسر ناجائز ہے اور اس کا ثواب بھی مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ تلاوت کرنے والوں کی تلاوت خالص اللہ کے لئے نہ ہونے کے سبب خود ان ہی کو ثواب نہیں ملتا تو وہ دوسرے کو کیا بخشیں گے؟

قبر کے پاس تلاوتِ قرآن:

قبر کے پاس قرآن شریف تلاوت کرنے کی بابت علماء کے چند اقوال ہیں: امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ کے نزدیک اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں مکروہ ہے، کیونکہ یہ بدعتِ محدَثہ ہے، سنت میں وارد نہیں، نیز جس طرح قبروں کے پاس نماز پڑھنا منع ہے اسی طرح قراءتِ قرآن بھی منع ہے، کیونکہ قراءت، نماز کے مشابہ ہے۔

اور امام محمدؒ کے نزدیک اور امام احمدؒ کی ایک روایت میں کوئی مضائقہ نہیں (لا بأس بها) ان کی دلیل حضرت ابن عمرؓ کی یہ وصیت ہے کہ دفن کے وقت ان کی قبر پر سورۂ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھی جائیں، اور بعض مہاجرین سے بھی یہ منقول ہے اور رہا دفن کے بعد قبر کے پاس نوبت بنوبت جا کر تلاوت کرنا تو یہ مکروہ ہے کیونکہ نہ تو یہ سنت سے ثابت ہے اور نہ سلف میں سے کسی سے منقول ہے۔

قوله: "والله تعالی یستجیب الدعوات ویقضی الحاجات"۔

ترجمہ: اور اللہ تعالی دعائیں قبول کرتا اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔

تشریح: دُعا حصول منفعت اور دفع مضرت کا قوی ترین سبب ہے:۔

مسلمانوں اور تمام اہل مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ دُعا حصول منفعت اور دفع مضرت کے اسباب میں سے قوی ترین سبب ہے، چنانچہ قرآن کریم میں کفار کی دعا کا حال مذکور ہے:

"فَاِذَا رَکِبُوا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ"۔

(العنکبوت:۶۵)

(پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں)۔

اور عام انسانوں کا حال بھی بیان فرمایا کہ:

"وَاِذَا مَسَّ الانسانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجنبہ او قاعداً او قائماً"۔

(یونس:۱۲)

(اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو ہم کو پکارنے لگتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی، کھڑے بھی)۔

اور پھر حق تعالی کی شانِ کریمی ملاحظہ ہو کہ غایت شفقت ورحمت سے بندوں کو دعا کرنے کا حکم بھی فرمایا "وَقَالَ رَبُّکُم ادعُونِی اَستَجِب لَکُم" (المومن:۶۰) (اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِی عَنِّی فانی قریبٌ اُجِیبُ دَعوَۃَ الدَّاعِ اذا دَعَانِ"۔(البقرۃ:۸۶)

(اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو

(آپ میری طرف سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں اور منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والوں کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست دے)۔

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "من لم يسأل الله يغضب عليه" (جو اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے غصہ ہوتے ہیں) کسی نے اسی مضمون کو اس شعر میں باندھا ہے ؎

الرب يغضب إن تركت سؤاله

وبني آدمَ حين يسال يغضب

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ سے اگر نہ مانگو تو وہ غصہ ہوتے ہیں اور آدمی سے اگر مانگو تب وہ غصہ ہوتا ہے)۔

البتہ قبولیتِ دعا کے لئے اس کی شرائط تضرع واخلاص، انابت کاملہ اور حرام سے اجتناب وغیرہ کا وجود اور موانع کا ارتفاع بھی ضروری ہے۔

فلاسفہ اور غالی متصوفین نیز زمانہ حال کے بعض خودرَو نوخیز عقلاء کا زعم فاسد اور خیالِ باطل یہ ہے کہ دعا سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس امر کے ہونے کی ہے تو وہ ہو کر رہے گی دعا کی ضرورت نہیں اور اگر مشیتِ خداوندی اس کے ہونے کی نہیں ہے تو دعا سے کوئی فائدہ نہ ہوگا لیکن کتاب وسنت کی نصوص صریحہ کے سامنے ان ہفوات کی کیا حیثیت ہے، نیز ان لوگوں کی یہ کج منطقی بھی بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ تقاضائے مشیت کے باوجود دعا کی ضرورت دوسری مصالح عاجلہ وآجلہ کی تحصیل اور مضارّ عاجلہ وآجلہ کے دفع کے لئے ہوتی ہے، اسی طرح تقاضائے مشیت کے نہ ہونے کے باوجود دعا فائدہ سے خالی نہیں کیونکہ اس میں جلب منفعت اور دفع مضرت کے فوائد کے علاوہ بہت سے اُخروی فوائد عظیمہ مضمر ہیں، وهذا مما لا يخفى على من تأمل في النصوص۔

قوله: ويملك كل شيء ولا يملكه شيء ولا غنى عن الله طرفة

عینٍ ومن استغنیٰ عن الله طرفةَ عینٍ فقد کفر وکان من اھل الحَینِ والله یغضب ویرضیٰ لاکاحد من الوریٰ"۔

ترجمہ: اور وہ ہر چیز کا مالک ہے، اس کا کوئی مالک نہیں اور چشم زدن بھی اللہ تعالی سے بے نیازی نہیں اور جو چشم زدن بھی اللہ تعالی سے بے نیازی برتے اس نے کفر کیا اور ہلاک ہونے والوں میں ہوگیا۔ اور اللہ تعالی غصہ ہوتا ہے اور خوش ہوتا ہے لیکن کسی مخلوق کی طرح نہیں۔

تشریح: ۔لفظ الحین حاء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی ہلاکت ہے۔

ویملك كل شیٔ الخ لایحتاج الی الشرح والبیان۔

والله یغضب ویرضی الخ اس کی دلیل آیت ذیل اور اس طرح کی دوسری آیات ہیں:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تحتَ الشجرةِ۔ (الفتح:۱۸)

(بالتحقیق اللہ تعالی ان مسلمانوں سے خوش ہوا جب کہ یہ لوگ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے)۔

اور فرمایا: "وَبَآءُ وا بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ"۔(البقرہ:۶۱)(اور مستحق ہوگئے غضب الٰہی کے)۔

مسئلہ صفات پر بحث گذشتہ اوراق میں تفصیل کے ساتھ آچکی ہے، فلیراجع ھناك۔ دراصل حضرت مصنفؒ نے اس رسالہ میں صفات وقدر وغیرہ مسائل ترتیب کے ساتھ ایک جگہ نہیں بیان فرمایا ہے بلکہ کیف ما اتفق ان کے جزئیات غیر مرتب طور پر بیان فرمادیے ہیں، جس کی وجہ سے قاری کو بعض اوقات اُلجھن ہوجاتی ہے۔

قوله: "ونحب اصحابَ رسولِ الله ﷺ ولانُفرط فی حب احد منهم ولانتبرأ من احد منهم ونُبغض من

یبغضهم وبغیر الحق یذکرهم ولانذکرهم الا بالخیر
وحبهم دینٌ وایمانٌ واحسانٌ وبُغضهم کفرٌ ونفاقٌ
وطغیانٌ۔

ترجمہ:اور ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے محبت کرتے ہیں اور ان
میں سے کسی کی محبت میں حد سے تجاوز نہیں کرتے اور نہ ان میں سے کسی
سے براءت اختیار کرتے ہیں،اور ہم اس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو ان
حضرات سے بغض رکھتا یا بُرائی کے ساتھ ان کا ذکر کرتا ہے اور ہم ان کا
ذکر صرف خیر کے ساتھ کرتے ہیں اور ان سے محبت رکھنا دین وایمان اور
احسان ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ونفاق اور سرکشی ہے۔

تشریح:حُبِ صحابہ:۔

اس سے مصنفؒ نے روافض اور نواصب پر رد فرمایا ہے اور صحابہ کرامؓ نے متعلق
جو رسول اللہ ﷺ اور اُمت کے درمیان واسطہ ہیں اہلِ سنت کا مذہب حق بیان فرمایا ہے
حضرات صحابہ کرامؓ کے مقام اور ان کے فضائل ومناقب کے متعلق علماء نے مستقل کتابیں
تصنیف فرمائی ہیں،عہدِ قریب کے مشہور عالم ربانی،فقیہ،محدث اور مفسر حضرت مولانا مفتی
محمد شفیع صاحبؒ نے بھی اس موضوع پر ''مقام صحابہ'' کے نام سے ایک کتاب تالیف فرمائی
ہے جو باوجود اُردو میں ہونے کے اپنے موضوع پر بے نظیر اور صحابہ کرامؓ کے مخالفین اور ان
سے کدر کھنے والوں کے لئے دوائے شافی اور نہ ماننے والوں پر حجت تامہ ہیں،اس باب
میں اس کا مطالعہ ازحد مفید ہے۔ہم یہاں پر اس بحث سے متعلق چند آیات واحادیث
پر اکتفاء کرتے ہیں:

اللہ تعالی سابقین اولین مہاجرین وانصار کی مدح میں ارشاد فرماتے ہیں:

"وَالسّٰبِقُونَ الاولون مِنَ المهاجِرِينَ والانصارِ والذین
اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم وَرَضُوا عنهُ وَاَعَدَّ لَهُم

جَنّٰت تَجرِی مِن تحتھاالانہارُ خالدِینَ فِیھاابداً ذالك الفوزُ العظیمُ"۔(التوبہ:)

(اور جومہاجرین وانصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوااور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ تعالی نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کرر کھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے)۔

اورفرمایا:

"لَایَستَوِی منکُم من انفقَ مِن قبلِ الفتحِ وَقَاتَلَ أُولئك اعظمُ دَرَجَةً من الذین انفقُوامن بعد وَقَاتلوا وکلاًوَعَدَاللہُ الحُسنیٰ واللہُ بماتعملُونَ خبیرٌ"۔(الحدید:١٠)

(جولوگ فتح مکہ سے پہلے خرچ کرچکے اور لڑ چکے برابر نہیں ہیں، وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور لڑے اور اللہ تعالی نے بھلائی کا وعدہ سب سے کرر کھا ہے اور اللہ تعالی کوتمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے)۔

اورفرمایا:

"لِلفُقَراءِالمہاجرینَ الذینَ أُخرجُوامِن دِیارِھِم واموالھم یبتغُونَ فضلاً مِنَ اللہِ وَرِضواناً وینصُرُونَ اللہَ وَرَسُوله أُولئك ھُمُ الصادقون والذین تَبَوَّءُوالدارَ والایمانَ مِن قبلھم یُحِبُّونَ مَن ھاجَرَ الیھم ولایَجِدُونَ فی صُدورھم حاجةً مماأُوتوا وَیؤثرُونَ علی انفسھم ولوکانَ بھم خَصاصة وَمَن یُوقَ شُحَّ نفسه فاولئك ھُمُ المُفلحُونَ

والذین جآءوامن بعد هم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونابالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنآ انک رءوف رحیم" (الحشر:۸)

(اوران حاجتمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اوراپنے مالوں سے جدا کردیئے گئے، وہ اللہ تعالی کے فضل اور رضامندی کے طالب ہیں، اوروہ اللہ اوراس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں اور ان لوگوں کا (بھی حق ہے) جودارالاسلام (یعنی مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے (آنے سے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں، جوان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں پاتے اوران کو اپنے سے مقدم سمجھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو، اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اوران لوگوں کا (بھی اس مال میں حق ہے) جوان کے بعد آئے، جو (ان مذکورین کے حق میں) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے، اے ہمارے رب! آپ بڑے شفیق رحیم ہیں)۔

ایک اورجگہ صحابہ کرامؓ کی صفات اس طرح بیان فرمائی ہے:

"محمدٌ رسول اللہ والذین معہ اشدآء علی الکفار رحمآء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلاً من اللہ ورضواناً سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذالک مثلھم فی التوراۃ ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطئہ فاٰزرہ

فاستغلظ فاستوىٰ علىٰ سُوقه يُعجِبُ الزّراعَ لِيَغِيظَ بهم الكفار وَعَدَ اللهُ الذين آمَنُوا وعَمِلُوا الصالحات مِنهُم مَغفِرَةً وَاجراً عظِيماً "(الفتح:۲۹)

(محمد اللہ کے رسول ہیں اور جولوگ آپ کے صحبت یافتہ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت ہیں اورآپس میں مہربان ہیں، اے مخاطب! توان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کررہے ہیں اور کبھی سجدہ کررہے ہیں اللہ تعالی کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں اُن کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، یہ ان کے اوصاف توریت میں بھی ہیں، اور انجیل میں بھی، ان کا یہ وصف ہے کہ جیسے کھیتی اس نے اپنی سوئی نکالی پھراس نے اس کوقوی کیا پھروہ اور موٹی ہوئی پھراپنے تنے پرسیدھی کھڑی ہوگئی کہ کسانوں کوبھلی معلوم ہونے لگی تاکہ ان سے کافروں کا جی جلائے اللہ تعالی نے ان صاحبوں سے جوکہ ایمان لائے اورنیک کام کررہے ہیں مغفرت اوراجرعظیم کاوعدہ کررکھا ہے)۔

ایک اورمقام پران کاوصف اس طرح مذکورہے:

"والذين آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا في سبيل اللهِ والذين آووا وّنصروا اُولئك هُمُ المؤمنونَ حقاً لهم مغفرةٌ ورزقٌ كريمٌ والذينَ آمنوا من بعد وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا معكم فأولئك منكم وأولوا الارحامِ بعضُهم اولى ببعض في كتاب الله إنَّ الله بكلِّ شيءٍ عليم "(الانفال:۷۵،۷۴)

(اور جولوگ مسلمان ہوئے اورانہوں نے ہجرت کی اوراللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے اورجن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) اپنے یہاں ٹھہرایا اوران کی مددکی یہ لوگ ایمان کاپوراحق اداکرنے والے ہیں، ان کے

لئے بڑی مغفرت اور بڑی معزز روزی ہے، اور جو لوگ (ہجرت کے) بعد کے زمانہ میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا سو یہ لوگ تمہارے ہی شمار میں ہیں، اور جو لوگ رشتہ دار ہیں وہ کتاب اللہ میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ تعالی ہر چیز کو خوب جانتے ہیں)۔

سابقین اولین وہ حضرات مہاجرین وانصار ہیں جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، تمام اہلِ بیعۃ الرضوان انہی میں سے ہیں، جن کی تعداد چودہ سو سے زیادہ ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ سابقین اوّلین وہ حضرات ہیں جنہوں نے دونوں قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ یہ تمام حضرات ان حضرات سے افضل ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد ایمان قبول کیا، اور پھر یہ حضرات بھی ان حضراتِ صحابہ سے افضل ہیں جنہوں نے فتحِ مکہ کے بعد ایمان قبول کیا۔

"ولا نُفرط فی حب احد منہم الخ"[1] یعنی اہلِ سنت رافضیوں کی طرح ان حضرات میں سے کسی کی محبت میں حد سے تجاوز اور غلو نہیں کرتے، جس طرح وہ حضرت علیؓ کی محبت میں بظاہر غلو کرتے ہیں لیکن درحقیقت اس پردہ میں وہ مسلمانوں کے درمیان تفریق اور فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں قرآنِ کریم نے غلو اور تجاوز عن الحد سے منع کر دیا ہے، ارشاد ہے: "یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ" (النساء:۱۷۱) (اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں حد سے نہ نکلو)۔

"ولا نتبرأ من احد منہم الخ" یعنی ہم روافض کی طرح کسی بھی صحابی سے

---

[1] "اصحابی کالنجوم" والی حدیث طبقہ واعظین ومقررین میں بہت مشہور ہے، لیکن یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ کتب معتبرہ میں موجود نہیں ہے۔ شرح العقیدۃ الطحاویہ میں ہے "ومایروی عن النبی ﷺ انہ قال اصحابی کالنجوم بأیہم اقتدیتم اہتدیتم فہو حدیث ضعیف. قال البزار: ہذا حدیث لایصح عن رسول اللہ ﷺ ولیس ہو فی کتب الحدیث المعتمدۃ"۔ ص:۵۳۰)

براءت اور بیزاری ظاہر نہیں کرتے، ان کے نزدیک اہلِ بیت کے ساتھ ولاء اور محبت بغیر صحابہ کرامؓ حتی کہ خلفائے ثلاثہ کے ساتھ اظہار بیزاری کے بغیر ممکن ہی نہیں، ان کا مذہب ہے کہ ''لا ولاء الا ببراء''۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول بطریق صحیح روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"لاتسبوا اصحاب محمد ﷺ فلمقام احدهم ساعةً يعني مع النبي ﷺ خير من عمل احدكم اربعين سنة وفي رواية وكيع خير من عبادة احدكم عمره"۔

(محمد ﷺ کے صحابہ کو بُرا بھلا مت کہو ان کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک گھڑی قیام تمہارے چالیس سال کے عمل سے بہتر ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تمہاری عمر بھر کی عبادت سے افضل ہے)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے صحابہ کرامؓ کا وصف ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا:

"ان الله نظر في قلوب العباد فوجد قلب محمد خير قلوب العباد فاصطفاه لنفسه وابتعثه برسالته ثم نظر في قلوب العباد بعد قلب محمد ﷺ فوجد قلوب اصحابه خير قلوب العباد فجعلهم وزراء نبيه يقاتلون على دينه فما رأه المسلمون حسناً فهو عند الله حسن وما رأوه سيئا فهو عند الله سئ"۔ اخرجه الطيالسي واحمد وغيرهما بسند حسن وصححه الحاكم ووافقه الذهبي.

اللہ تعالیٰ نے بندوں کے قلوب کو دیکھا تو محمد ﷺ کے قلب کو سب سے بہتر پایا پس ان کو اپنے لئے منتخب فرمایا اور ان کو اپنی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، پھر محمد ﷺ کے قلب کے بعد بندوں کے قلوب کی طرف

---

[1] یعنی صحابہ کرامؓ سے بیزاری ظاہر کئے بغیر اہلِ بیت کے ساتھ ولاء اور محبت کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

نظر فرمائی تو ان کے صحابہ کے قلوب کو سب سے بہتر پایا پس ان کو اپنے نبی کا وزیر بنایا جو اس کے دین پر جہاد کرتے ہیں، پس مسلمان (صحابہ) جس کو اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے اور وہ جس کو بُرا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بُرا ہے۔

اور ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "وقد رأی اصحاب محمد جمیعا ان یستخلفوا ابابکر" (اور محمد ﷺ کے تمام صحابہ نے یہ دیکھا کہ ابوبکر کو خلیفہ بنادیں)۔

اور صحیحین میں خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، فرمایا:

"خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم قال عمران فلا ادری اذکر بعد قرنه قرنین او ثلاثة"۔

(بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں پھر وہ جو ان سے متصل ہیں پھر وہ جو ان سے متصل ہیں، حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ (جو حدیث کے راوی ہیں) فرماتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے اپنے زمانہ کے بعد دو زمانوں کا ذکر فرمایا یا تین کا)۔

اب اس کے بعد بھی اگر کوئی بدنصیب ان حضرات سے بغض و کینہ رکھے تو وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہارے مذہب میں سب سے بہتر کون لوگ ہیں تو انہوں نے کہا کہ اصحابِ موسیٰ، اور نصاریٰ سے پوچھا گیا کہ تمہارے مذہب میں سب سے افضل کون لوگ ہیں تو انہوں نے کہا کہ اصحابِ عیسیٰ اور جب رافضیوں سے پوچھا گیا کہ تمہارے مذہب میں سب سے بدترین کون لوگ ہیں تو انہوں نے کہا کہ اصحابِ محمد (ﷺ)۔

"وحبھم دین وایمان واحسان" وجہ اس کی یہ ہے کہ ان حضرات سے محبت دراصل اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل ہے، حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ارشاد فرمارہے تھے:

"الله الله فی اصحابی لاتتخذ وهم غرضا بعدی فمن احبهم فبحبی احبهم ومن ابغضهم فببغضی ابغضهم ومن آذاهم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله فیوشك ان یأخذہ"۔رواہ الترمذی

(میرے اصحاب کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، میرے بعد اُن کونشانہ مت بنانا، جس نے ان سے محبت کی میری محبت کی وجہ سے کی اور جس نے ان سے بغض کیا مجھ سے بغض کے سبب کیا اور جس نے ان کو اذیت پہنچائی اس نے مجھ کو اذیت پہنچائی اور جس نے مجھ کو اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی تو قریب ہے کہ وہ اس کو پکڑے)۔

البتہ حبِّ صحابہ کو مصنفؒ نے جو ایمان قرار دیا ہے یہ مجازاً ہے، اس لئے کہ حُب قلب کا عمل ہے اور عمل ایمان کے مسمیٰ میں داخل نہیں کیونکہ ایمان اقرار باللسان اور تصدیق بالجنان کا نام ہے کما مر تفصیلہ۔

"وبغضهم کفرونفاق وطغیان" اہل بدعت کی تکفیر سے متعلق گفتگو پیچھے گزر چکی ہے۔

قوله:"ونثبت الخلافة بعد رسول الله ﷺ اولا لابی بکر الصدیق رضی الله عنه تفضیلا له وتقدیماً علی جمیع الامة ثم لعمربن الخطاب رضی الله عنه ثم لعثمان رضی الله عنه ثم لعلی بن ابی طالب رضی الله عنه وهم الخلفاء الراشدون والائمة المهدیون"۔

ترجمہ: اور ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت سب سے پہلے ابوبکر صدیقؓ کے لئے ثابت کرتے ہیں تمام اُمت پر ان کی فضیلت اور برتری

کی وجہ سے، پھر عمر بن خطاب ؓ کے لئے پھر عثمان ؓ کے لئے پھر علی بن ابی طالب ؓ کے لئے اور یہی حضرات خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ ہیں۔

تشریح: مسئلہ خلافت:۔

"ونثبت الخلافۃ الخ" خلافت کی تعریف شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے ان الفاظ سے کی ہے:

هی الریاسة العامة فی التصدی لاقامة الدین باحیاء العلوم الدینیة واقامة ارکان الاسلام والقیام بالجهاد ومایتعلق به من ترتیب الجیوش والفرض للمقاتلة واعطائهم من الفیء والقیام بالقضاء واقامة الحدود ورفع المظالم والامر بالمعروف والنهی عن المنکر نیابة عن النبی ﷺ۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: مقصد اول: فصل اول مترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنویؒ جلد:۱ ص:۱۳، مطبوعہ کراچی)

خلافت (عامہ) وہ ریاست عامہ ہے جو علوم دینیہ کے زندہ رکھنے اور ارکان اسلام کے قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد کے قائم رکھنے کے جیسے لشکروں کا مرتب کرنا مجاہدین کو وظائف دینا، مال غنیمت کو ان پر تقسیم کرنا اور عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینے اور حدود کے قائم کرنے اور مظالم کے دور کرنے اور لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے منع کرنے کے بحیثیت نائب ﷺ کے لئے بالفعل حاصل ہوئی ہو۔

نصب امام واجب ہے:۔

اہل سنت، معتزلہ اور شیعہ کا اس پر اجماع ہے کہ نصب امام (امام وخلیفہ مقرر کرنا)

واجب ہے، اور خوارج کے نزدیک واجب نہیں ہے، پھر شیعہ امامیہ کے نزدیک نصب امام اللہ پر واجب ہے، اور اہلِ سنت کے نزدیک مسلمانوں پر واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "من مات بغیر امام مات میتۃ جاھلیۃ"۔

رواہ مسلم عن ابن عمرؓ (جو بغیر امام کے مرا وہ جاہلیت کی موت مرا)۔

نیز صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلا کام نصب امام ہی کا انجام دیا کیونکہ بغیر اس کے جماعت مسلمین میں افتراق واختلال کا اندیشہ تھا۔ اور اس کے علاوہ بہت سے واجبات شرعیہ مثلاً اقامتِ حدود، سرحدوں کی حفاظت اور صدقات کی وصولی وغیرہ امور ایسے ہیں کہ امام ہی پر موقوف ہیں۔

شرائطِ امامت:۔

اہل سنت کے نزدیک امام کا قریشی ہونا ضروری ہے، غیر قریشی کے لئے امامت جائز نہیں ہے اور اس کا معصوم ہونا ضروری نہیں ہے اور یہ بھی شرط نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل زمانہ میں سب سے افضل ہو خلافاً للشیعہ۔ نیز امام کا اہل ولایت میں سے یعنی مُسلم، حُر، مرد، عاقل وبالغ ہونا ضروری ہے اور ایسا شخص ہو جو امور مسلمین میں تصرف کی قوت رکھتا ہو، صحیح الفکر، قوی الرائے ہو اور تنفیذ احکام اور حدود اسلام کی حفاظت اور انصاف کی صلاحیت رکھتا ہو۔ امام فسق وظلم کی وجہ سے معزول نہیں ہوگا، اس کے خلاف بغاوت بھی جائز نہیں ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک امام اور اسی طرح دوسرے حُکّام فسق کی وجہ سے خود معزول ہو جائیں گے خواہ ان کو کوئی معزول نہ بھی کرے چنانچہ ان کے نزدیک ان فاسق حُکّام کے تصرفات شرعاً نافذ نہیں ہوں گے۔ (کذافی النبراس)

خلیفہ اول ابوبکر صدیقؓ ہیں:۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پہلے خلیفہ ابوبکر صدیقؓ ہیں البتہ ان کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ آپ کی خلافت کا ثبوت نص سے ہے یا مسلمانوں کے انتخاب سے؟ حضرت حسن بصریؒ اور محدثین کی ایک جماعت کا مذہب یہ

ہے کہ خلافتِ صدیقی کا ثبوت نص خفی اور اشارۃ النص سے ہے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ نص جلی سے ہے۔ اور محدثین کی ایک جماعت، معتزلہ اور اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ یہ انتخاب سے ثابت ہوئی ہے۔

خلافت صدیقی کا ثبوت نصوص سے:۔

قولِ اول کی چند احادیث ہیں منجملہ ان کے ایک حدیث یہ ہے:

"عن جبیر بن مطعم قال اتت امرأۃ النبی ﷺ فأمرھا ان ترجع الیہ قالت ارأیت ان جئت فلم اجدك؟ كانها ترید الموت قال ان لم تجدینی فأتی ابابکر"۔ (رواہ البخاری)

حضرت جبیر بن مطعمؓ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئی۔ آپ نے اس کو حکم دیا کہ دوبارہ آئے۔ اس نے عرض کیا کہ اگر میں آؤں اور آپ کو نہ پاؤں تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ گویا اس کی مُراد موت تھی، آپ نے فرمایا اگر تم مجھ کو نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس جانا۔

اور سنن میں حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت ہے:

"قال رسول الله ﷺ اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر وعمر"۔

(رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کی پیروی کرو جو میرے بعد ہوں گے یعنی ابوبکر و عمر کی۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں:

"دخل عَلَیَّ رسول الله ﷺ فی الیوم الذی بُدِیءَ فیه فقال ادعی لی اباك واخاك حتی اکتب لابی بکر کتاباً ثم قال یابی الله والمسلمون الا ابابکر"۔

(رسول اللہ ﷺ اس روز میرے پاس تشریف لائے جس روز آپ کے

مرض کی ابتداء ہوئی اور فرمایا کہ اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ
تا کہ میں ابوبکر کے لئے نوشتہ لکھ دوں پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ اور مسلمان
ابوبکر کے علاوہ (کسی پر) راضی نہ ہوں گے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نمرضِ وفات میں صدیق اکبرؓ کی امامت ایک مشہور و معروف حقیقت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مروا ابابکر فلیصلّ بالناس''۔ رواہ البخاری و مسلم۔ (ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں)

یہ اور اسی طرح کی دوسری احادیث و روایات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا منشاء یہی تھا کہ آپ کے بعد کارِ خلافت صدیق اکبر ہی انجام دیں۔

قولِ ثانی (یعنی یہ کہ آپ کی خلافت کا ثبوت انتخاب سے ہوا) کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ سے کی ہے کہ اُنہوں نے فرمایا:

-ان استخلف فقد استخلف من هو خير مني يعني ابابكر وان لااستخلف فلم يستخلف من هو خير منه يعني رسول الله ﷺ۔

(اگر میں اپنا جانشین نامزد کروں تو اس شخص نے اپنا جانشین نامزد کیا ہے جو مجھ سے بہتر تھا ان کی مراد حضرت ابوبکرؓ تھے اور اگر میں جانشین نامزد نہ کروں تو اس ذات نے جانشین نامزد نہیں کیا ہے جو ان سے بہتر تھی ان کی مراد رسول اللہ ﷺ تھے۔

لیکن دونوں اقوال کے دلائل پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عدم استخلاف کی نسبت جو آنحضور ﷺ کی طرف کی ہے تو غالباً ان کا منشاء یہ ہوگا کہ آپ نے تحریری طور پر کسی کو نامزد نہیں فرمایا، ورنہ آپ کے ''یابی الله والمسلمون الا ابا بکر'' فرما دینے کے بعد بالکل ظاہر ہے کہ اگر آپ کوئی نوشتہ تحریر فرماتے تو حضرت ابوبکرؓ ہی کو نامزد فرماتے، پس ایک تو یہ تھا کہ آپ بہ نص صریح کوئی نوشتہ تحریر فرماتے۔

اورایک یہ ہے کہ ایسانہ کر کے آپ نے اپنے اقوال وافعال سے اور متعدد اشارات واطوار سے اصحابِ کرامؓ کو اس طرف متوجہ فرمادیا اور اس باب میں ان کی پوری پوری رہنمائی فرمادی جس میں ان حضرات کو کوئی شک وتردد ہی نہیں رہا اور یہی طرز زیادہ بلیغ بھی تھا کیونکہ الکنایۃ ابلغ من التصریح۔

اب رہا یہ اشکال کہ یہ امر اگر اتنا واضح تھا تو سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کیوں مجتمع ہوئے؟ اور بعض انصار نے "منا امیر ومن المہاجرین امیر" کیوں کہا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب باتیں ایک وقتی جذبہ کے تحت پیدا ہوگئی تھیں اور اسی کے نتیجہ میں ان کے اذہان سے ان تصریحات بشکل اشارات کا ذہول ہو گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب اسی مجمع میں حضرت عمرؓ نے تمام مہاجرین وانصار کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی تقریر میں یہ ارشاد فرمایا کہ: "انت خیرنا وسیدنا واحبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" تو کسی ایک فرد نفر نے بھی نہ اس کا انکار کیا اور نہ یہ کہا کہ ان کے علاوہ کوئی دوسرا مستحق خلافت ہے۔ چنانچہ ابن بطہ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے محمد بن زبیر حنظلی کو حضرت حسنؒ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے بھیجا کہ کیا نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ: "اوَفِی شك صاحبك نعم واللہ الذی لا الہ الا ھو استخلفه" کیا ان حضرات کو اس میں شک ہے اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں آپ نے ان کو خلیفہ نامزد فرمایا تھا۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ص: ۵۳۷)

اس باب میں روافض نے بہت بے سروپا روایات پھیلادی ہیں اور اس کے انبار میں حقائق کو چھپانے کی کوشش کی ہے، اس کی تفصیل کے لئے منہاج السنہ، ازالۃ الخفاء اور الصواعق المحرقہ وغیرہ کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

خلافتِ فاروقی:۔

"ثم لعمر بن الخطاب رضی اللہ عنه" یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد ہم

حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے قائل ہیں جس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے خود ان کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور اس کے بعد ساری اُمت کا اس پر اتفاق ہو گیا حضرت ابوبکرؓ افضل البشر بعد الانبیاء ہیں، پھر ان کے بعد فاروق اعظمؓ ہی کا درجہ ہے۔

حضرت محمد بن حنفیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد (حضرت علیؓ) سے عرض کیا کہ ابا جان! رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں میں افضل کون ہے؟ انہوں نے فرمایا بیٹے! تم نہیں جانتے، میں نے عرض کیا نہیں، فرمایا، ابوبکرؓ میں نے عرض کیا کہ ان کے بعد کون ہے؟ فرمایا عمر، مجھے اندیشہ ہوا کہ اب کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ پھر عثمان اس لئے میں نے عرض کیا کہ پھر آپ، تو فرمایا کہ میں تو مسلمانوں میں کا ایک شخص ہوں۔ اور صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ:

-قال رسول الله ﷺ ایه یاابن الخطاب! والذی نفسی بیده مالقیك الشیطان سالکاً فجاً الاسلك فجاً غیر فجك۔

(اے ابن خطاب! قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے شیطان تم سے کسی راستہ میں چلتا ہوا نہیں ملتا مگر یہ کہ تمہارے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔)

آپ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں جو کتب حدیث میں دیکھے جا سکتے ہیں، آپ ہی کو سب سے پہلے امیر المؤمنین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور آپ ہی کے زمانہ میں اسلام کو قوت وشوکت اور فروغ حاصل ہوا، فتوحات کا تانتا بندھ گیا اور طاغوتی طاقتیں سرنگوں ہو گئیں۔

خلافتِ عثمانی:۔

"ثم لعثمان رضی الله عنه" یعنی حضرت عمرؓ کے بعد ہم حضرت عثمانؓ کی خلافت کے قائل ہیں، جس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ابولولو مجوسی نے حضرت عمرؓ کو زخمی کر دیا اور آپ کا آخری وقت آ گیا تو آپ نے ان چھ حضرات یعنی حضرت عثمان وعلی وزبیر

وطلحہ وسعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنھم کی ایک شوریٰ بنادی کہ یہ لوگ آپس میں طے کر کے اپنے ہی میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں اور یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ بن عمرؓ بھی موجود رہیں گے، پھر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے ان سب لوگوں سے کہا کہ اب آپ حضرات اس معاملہ کو تین حضرات میں محدود کردیں۔اس پر حضرت زبیرؓ نے فرمایا کہ میں نے علیؓ کے حوالہ کردیا اور سعدؓ نے کہا کہ میں نے عبدالرحمن کے حوالہ کردیا، تب حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے کہا کہ آپ دونوں میں سے جو اس امر (خلافت) سے دست بردار ہوجائے گا ہم اس کو اسی کے حوالہ کردیں گے، اس پر دونوں حضرات خاموش رہے، تو حضرت عبدالرحمنؓ نے کہا کہ کیا آپ لوگ اس کو میرے حوالہ کرتے ہیں، خدا کی قسم! تم میں سب سے افضل کے (منتخب کرنے) میں کوتاہی نہیں کروں گا، دونوں حضرات نے فرمایا کہ ہاں، پس انہوں نے ایک صاحب کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ آپ کو رسول اللہ ﷺ سے قرابت اور اسلام میں قدامت کا شرف حاصل ہے جو میں جانتا ہوں اگر میں آپ کو امیر بنادوں تو آپ ضرور عدل وانصاف کریں گے اور اگر میں عثمان کو امیر بنادوں تو آپ سُنیں گے اور اطاعت کریں گے۔پھر دوسرے کو تنہائی میں لے گئے اور ان سے بھی ایسی ہی بات کہی پھر جب عہد لے چکے تو کہا، عثمان! ہاتھ اٹھایئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی پھر حضرت علیؓ نے بھی ان سے بیعت کرلی اس کے بعد سب لوگوں نے بیعت کرلی۔

حضرت عثمانؓ کے بے شمار فضائل ومناقب میں سے یہ ہے کہ آپ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے منسوب ہوئیں اسی واسطے آپ کا لقب ذوالنورین ہے، یہ شرف آپ کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اور اپنی رانیں یا پنڈلیاں کھولے ہوئے تھے کہ ابوبکرؓ نے اجازت طلب کی آپ نے اجازت دے دی اور اسی حال میں رہے پھر گفتگو بھی فرمائی، پھر حضرت عمرؓ نے اجازت

طلب کی تو آپ نے ان کو بھی اجازت دے دی اور گفتگو بھی فرمائی، پھر عثمانؓ نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے اور اپنے کپڑوں کو دُرست فرمالیا پھر وہ اندر آئے اور گفتگو کی، پھر جب وہ چلے گئے تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ ابوبکرؓ آئے تو آپ نے نہ خوشی ظاہر کی اور نہ ان کی پرواہ کی، پھر عمرؓ آئے تو بھی آپ نے نہ تو خوشی ظاہر کی اور نہ ہی ان کی پرواہ کی، پھر عثمانؓ داخل ہوئے تو آپ بیٹھ گئے اور آپ نے اپنے کپڑوں کو درست فرمایا اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: ''الا استحی من رجل تستحیی منه الملائکة'' (کیا میں ایسے شخص سے حیاء نہ کروں جس سے فرشتے حیاء کرتے ہوں) رواہ مسلم۔

حضرت علیؓ کی خلافت:۔

''ثم لعلی بن ابی طالب رضی الله عنه'' یعنی حضرت عثمانؓ کے بعد ہم حضرت علیؓ کی خلافت کے قائل ہیں، جب حضرت عثمانؓ کو بلوائیوں نے مظلومانہ شہید کر دیا تو لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، البتہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھ اہلِ شام نے بیعت نہیں کی، ادھر حضرت علیؓ کے لشکر میں ان باغیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی جنہوں نے حضرت عثمان ذوالنورینؓ کو شہید کیا تھا، پھر کچھ لوگوں نے غلط سلط افواہیں پھیلائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریقین یعنی حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ وزبیرؓ اور حضرت ام المؤمنین عائشہؓ کے درمیان غیر ارادی طور پر جنگ جمل کا اندوہناک واقعہ پیش آیا، اور پھر حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگ صفین کا حادثہ بھی پیش آیا کیونکہ اہلِ شام کا خیال یہ تھا کہ اگر باغیوں کا جو حضرت علیؓ کے لشکر میں چھائے ہوئے تھے صفایا نہ ہوا تو ان کی سرکشی سے کوئی محفوظ نہ رہ پائے گا، ادھر حضرت علیؓ کا یہ خیال تھا کہ چونکہ میں خلیفہ برحق ہوں اس لئے ان لوگوں کو میری اطاعت کرنی چاہئے اور اس دوران مفسدہ پردازوں اور سبائیوں کی ریشہ دوانیاں اپنا رنگ دکھلا رہی تھیں جس کے نتیجے میں اس خیر اُمت میں ایسی خون ریزی ہوئی کہ آسمان خون کے آنسو رویا اور پھر سب سے بڑھ کر المیہ یہ ہوا کہ افراط وتفریط کرنے والوں کا ایسا طبقہ پیدا ہو گیا کہ جنہوں نے اپنی زبان وقلم کو صحابہ کرامؓ کے

خونِ ناحق سے آلودہ کیا، حالانکہ ان کے متعلق ہمیں قرآن کریم میں یہ رہنمائی فرمائی گئی ہے کہ ان سب حضرات کے متعلق یہ دُعا کریں اور یہی طرزِ عمل رکھیں کہ:

"رَبَّنا اغفر لنا وَلاخوانِنا الذینَ سَبَقُونا بالایمانِ وَلَا تجعَل فی قُلوبنا غلاًّ للذین آمنوا ربَّنا اِنّک رَؤفٌ رحیمٌ".

(الحشر: ۱۰)

شرح العقیدۃ الطحاویہ میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو وہ امام برحق واجب الاطاعت اور خلیفہ بخلافت نبوت ہو گئے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم یؤتی الله ملکه من یشآء" (خلافتِ نبوت تیس سال ہوگی پھر اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے اپنا ملک عطا فرمائیں گے) چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت دو سال تین ماہ تھی اور حضرت عمرؓ کی دس سال چھ ماہ اور حضرت عثمانؓ کی بارہ سال اور حضرت علیؓ کی چار سال نو ماہ اور حضرت حسنؓ کی چھ ماہ، اس طرح تیس سال یہاں آ کر پورے ہو گئے اور مسلمانوں میں سب سے پہلے بادشاہ حضرت معاویہؓ [1] ہیں، وہ خیر ملوک المسلمین (مسلمان بادشاہوں میں سب سے افضل) ہیں لیکن جب حضرت حسن بن علیؓ نے خلافت ان کے سپرد کر دی تو وہ امامِ برحق ہو گئے کیونکہ حضرت علیؓ کے انتقال کے بعد حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر اہلِ عراق نے بیعت کی تھی پھر چھ ماہ کے بعد انہوں نے امر خلافت حضرت معاویہؓ کے سپرد کر دیا اور اس طرح آنحضور ﷺ کی اس پیشگوئی کی صداقت کا ظہور ہوا کہ:

"ان ابنی هذا سید وسیصلح الله به بین فئتین عظیمتین من المسلمین". (متفق علیه)

---

[1] حضرت معاویہؓ اور ملوکیت:۔ مخالفین صحابہؓ نے حضرت معاویہؓ کے سر طرح طرح کے الزامات تھوپ کر انہیں مطعون کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے اس سے ان کی عبقری شخصیت پر تو کیا اثر پڑتا افسوس اس کا ہے کہ بعض وہ لوگ جو اپنے کو جماعتِ اہلِ سنت میں سے کہتے اور سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی سادگی کی بناء پر اس غلط پروپیگنڈہ سے

(میرا یہ بیٹا سید ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو جماعتوں
کے درمیان صلح کرائے گا۔)

حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں، صحیحین میں حضرت سعد بن ابی

متاثر ہوجاتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کے اظہار کے لئے قاضی ابوبکر العربی (متوفی ۵۴۳ھ) کی کتاب انیق ''العواصم من القواصم'' کے اس حاشیہ کا اقتباس نقل کردوں جو مصر کے محقق فاضل محب الدین الخطیب (متوفی ۱۳۸۹) کا لکھا ہوا ہے، جو مختصر ہونے کے ساتھ جامع بھی ہے اور اظہار حقیقت کے لئے کافی ووافی اور اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو شافی بھی۔ وہ ارقام فرماتے ہیں: ''خلافت، ملک اور امارت اصطلاحی عنوانات ہیں جو تاریخ میں اپنے عملی مدلول کے اعتبار سے متکیف ہوتے ہیں، اس میں اعتبار ہمیشہ آدمی کی سیرت وکردار اور عمل کا ہوتا ہے، حضرت معاویہؓ خلافتِ راشدہ کے بیس سالوں میں شام کے حاکم رہے، پھر جب حضرت حسن بن علیؓ نے ان کے لئے بیعت فرمائی تو پورے وطن اسلامی میں مزید بیس سال اسلامی مہمات کی ادائیگی کا فریضہ انجام دیا اور دونوں ہی حالتوں (یعنی جب حاکم رہے اور پھر جب خود سربراہِ حکومت ہوگئے) میں انصاف کے قائم کرنے والے، ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے، باصلاحیت افراد کا احترام فرماتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے بڑھانے کے لئے ان کا تعاون کرتے تھے، جاہلوں کی جہالت کا اپنے حلم وبردباری سے جواب دیتے تھے اور اس طرح ان کے عیوب کا علاج فرماتے تھے، اور تمام امور میں حزم واحتیاط، رفق ونرمی اور استقامت وایمان کے ساتھ شریعتِ محمدیہ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے، غازیوں کی امامت فرماتے اور معاشرہ وسماج کے متعلق امور میں لوگوں کی رہنمائی فرماتے اور جنگوں میں قیادت فرماتے، منہاج السنہ اور المنتقی میں صحابی جلیل ابو درداءؓ کا اہلِ شام سے یہ قول منقول ہے کہ میں نے تمہارے اس امام یعنی حضرت معاویہؓ سے زیادہ کسی کو رسول اللہ ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہ نماز والا نہیں دیکھا، اور میں نے اسی کتاب میں حضرت اعمشؒ کا یہ قول دیکھا جو انہوں نے ان لوگوں سے کہا تھا جنہوں نے ان کی مجلس میں عمر بن عبدالعزیزؒ اور ان کے عدل کا ذکر کیا تھا کہ: ''اگر تم معاویہ کو پاتے تو تمہارا کیا حال ہوتا (کیف لوادرکتم معاویہ) ان لوگوں نے کہا کیا ان کے حلم اور بردباری کے متعلق آپ فرمارہے ہیں، انہوں نے کہا نہیں واللہ! ان کے عدل وانصاف کے متعلق کہہ رہا ہوں، ان کے جادۂ اسلام پر استقامت کا یہ حال تھا کہ ان کی شان میں حضرت قتادہؒ، مجاہدؒ اور ابو اسحاق السبیعیؒ جیسے ائمہ اعلام نے فرمایا: کہ ''کان معاویۃ ھوالمھدی'' (معاویہ ہی مہدی تھے) یہ اس لئے فرمایا کہ حدیث میں حضرت معاویہؓ کے لئے آنحضور ﷺ نے ''مہدی'' یعنی ہدایت یافتہ ہونے کی دعا فرمائی ہے۔ (از مؤلف)

وقاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

"انت منی بمنزلة هارون من موسىٰ الا انه لا نبی بعدی"۔
(تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے

جو شخص حضرت معاویہؓ کی حکومت سے متعلق ان کی سیرت و کردار کا جائزہ لے گا تو اسے کھلی آنکھوں نظر آئے گا کہ شام میں ان کی حکومت عدل و تراحم اور مواسات میں ایک مثالی حکومت تھی، ان کو جب بھی بہتر اور زیادہ بہترین اختیار ملا تو انہوں نے زیادہ بہتر کو بہتر کے مقابلہ میں ترجیح دی، پس اگر چالیس سال کی مدت میں یہ طریق کار مسلمان امیر کو مسلمانوں کی خلافت کا اہل قرار دیتا ہے دراں حالیکہ مسلمان ان سے راضی اور خوش تھے تو درحقیقت وہ یعنی حضرت معاویہؓ "خلیفہ" تھے اور جن لوگوں نے ان کو مَلِک یعنی بادشاہ کا نام دیا ہے وہ بھی اس سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ملوک اسلام میں سب سے زیادہ رحم دل اور سب سے زیادہ صالح تھے۔
فاضل محشی آگے لکھتے ہیں کہ: "جو لوگ حضرت معاویہؓ کی سیرت سے ناواقف ہیں انہیں بہت تعجب ہوگا کہ اگر تم ان سے یہ کہو کہ وہ زاہدین اور صفوۂ صالحین میں سے تھے، امام احمدؒ نے کتاب الزہد میں علی بن ابی حملہ سے ان کے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے معاویہؓ کو دمشق میں منبر پر دیکھا وہ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے اور ان کے جسم پر پیوند لگا ہوا کپڑا تھا، اور حضرت معاویہؓ کے قائدین اور ان کے کبار اصحاب ان کے کپڑوں کو تبرک حاصل کرنے کے لئے ان سے ہدیہ مانگ لیا کرتے تھے، پھر ان میں سے جب کوئی مدینہ منورہ حاضر ہوتا اور اس کے جسم پر یہ کپڑے ہوتے تو لوگ اس کو پہچان لیتے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر اس کی قیمت بڑھاتے۔
دار قطنی نے محمد بن یحییٰ بن غسان سے روایت کیا ہے کہ مشہور قائد اور سپہ سالار ضحاک بن قیس فہری مدینہ منورہ آئے اور مسجد نبوی میں حاضر ہو کر قبر شریف اور منبر کے درمیان نماز پڑھی، ان کے جسم پر پیوند لگی ہوئی چادر تھی جس کو انہوں نے اوڑھ رکھا تھا، وہ حضرت معاویہؓ کے لباسوں میں سے تھی، ابوالحسن البراد نے اس کو دیکھا تو پہچان لیا کہ حضرت معاویہؓ کی چادر ہے، پس ان سے اس کا بھاؤ کرنے لگے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک عام بدوی ہیں یہاں تک کہ ابوالحسن البراد تین سو دینار دینے پر راضی ہوئے۔ ضحاک بن قیس ان کو حویطب بن عبدالعزیٰ کے گھر لے گئے اور دوسری چادر پہن کر وہ چادر ابوالحسن البراد کو بلا قیمت کے دے دی اور کہا کہ آدمی کے لئے یہ بہت برا ہے کہ وہ اپنی چادر فروخت کرے، لو پہن لو، ابوالحسن نے اس کو لے کر بیچ ڈالا پس یہ پہلا مال تھا جو انہیں حاصل ہوا، بحوالہ ابن عساکر ہم نے یہ مثالیں اس لئے پیش کی ہیں تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ حضرت معاویہؓ کی اصل اور حقیقی صورت اس جھوٹی صورت سے مختلف ہے جو ان کے دشمن اور اسلام کے دشمن پیش کرتے ہیں، اب اس کے

بعد کوئی نبی نہیں)۔

اور خیبر کے دن آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کل میں پرچم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں، راوی فرماتے ہیں کہ پس ہم لوگوں نے اس کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کی، آپ نے فرمایا: "علی! کو بلاؤ، ان کو بلایا گیا تو وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ آپ نے ان کی آنکھوں میں اپنا تھوک لگا دیا اور پرچم انہیں عطا فرما دیا۔ بس اللہ نے ان کے ہاتھوں فتح نصیب فرمائی۔ رواہ البخاری۔

"وھم الخلفاء الراشدون الخ" حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں:

-وعظنا رسول اللہ ﷺ موعظة بليغة ذرفت منها العيون ووجلت منها القلوب فقال قائل يارسول الله! كان هذه موعظة مودّع فماذا تعهد الينا فقال اوصيكم بالسمع والطاعة فانه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافاً كثيراً فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدى تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ واياكم ومحدثات الامور فان كل بدعة ضلالة-(رواه الترمذى وصححه)

بعد جس کا جی چاہے وہ حضرت معاویہؓ کو خلیفہ اور امیر المؤمنین کہے، اس لئے کہ سلیمان بن مہران اعمش جو ائمہ علام میں سے اور حافظ حدیث ہیں اور جن کو ان کی صداقت کی بناء پر "مصحف" کہا جاتا تھا حضرت معاویہؓ کو عمر بن عبدالعزیزؒ کے اوپر ان کے عدل و انصاف میں بھی گویا افضل قرار دے رہے ہیں لیکن جس کی آنکھوں میں معاویہؓ کھٹکتے ہی ہوں اور وہ ان کے لئے اس لقب کے ساتھ بخل ہی کا ارادہ کرے تو وہ سن لے کہ معاویہؓ تو اپنے عدل وحلم اور جہاد نیک اعمال کے ساتھ اللہ کے حضور پہنچ چکے اور وہ ہماری اس دنیا میں بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ان کو خلیفہ کا لقب دیا جائے یا ملک کا تو وہ آخرت میں بہ نسبت اس دنیا کے زیادہ زاہد ہیں۔

(العواصم من القواصم، ص: ۲۰۷ تا ۲۱۰ حاشیہ: ۲)۔

رسول اللہ ﷺ نے ہم کو ایک بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں بہہ پڑیں اور دل ڈر گئے ،ایک کہنے والے نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! گویا یہ رُخصت کرنے والے کی نصیحت ہے پس آپ ہمیں کیا وصیت فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں سمع وطاعت کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تمہارے اوپر میری سنت اور میرے بعد ان خلفاء کی سنت لازم ہے جو رشد وہدایت والے ہیں اس کو مضبوطی سے پکڑنا اور دانت سے تھامنا اور نئی چیزوں سے بچنا اس لئے کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔)

خلفائے راشدین کی ترتیب بلحاظ فضیلت مثل ترتیب خلافت کے ہے، اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کو مزید فضیلت حاصل ہے کیونکہ آنحضور ﷺ نے خلفائے راشدین کی سنت کے اتباع کا حکم فرمایا لیکن افعال میں صرف حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما ہی کی اقتداء اور پیروی کا حکم فرمایا چنانچہ ارشاد فرمایا: "اقتدوا باللذین من بعدی ابی بکر و عمر" اور اتباع سنت اور اقتداء بالذات میں فرق ہے فتدبر۔

پس حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا مرتبہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے بڑھا ہوا ہے بعض علماء نیز امام ابوحنیفہؒ سے ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے افضل ہیں، لیکن امام صاحبؒ کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ سے افضل ہیں، اور یہی عامہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔

چنانچہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے بھی حضرت علیؓ سے یہی فرمایا تھا کہ لوگ عثمانؓ کے برابر مقام کسی کو نہیں دیتے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی حیات میں یہ کہا کرتے تھے کہ ان کے بعد ان کی اُمت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، پھر عمرؓ، پھر عثمانؓ، اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے اس کا انکار نہیں فرمایا۔ (رواہ الترمذی بحوالہ نبراس: ص: ۳۰۲)

اور حضرت علیؓ نے خود فرمایا کہ اس اُمت میں سب سے افضل ابوبکرؓ کے بعد عمر فاروقؓ ہیں پھر عثمان ذوالنورینؓ پھر میں ۔رواہ الحافظ ابوسعد السمان فی فصل الخطاب) اور قاضی عیاضؒ نے امام مالکؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا مسلک توقف تھا پھر انہوں نے رجوع کرلیا اور قسطلانی نے سفیان ثوریؒ کے متعلق نقل کیا ہے کہ انہوں نے تفضیل علیؓ سے تفضیل عثمانؓ کی طرف رجوع کرلیا تھا۔ (نبراس:ص:۳۰۲،۳۰۳)

ابوالسختیانیؒ فرماتے ہیں کہ جو علیؓ پر عثمانؓ کی تقدیم کا قائل نہیں اس نے مہاجرین اور انصار کی اہانت کی۔

فضائل عشرہ مبشرہ:۔

قوله:"وان العشرة الذين سمّاهم رسول الله ﷺ و بشرهم بالجنة نشهد لهم بالجنة على ماشهد لهم رسول الله ﷺ وقوله الحق وهم ابوبكر وعمر وعثمان وعلى وطلحة وزبير وسعد وسعيد وعبدالرحمن بن عوف وابوعبيدة بن الجراح وهو أمين هذه الامة رضى الله عنهم اجمعين"۔

ترجمہ: اور وہ دس حضرات جن کو رسول اللہ ﷺ نے نام بنام جنت کی بشارت دی ہے ہم بھی ان کے لئے جنت کی شہادت دیتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے شہادت دی ہے، اور آپ کا قول حق ہے، اور وہ حضرات یہ ہیں: (۱) ابوبکر (۲) عمر (۳) عثمان (۴) علی (۵) طلحہ (۶) زبیر (۷) سعد (۸) سعید (۹) عبدالرحمن بن عوف اور (۱۰) ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم جو اس اُمت کے امین ہیں۔

تشریح:۔ حضرات عشرۂ مبشرہ میں سے خلفائے اربعہ کے فضائل کا ذکر نہایت اختصار کے ساتھ سطور بالا میں ہوچکا، باقی چھ حضرات کے فضائل سے متعلق بھی چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

-اخرج البخاری ومسلم ان رسول اللہ ﷺ جمع لسعد بن ابی وقاص ابویہ یوم احد فقال ارم فداك ابی وامی۔
بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُحد کے دن سعد بن ابی وقاصؓ کے لئے اپنے والدین کو ایک ساتھ کر کے اس طرح فرمایا کہ تیر مارے جاؤ تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔

وعن قیس بن ابی حازم قال رأیت ید طلحة التی وقی بھا النبی ﷺ یوم احد قد شلت۔ (رواہ البخاری)
قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ میں نے طلحہؓ کا وہ ہاتھ دیکھا ہے جس سے انہوں نے احد کے دن نبی کریم ﷺ کا بچاؤ کیا تھا وہ شل ہو گیا تھا۔

وفیہ ایضاً عن ابی عثمان النهدی قال لم یبق مع رسول اللہ ﷺ فی بعض تلك الایام التی قاتل فیھا النبی ﷺ غیر طلحة وسعد۔
اور بخاری ہی میں ابوعثمان نہدی سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ بعض ان دنوں میں جن میں نبی کریم ﷺ نے قتال فرمایا، آپ کے ساتھ طلحہ اور سعد کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

وفی الصحیحین واللفظ لمسلم عن جابر بن عبد اللہ قال ندب رسول اللہ ﷺ الناس یوم الخندق فانتدب الزبیر ثم ندبھم فانتدب الزبیر فقال النبی ﷺ لکل نبی حواری وحواری الزبیر۔
اور صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خندق کے دن لوگوں کو بلایا تو زبیر نے جواب دیا پھر آپ نے بلایا تو پھر زبیر ہی نے جواب دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا

کہ ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرے حواری زبیر ہیں۔

وعن انس بن مالك قال قال رسول الله ﷺ ان لكل امة امينا وان امينا ايتها الامّة ابو عبيدة بن الجراح ۔ رواه مسلم

(حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر اُمت میں ایک امین ہوتا ہے اور اے امت! ہمارے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔

وعن عبدالرحمن بن عوف ؓ ان النبی ﷺ قال ابوبکر فی الجنة وعمر فی الجنة وعلی فی الجنة وعثمان فی الجنة وطلحة فی الجنة والزبیر بن العوام فی الجنة وعبدالرحمن بن عوف فی الجنة وسعید بن زید بن عمرو بن نفیل فی الجنة وابوعبیدة بن الجراح فی الجنة ۔ رواه الامام احمد فی مسنده ورواه ابوبکر بن ابی خیثمه وقدّم فیه عثمان علی علی رضی الله عنهما۔

(حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر جنت میں ہیں اور عمر جنت میں ہیں اور علی جنت میں ہیں اور عثمان جنت میں ہیں اور طلحہ جنت میں ہیں اور زبیر بن عوام جنت میں ہیں اور عبدالرحمن بن عوف ؓ جنت میں ہیں اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل جنت میں ہیں اور ابوعبیدہ بن الجراح جنت میں ہیں۔

چونکہ ان حضرات کے فضائل ومناقب مشہور اور کتب حدیث میں مذکور ہیں اس لئے اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ اصحاب ؓ تمام دیگر صحابہ پر مقدم اور سب سے افضل ہیں، اور روافض نہ صرف انہیں حضرات پر بلکہ حضرت علی ؓ، حضرت عمار ؓ، حضرت مقداد ؓ،

حضرت سلمانؓ وغیرہ چند صحابہ کو مستثنیٰ کر کے سب پر تبرا کرتے، ان سے اظہار بیزاری کرتے ہیں بلکہ ان کی تکفیر وارتداد کے قائل ہیں العیاذ باللہ!

سطور بالا میں جو مختصر فضائل ان حضرات کے اور تمام صحابہ کے مذکور ہوئے انہی سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضرات اصحاب سے کدورت رکھنا در حقیقت نصوص کتاب وسنت کا انکار ہے۔

شیعہ کے بارہ امام:۔

یہ روافض ان عشرۂ مبشرہ بالجنہ کے بجائے بارہ امام کے قائل ہیں جن کو وہ معصوم اور مفترض الطاعۃ اعتقاد کرتے ہیں، جن میں سب سے پہلے امام حضرت علیؓ ہیں ان کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے وصی ہیں یعنی آنحضور ﷺ نے اپنے بعد ان کی خلافت کے لئے وصیت فرمائی تھی، اور پھر اس عقیدہ کی بنیاد پر بے سروپا روایات افتراء کی ہیں، اور دوسرے امام حضرت حسنؓ ہیں، تیسرے حضرت حسینؓ، چوتھے علی بن حسین زین العابدین، پانچویں محمد بن علی الباقر، چھٹے جعفر بن محمد الصادق، ساتویں موسیٰ بن جعفر الکاظم، آٹھویں علی بن موسیٰ الرضا، نویں محمد بن علی الجواد، دسویں علی بن محمد الہادی، گیارہویں حسن بن علی العسکری اور بارہویں محمد بن حسن، یہ سارے کے سارے حضرات خانوادۂ اہلِ بیت کے چشم وچراغ اور اہلِ سنت ہیں حاشا وکلا انہیں رفض وتشیع سے کچھ سروکار نہیں، لیکن روافض نے ان کی محبت کے اظہار میں بے حد غلو سے کام لیا اور حدود کو پھلانگ گئے اور ان کی طرف طرح طرح کے افسانوی اور غیر اسلامی مضحکہ خیز روایات منسوب کر کے پروپیگنڈہ کے زور سے ان کی خوب اشاعت کی۔

اصل واقعہ:۔

حالانکہ اصل صورت واقعہ یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں بارہ اماموں کا تو نہیں بلکہ بارہ خلفاء کا ذکر آیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری وصحیح ومسلم میں حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

"دخلت مع ابی علی النبی ﷺ فسمعته یقول لایزال امر الناس ماضیاً ماولیھم اثناعشر رجلاثم تکلم النبی ﷺ بکلمة خفیت علیّ فسألت ابی ماذاقال النبی ﷺ قال کلھم من قریش"۔

میں اپنے والد کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے سنا آپ فرمارہے تھے کہ لوگوں کا امر برابر جاری اور باقی رہے گا جب تک بارہ آدمی ان کے حاکم ہوں گے پھر نبی کریم ﷺ نے کچھ ارشاد فرمایا جو مجھ سے مخفی رہ گیا تو میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ نے کیا ارشاد فرمایا، انہوں نے کہا کہ وہ سب قریش میں سے ہوں گے۔

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"لایزال ھذا الامر عزیزاً الی اثنی عشر خلیفة"۔

(یہ امر اسلام برابر بارہ خلیفہ تک معزز اور طاقتور رہے گا)۔

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد شرح العقیدة الطحاویہ کے مؤلف نے لکھاہے کہ "وکان الامر کماقال النبی ﷺ" جیسا آنحضور ﷺ نے فرمایا ویسا ہی ہوا اور پھر ان بارہ خلفاء کے نام اس طرح لکھے ہیں:۔

چار خلفائے راشدین، حضرت معاویہؓ، ان کے بیٹے یزید، عبدالملک بن مروان اور ان کے چار لڑکے (ولید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، یزید بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک) اور سلیمان و یزید کے درمیان حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ۔ پھر اس کے بعد امر خلافت میں ضعف و اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا (ثم اخذ الامر فی الاخلال)

(شرح العقیدة الطحاویہ، ص: ۵۵۳ طبع المکتب الاسلامی وھکذا فی شرح الفقہ الاکبر: ۸۴ مطبوعہ مجتبائی دہلی)

لیکن چونکہ ان خلفاء کے زمانہ میں سبائی پارٹی اسلام کو نقصان پہنچانے کی اپنی

20

سازش میں کامیاب نہ ہوسکی بلکہ اس کے برخلاف اسلام اور حدودِ اسلامیہ کو بہت فروغ ہوتا رہا اس لئے وہ ان سے بہت خفا رہتی ہے۔

قوله:"ومن احسن القولَ فی اصحاب رسول الله ﷺ وازواجه الطاهرات من کل دنس وذریاته المقدسین من کل رجس فقد برئ من النفاق"۔

ترجمہ: اور جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب اور ہر گندگی سے پاک ان کی بیویوں اور ہر پلیدگی سے صاف ان کی اولاد کے بارے میں اچھی بات کی وہ نفاق سے بری ہوگیا۔

تشریح مناقبِ اہلِ بیت:۔

فضائلِ صحابہ سے متعلق چند احادیث اوپر مذکور ہوچکی ہیں اب مناقبِ اہلِ بیت کے متعلق چند احادیث ملاحظہ ہوں:

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ احبوا الله لما يغذ وكم من نعمه واحبونی لحب الله واحبوا اهل بيتی لحبی"۔(جمع الفوائد باب مناقب اهل بيت)

(حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ سے محبت کرو کیونکہ وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے غذا دیتا ہے اور مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہلِ بیت سے محبت کرو میری محبت کی وجہ سے)۔

"وعن زيد بن ارقم قال النبی ﷺ لعلی وفاطمة والحسن والحسين انا حرب لمن حاربتم وسلم لمن سالمتم"۔
رواه الترمذی كذا فی جمع الفوائد باب مناقب اهل بيت

حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے علی،

(فاطمہ، حسن اور حسین سے فرمایا کہ جس سے تمہاری لڑائی اس سے میری بھی لڑائی اور جس سے تمہاری صلح اس سے میری بھی صلح۔)

"وعن زيد بن ارقم ؓ قال قال النبي ﷺ الا ايها الناس انما انا بشر يوشك ان يأتي رسول ربي فاجيب وانا تارك فيكم ثقلين اوّلهما كتاب الله فيه الهدىٰ والنور فخذوا بكتاب الله واستمسكوا به فحثّ على كتاب الله ورغّب فيه ثم قال واهل بيتي اذ كركم الله في اهل بيتي فقال له حصين ومن اهل بيته يا زيد! اليس نساءه من اهل بيته قال نساءه من اهل بيته ولكن اهل بيته من حرم الصدقة بعده قال ومن هم قال آل علي وآل عقيل وآل جعفر وآل عباس قال كل هٰؤلاء حرم الصدقة قال نعم"۔ رواه مسلم كذا في مجمع الفوائد باب مناقب اهل البيت۔

(حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لوگو سن لو! میں بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد آجائے پس میں اس کی پکار کو قبول کرلوں اور میں تمہارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے پہلی اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے پس اللہ کی کتاب کو پکڑلو اور اس کو مضبوطی سے تھامو پس اللہ کی کتاب کے لئے اُبھارا اور اس کی ترغیب دلائی پھر فرمایا اور میرے اہلِ بیت اپنے اہلِ بیت کے بارے میں میں تمہیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں، پس حصین نے ان سے کہا اے زید! ان کے اہلِ بیت کون لوگ ہیں؟ کیا آپ کی ازواج آپ کے اہل بیت میں سے نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا کہ

آپ کی ازواج آپ کے اہلِ بیت میں سے ہیں لیکن ان کے اہلِ بیت
وہ لوگ ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے کہا اور وہ لوگ کون ہیں؟
فرمایا آلِ علی، آلِ عقیل، آل جعفر اور آل عباس، عرض کیا ان سب کے
لئے صدقہ حرام ہے؟ فرمایا ہاں۔

"وعن جابرؓ انه سمع عمر یقول للناس حین تزوج
بنت علی الا تھنئونی سمعت رسول الله ﷺ یقول ینقطع
یوم القیامة کل سبب ونسب الا سببی ونسبی"۔ رواہ فی
الاوسط کذا فی جمع الفوائد وعن ابی بکر الصدیقؓ
قال ارقبوا محمدا فی اھل بیته رواہ البخاری

(حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو سنا جب کہ
انہوں نے حضرت علیؓ کی صاحبزادی سے شادی کی تھی کہ لوگوں سے کہہ
رہے تھے تم لوگ مجھے مبارکباد کیوں نہیں دیتے؟ میں نے رسول اللہ ﷺ
کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن ہر سبب ونسب ختم ہو جائے
گا سوائے میرے سبب ونسب کے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت
ہے کہ فرمایا محمد (ﷺ) کا لحاظ رکھو ان کے اہلِ بیت کے بارے میں۔

"فقد برئ من النفاق" حضرت مصنفؒ نے یہ اس لئے فرمایا کہ رفض کی اصل
یہ ہے کہ اس کو ایک منافق زندیق عبداللہ بن سبا نے ایجاد کیا ہے، اس نے جب دیکھا کہ
دینِ اسلام غالب ہو گیا اور اسلامی فتوحات نے دنیا کی سب سے بڑی طاقتوں کو بھی سرنگوں
ہی نہیں کیا بلکہ ان کا خاتمہ کر دیا اور اسلامی حکومت دنیا کے ایک وسیع رقبہ پر چھا گئی تو اس
نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے نفاق کا راستہ اختیار کیا اور بظاہر اپنے آبائی دین
یہودیت سے تائب ہو کر اسلام کی تابعداری ظاہر کی اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے
راستہ سے عوام مسلمین میں رسوخ حاصل کر کے حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کر دیا جو

بالآخران کی مظلومانہ شہادت پر منتج ہوا پھر تو فتنہ کا دروازہ ہی کھل گیا، اس کے بعد کوفہ پہنچ کر اپنے مفسدانہ اغراض کو حاصل کرنے کے لئے حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں بہت غلو سے کام لیا اور ان کی نصرت کا مدعی ہوا جب حضرت علیؓ کو اس کی ان ریشہ دوانیوں کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو طلب کیا تا کہ قتل کردیں لیکن وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ حضرت علیؓ ان لوگوں کی ان تمام خرافاتوں سے بالکل بری اور پاک تھے ان کا حال تو یہ تھا کہ جو شخص ان کو حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ سے افضل قرار دیتا اس کے اوپر افتراء اور بہتان لگانے والی کی سزا نافذ فرماتے۔

قوله: " وعلماء السلف من السابقين والتابعين ومن بعدهم من اهل الخبر والاثر واهل الفقه والنظر لايذكرون الابالجميل ومن ذكرهم بسوء فهو على غير السبيل"۔

ترجمہ: پہلے لوگوں میں سے علمائے سلف کا اور ان کے بعد تابعین میں سے اہلِ خبر واثر یعنی محدثین اور اہلِ فقہ ونظر یعنی فقہاء کا ذکر بھلائی کے ساتھ ہی کیا جائے اور جو شخص ان حضرات کا ذکر برائی کے ساتھ کرے وہ حق کے خلاف راستہ پر ہے۔

تشریح: صحابہؓ، تابعینؒ، محدثین اور فقہاء کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرنا واجب ہے:۔

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اللہ ورسول سے موالات اور تعلق کے بعد مومنین سے موالات اور تعلق رکھے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بعدِ مَاتَبيّنَ لَه الهُدیٰ وَيَتّبِع غَيرَ سَبِيلِ المُؤمنينَ نُوَلِّه مَاتولّٰی وَنُصلِه جَهنمَ وَسآءت

مَصِیراً"۔(النساء:۱۱۵)

(اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہو لے گا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے جانے کی)۔

خصوصاً ان حضرات سے جو انبیاء کے وارث ہیں، جنہیں اللہ نے منارۂ رشدو ہدایت بنایا ہے اور جن کی ہدایت اور تفقہ فی الدین پر مسلمانوں کا اجماع اور اتفاق ہو چکا ہے، یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے نائب آپ کی سنتوں کو زندہ کرنے والے اور یہ سارے کے سارے محدثین، ائمہ اور فقہاء آنحضور ﷺ کی اتباع کے وجوب پر متفق ہیں لیکن اس کے باوجود بھی اگر ان ائمہ رشد و فقہائے اسلام کا کوئی قول حدیث صحیح کے خلاف ہو تو اس میں وہ معذور ہیں اور ان کی معذوری کے اسباب ان تین میں سے کوئی ایک ہے:

(۱) انہوں نے اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ کا قول اور حدیث نہیں باور کیا۔

(۲) انہوں نے یہ سمجھا کہ اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کی مُراد یہ نہیں ہے۔

(۳) انہوں نے اس حکم کو منسوخ سمجھا۔

ان حضرات کا ہم پر اور تمام اُمت پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے احکام شریعت ہم تک بے کم وکاست پہنچائے اور تشریح طلب امور کی توضیح وتفصیل فرما کر ہمارے لئے شریعتِ مطہرہ پر عمل کرنا آسان فرمادیا۔ پھر ان میں سے چار ائمہ مجتہدین کی تقلید واتباع پر اُمت کا اجماع ہو چکا ہے کیونکہ انہی چار حضرات کی فقہ تمام ابواب کی حاوی اور ان کی روایات محفوظ اور مدوّن ہیں ان میں سے اوّل وافضل امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ ہیں کیونکہ آپ تابعی ہیں پھر امام مالکؒ ہیں جو تبع تابعی ہیں، پھر امام شافعیؒ ہیں جو امام مالکؒ اور امام محمدؒ تلمیذ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں پھر امام احمد بن حنبلؒ ہیں جو امام شافعیؒ کے تلامذہ کے درجہ میں ہیں۔ فرضی اللہ عنھم وارضاھم ۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین

سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا ربنا انك رؤ ف رحیم۔

قوله:"ولانفضل احدمن الاولیاء علی احدمن الانبیاء علیهم السلام ونقول نبی واحد افضل من جمیع الاولیاء"۔

ترجمہ:اور ہم کسی ولی کوکسی نبی پرفضیلت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ایک نبی تمام اولیاءسے افضل ہے۔

تشریح:کسی بھی ولی کامرتبہ کسی نبی سے نہیں بڑھ سکتا:۔

اس سے مقصودگمراہ اورجاہل متصوفین پرردفرماناہے ورنہ اہلِ حق اوراہلِ استقامت مشائخ شریعت غرّ اءپرخودبھی قائم رہتے ہیں اوردوسروں کوبھی اسی کاحکم فرماتے ہیں،سارے اولیاءنے مقامِ ولایت پایاہی ہے نبی کی اتباع کرکےتووہ نبی سے افضل کس طرح ہوسکتے ہیں کہ وہ تابع اورمطیع ہیں اورنبی ورسول تمام اُمت کے مطاع اورمتبوع ہیں،اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَمَآ اَرسلنا مِن رَّسول اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذنِ الله"۔

(النساء:٦٤)

(اورہم نے تمام پیغمبروں کوخاص اسی واسطے مبعوث فرمایاہے کہ بحکمِ خداوندی ان کی اطاعت کی جائے)۔

حضرت ابوعثمان نیشاپوریؒ فرماتے ہیں کہ جس نے سنت کواپنے نفس پرقول وفعل میں حاکم بنایاوہ حکمت ودانائی کی باتیں بولےگااورجس نے خواہش نفسانی کوحاکم بنایاوہ بدعت کی باتیں کرےگا۔کسی عارف کاقول ہے کہ جس نے بھی کوئی سنت چھوڑی اپنے نفس کے کبرکی وجہ سے چھوڑی کیونکہ اس نے سنت کے مقابلہ میں اپنی من مانی کوفوقیت دی تواس سے ظاہرہواکہ اس نے اپنی خواہشِ نفس کوبڑاسمجھااورسنت کوحقیر جانا،والعیاذباللہ تعالیٰ۔

قوله: "ونؤمن بماجاء من کراماتهم وصح عن الثقات من روایاتهم"۔

ترجمہ: اور اولیاء کی ان کرامات پر ہم یقین رکھتے ہیں جو ثقہ اور معتبر حضرات کی روایت سے بطریق صحیح ثابت ہیں۔

تشریح: اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں:۔

ولی کی تعریف یہ ہے:

"الولی هوالعارف بالله تعالیٰ وصفاته بحسب مایمکن حسب بفتحتین اوبالسکون ومامصدریة ای بقدر الامکان المواظب صفة العارف ای الملازم علی الطاعات حتی قیل ان الولی الکامل لایترك المندوب المجتنب عن المعاصی حتیٰ انه یخرج بالکبیرة واصرار الصغیرة عن الولایة المعرض عن الانهماك ای الاستغراق فی اللذات والشهوات ارادالمباحات واما الاجتناب عن کل مایلذ و یشتهی فلیس من الطریقة المحمدیة بل من فعل رهبان النصاریٰ والهنود وقدصح النهی عنه فی الاحادیث"۔(نبراس:ص:۲۹۵)

(ولی وہ ہے جس کو بقدر امکان اللہ تعالی کی ذات وصفات کی معرفت حاصل ہو اور طاعات کا پابند ہو یہاں تک کہ کہا گیا کہ ولی کامل مستحب کو بھی ترک نہیں کرتا، جو معاصی سے مجتنب ہو یہاں تک کہ کبیرہ کے ارتکاب اور صغیرہ کے اصرار سے ولایت سے خارج ہوجائے گا، اور جو لذات وشہوات میں انہماک سے اعراض کرنے والا ہو، اس سے مراد مباح لذات وشہوات ہیں، رہا ہر لذت وشہوت سے اجتناب تو یہ طریقہ

محمدیہ سے نہیں ہے بلکہ نصاریٰ اور ہندو راہبوں کا فعل ہے۔صحیح احادیث میں اس سے نہی وارد ہے۔

معجزہ اور کرامت کی تعریف:۔

متقدمین کے نزدیک معجزہ و کرامت ہر امر خارق عادت کو کہتے ہیں، لیکن اکثر متأخرین کے نزدیک دونوں میں فرق ہے، معجزہ نبی کے لئے اور کرامت ولی کے لئے خاص ہے، یعنی جب کوئی امر خارق عادت نبی سے ظاہر ہو تو وہ معجزہ ہے اور جب ولی سے ظاہر ہو تو کرامت ہے۔معتزلہ کرامات کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر ولی سے خوارق عادات کا ظہور ہو تو کرامت اور معجزہ میں التباس واشتباہ ہو جائے گا اور نبی و غیر نبی میں تمیز نہ ہو پائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ (۱) نبی معجزہ کے ساتھ نبوت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور ولی کرامت کے ساتھ نبوت کے مدّعی نہیں ہوتے۔(۲) اولیاء کی کرامات درحقیقت انبیاء کے معجزے ہی ہیں کیونکہ ولی کو یہ کرامت نبی کے اتباع کی برکت ہی سے حاصل ہوئی ہے۔

تمام اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک اولیائے کرام کی کرامات حق ہیں جو کتاب وسنت اور بزرگانِ سلف کی تاریخ سے بطریق تواتر ثابت ہے، نیز ہر زمانہ میں اولیائے صادقین سے اس کا ظہور مشاہدہ میں آتا رہتا ہے اور قیامت تک آتا رہے گا۔قرآن کریم میں حضرت مریمؑ کے پاس بے موسم کے پھل آنے کا اور حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا کے چشم زدن میں تختِ بلقیس اُٹھا لانے کا ذکر موجود ہے، یا مثلاً حضرت عمرؓ نے مدینہ منورہ میں خطبہ دیتے ہوئے مقام نہاوند میں مصروف جہاد اسلامی لشکر کو دشمن کی زد میں آتا دیکھ لیا تھا اور وہیں سے سپہ سالارِ لشکر حضرت ساریہؓ کو خطاب کرکے فرمایا:"یاساریۃ الجبلَ الجبلَ" جس کو انہوں نے سنا اور دشمن کے مکر سے بچ گئے یا مثلاً حضرت خالدؓ کا زہر قاتل کا پیالہ بسم اللہ کرکے پی جانا اور اس کا کچھ اثر نہ ہونا یہ اور اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن کا انکار کرنا تاریخ کے انکار کے مترادف ہے۔

خارق عادت کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) محمود فی الدین: وہ خارق جس سے کوئی دینی فائدہ حاصل ہو جو شریعت میں مامور بہ ہو خواہ واجب ہو یا مستحب۔

(۲) مباح: جس سے کوئی امر مباح حاصل ہو مثلاً اللہ تعالی کی طرف سے کوئی دنیوی نعمت حاصل ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

(۳) مذموم: جو کسی امر منہی عنہ کو متضمن ہو خواہ نہی تحریمی ہو یا تنزیہی۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اصل چیز جس پر نجات کا مدار ہے اور جس سے درجات کی بلندی حاصل ہوتی ہے وہ سنت کا اتباع اور شریعت پر استقامت ہے، حضرت ابو علی جوزجانی ؒ فرماتے ہیں:

"کن طالباً للاستقامة لاطالباً للکرامة فانك نفسك متحرکة فی طلب الکرامة وربك یطلب منك الاستقامة"۔

تم استقامت کے طالب بنو کرامت کے طالب نہ بنو اس لئے کہ تمہارا نفس تو طلب کرامت میں متحرک ہے اور تمہارا پروردگار تم سے استقامت کا مطالبہ کر رہا ہے۔

فراست کی تین قسمیں ہیں:۔

اس موقع پر یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ایک چیز ہے فراست یعنی تاڑ لینا اور ظاہر نظر سے باطن کو معلوم کر لینا جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اِتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله ثم قرأ قوله تعالی: اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِلْمُتَوَسِّمِیْنَ ای المتفرسین"۔ رواہ الترمذی من روایة ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ بحوالہ شرح الفقه الاکبر: ص:۹٦)

(مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی "بے شک اس میں اہلِ فراست کے لئے ضرور نشانیاں ہیں)۔

پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ فراست کی تین قسمیں ہیں:

(۱) فراستِ ایمانیہ: اس کا سبب وہ نور ہے جو اللہ تعالی بندہ کے دل میں ڈال دیتا ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خیال ہے جو دل میں اچانک آجاتا ہے اور اس پر اس طرح دفعۃً گذرتا ہے جس طرح شیر دفعۃً شکار پر حملہ آور ہوجاتا ہے اور اسی سے وہ مشتق ہوتا ہے، یہ فراست ایمان کی قوت کے لحاظ سے ہوتی ہے، جس کا ایمان زیادہ قوی ہوتا ہے اس کی فراست زیادہ تیز ہوتی ہے، حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ فراست مکاشفۃ النفس اور معاینۃ الغیب کو کہتے ہیں اور یہ ایمان کے مقامات میں سے ہے۔انتہی

(۲) فراستِ ریاضیہ: یہ بھوک، بیداری اور خلوت گزینی سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ نفس جب موانع اور علائق سے علیحدگی اور تجرد اختیار کرتا ہے تو بقدر تجرد اس کو فراست اور کشف حاصل ہوجاتا ہے، فراست کی یہ قسم مومن اور کافر دونوں کو حاصل ہوسکتی ہے، یہ نہ ایمان کی دلیل ہے اور نہ ولایت کی، اس سے نہ حق واضح ہوتا ہے اور نہ صراطِ مستقیم مکشوف ہوتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے کہ اہلِ باطل جب ریاضت ومجاہدہ اور جوگ وغیرہ کے ذریعہ اس کو حاصل کر لیتے ہیں تو عوام اور جاہل مسلمان تک ان کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں، اس سے بہت ہوشیار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے۔ اللھم احفظنا والمسلمین جمیعاً۔

(۳) فراستِ خِلقیہ: یہ وہ فراست ہے جس پر اطباء نے کتابیں تصنیف کی ہیں اس میں انسانی صورت اور نقوش کو دیکھ کر اس کے اخلاق کا اندازہ کر لیتے ہیں کیونکہ خَلق اور خُلق میں بہت ربط اور تعلق ہے مثلاً حد سے زیادہ سر کے چھوٹا ہونے کو بیوقوفی کی علامت سمجھنا اور سینہ کی وسعت سے اخلاق کی وسعت پر استدلال کرنا وغیرہ وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ افلاطون

اس فن میں بہت ماہر تھاوہ انسان کی تصویر دیکھ کراس کے اخلاق کااندازہ کرلیتا تھا۔

قولہ:" ونؤمن باشراط الساعة من خروج الدجال ونزول عیسیٰ بن مریم من السماء وخروج یاجوج وماجوج ونؤمن بطلوع الشمس من مغربہاوخروج دابة الارض من موضعہا"۔

ترجمہ:اورہم قیامت کی نشانیوں پرایمان رکھتے ہیں ،مثلاً دجّال کا ظہور،عیسیٰ بن مریمؑ کا آسمان سے نزول،اورہم سورج کے اس کے مغرب سے نکلنے پراوردابۃ الارض کےاس کی جگہ سے نکلنے پرایمان رکھتے ہیں۔

تشریح:علامات قیامت پرایمان:۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ فرماتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضرہوا،آپ چمڑے کے خیمہ میں تشریف فرماتھے،آپ نے ارشادفرمایا کہ میں قیامت سے پہلے چھ چیزیں شمارکرتاہوں،(۱)میری موت ،(۲)پھرفتحِ بیت المقدس، (۳)پھرویرانی جوتمہارے درمیان اس طرح پھیلے گی جیسے بکریوں کی قعاص بیماری[۱] (۴)پھرمال کی بہتات کہ ایک آدمی کوسودینار دیئے جائیں گےلیکن وہ خوش نہ ہوگا،(۵)پھرایک فتنہ کہ عرب کاکوئی گھرنہ بچے گاجس میں وہ داخل نہ ہو،(۶)پھرایک صلح جوتمہارے اوربنی الاصفر(رومیوں)کے درمیان ہوگی ،پھروہ بدعہدی کریں گے اورتمہارے پاس اسی(۸۰)جھنڈوں کے نیچے آئیں گے۔ہرجھنڈے کے نیچے بارہ ہزارہوں گے۔(رواہ البخاری وابوداؤدوابن ماجہ والطبرانی)

حضرت حذیفہ بن اُسیدؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے۔ہم لوگ قیامت کاچرچاکررہے تھے۔آپ نے فرمایاکہ تم لوگ کس چیز کاذکر کررہے ہو؟لوگوں نے عرض کیاقیامت کا،آپ نے فرمایاوہ ہرگزنہیں آئے گی یہاں تک

[۱]۔ قُعاص:یہ ایک بیماری ہے جوسینہ میں ہوتی ہےاورگردن کوتوڑدیتی ہے۔

کہ تم لوگ اس سے پہلے دس نشانیاں دیکھ لو، پھر آپ نے (۱) دھواں اور (۲) دجال اور (۳) دابّہ اور (۴) مغرب سے سورج کے نکلنے کا اور (۵) عیسیٰ بن مریم کے نزول کا اور (۶) یاجوج وماجوج کا اور تین خسوف کا ذکر فرمایا، ایک خسف مشرق میں ہوگا اور ایک مغرب میں اور ایک جزیرۃ العرب میں، اور اس کے آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو ان کے محشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ رواہ مسلم

اور حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو کانے دجال سے ڈرایا ہے، سن لو! وہ کانا ہے اور تمہارا رب کانا نہیں ہے اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ک۔ف۔ر لکھا ہوا ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔ ایک روایت میں ک۔ف۔ر کی تفسیر کافر سے کی ہے۔

اور دابۃ الارض کے نکلنے کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح آیا ہے:

"وَاذا وَقَعَ القولُ علیھم اخرجنا لھم دابۃً من الارضِ تُکَلِّمُھم اَنَّ النَّاسَ کانوا بِاٰیٰتنا لایوقنون"۔ (النمل: ۲)

(اور جب وعدہ ان پر پورا ہونے کو ہوگا تو ہم ان کے لئے ایک جانور نکالیں گے جو ان سے باتیں کرے گا کہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین نہیں لاتے تھے)۔

اور مغرب سے طلوع آفتاب کا ذکر اس آیت میں ہے:

"ھَل یَنظُرُونَ اِلّاَاَن تأتیھم الملائکۃُ اویأتِیَ ربك اویأتی بعضُ اٰیتِ ربك یومَ یأتی بعضُ اٰیتِ ربك لاینفعُ نفساً ایمانھالم تکن اٰمنت من قبلُ او کسبت فی ایمانھا خیراً قل انتظِرُوا انّامنتظرونَ"۔ (الانعام: ۱۵۸)

(کیا یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آئے

جس روز آپ کے رب کی بڑی نشانی آپہنچے گی ایسے شخص کا ایمان اس کے
کام نہیں آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہوگا یا اس نے اپنے ایمان
میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہوگا آپ فرما دیجئے کہ تم منتظر رہو ہم بھی منتظر
ہیں)۔

اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ سورج اپنے مغرب سے نہ نکلے پس جب لوگ اس کو دیکھیں گے تو اس پر ایمان لائیں گے یہ وہ وقت ہوگا کہ کسی ایسے نفس کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو۔

قوله: "ولانصدق كاهنا ولاعرّافاً ولامن يدعى شيئاً يخالف الكتاب والسنة واجماع الامة"۔

ترجمہ: اور ہم کسی کاہن اور عرّاف کی اور ایسے شخص کی جو کسی ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو کتاب وسنت اور اجماعِ امت کے خلاف ہو تصدیق نہیں کرتے۔

تشریح:۔ صحیح مسلم اور مسند احمد میں ہے کہ صفیہ بنت ابی عبید نے نبی کریم ﷺ کی بعض ازواج سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من اتى عرّافا فسأله عن شئ لم يقبل له صلوٰة اربعين ليلة"۔

(جو شخص کسی عراف (نجومی) کے پاس آئے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھے تو اس کی چالیس رات کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی)۔

نیز مسند میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"من اتى عرّافا او كاهناً فصدقه بما يقول فقد كفر بما انزل على محمد"۔

(جو شخص عراف یا کاہن (غیب کی باتیں بتانے والے) کے پاس آئے
اور جو کچھ وہ کہے اس کی تصدیق کرے تو اس نے اس چیز کے ساتھ
کفر کیا جو محمد (ﷺ) پر نازل کی گئی ہے)۔

اسی سے اندازہ کرنا چاہئے کہ جب پوچھنے والے کا یہ حال ہے تو خود عراف وکاہن کا کیا حال ہوگا؟

مسند احمد ہی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہان (کاہنوں) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: "لیسوا بشیٔ "(ان کی کچھ حقیقت نہیں ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ لوگ کبھی ایسی باتیں کرتے ہیں جو سچ ہوتی ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ وہ حق بات ہوتی ہے جس کو جن اُچک لاتا ہے اور اس کو اپنے دوست کے کان میں رکھ دیتا ہے، پھر وہ لوگ اس میں سو جھوٹ سے زیادہ ملا دیتے ہیں۔

پھر یہ لوگ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ان میں سے بعض جھوٹے اور فریب اور مکرو دغا میں طاق ہوتے ہیں، بعض یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جنات ان کے تابع ہیں، بعض یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی تاویلات رجال الغیب سے ہوتی ہیں اور رجال الغیب کی من مانی تشریح کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رجال الغیب جنات ہی کو کہتے ہیں چونکہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اس لئے ان کو رجال الغیب کہتے ہیں، اور بعض تو تحریم حلال اور تحلیل حرام کے مرتکب اور نبوت کے مدعی ہوجاتے ہیں، اور بعض سحر وجادو کے ذریعہ لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے ہیں، اور بسا اوقات دین وعقیدہ کے فسادِ عظیم کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دُنیوی ضرر عظیم میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں، انہیں مسحور کر دیتے ہیں حتیٰ کہ قتل بھی کر دیتے ہیں۔ چونکہ غلط قسم کے ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے سب سحر میں داخل ہیں اور ان میں ابتلائے عام ہے اس لئے اس کی ضروری تفصیل حوالہ قلم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سحر کی تعریف اور اس کی حقیقت:۔

سحر بالکسر لغت میں ہر ایسے اثر کو کہتے ہیں جس کا سبب ظاہر نہ ہو۔ (قاموس) خواہ وہ سبب معنوی ہو جیسے جنات وشیاطین کا اثر یا مسمریزم میں قوتِ خیالیہ کا اثر یا محسوسات ہوں مگر وہ محسوسات مخفی ہوں جیسے مقناطیس کی کشش لوہے کے لئے جبکہ مقناطیس نظروں سے پوشیدہ ہو یا دواؤں کا اثر جبکہ وہ دوائیں مخفی ہوں یا نجوم وسیارات کا اثر۔ مگر عُرف عام میں جادو ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن میں جنات وشیاطین کے عمل کا دخل ہو یا قوتِ خیالیہ مسمریزم کا یا کچھ الفاظ وکلمات کا۔

اور اصطلاحِ قرآن وسنت میں سحر ایسے امر عجیب کو کہا جاتا ہے جن میں شیاطین کو خوش کر کے اس کی مدد حاصل کی گئی ہو، شیاطین کی امداد ایسے اقوال وافعال سے حاصل ہوتی ہے جو شیطان کو پسند ہیں اسی لئے سحر صرف ایسے ہی لوگوں کا کامیاب ہوتا ہے جو گندے اور نجس رہیں، پاکی اور اللہ کے نام سے دور رہیں۔

سحر کی اقسام:۔

امام راغب اصفہانی "مفردات القرآن میں لکھتے ہیں کہ سحر کی مختلف قسمیں ہیں: ایک قسم تو محض نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی جیسے بعض شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی چالاکی سے ایسے کام کر لیتے ہیں کہ عام لوگوں کی نظریں اس کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔

دوسری قسم اس طرح کی تخییل اور نظر بندی ہے جو بعض اوقات شیاطین کے اثر سے ہوتی ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ سحر کے ذریعہ ایک شے کی حقیقت ہی بدل جائے جیسے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنادیں، امام راغب اصفہانی "، ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات نے اس سے انکار کیا ہے کہ سحر کے ذریعہ کسی چیز کی حقیقت بدل جائے بلکہ

سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی ہی تک ہو سکتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے مگر جمہور علماء کی تحقیق یہ ہے کہ انقلاب اعیان میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے نہ شرعی، مثلاً کوئی جسم پتھر بن جائے یا ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہو جائے اور فلاسفہ کا جو یہ قول مشہور ہے کہ انقلابِ حقائق ممکن نہیں، ان کی مراد حقائق سے محال، ممکن، واجب کی حقیقتیں ہیں کہ ان میں انقلاب عقلاً ممکن نہیں کہ کوئی محال ممکن بن جائے یا کوئی ممکن محال بن جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سحر کی یہ تینوں قسمیں ممکن الوقوع ہیں۔

سحر کے احکام شرعیہ:۔

اصطلاحِ قرآن وسنت میں جس کو سحر کہا گیا ہے وہ کفر اعتقادی یا کم از کم کفر عملی سے خالی نہیں ہوتا، جس سحر میں کوئی عملِ کفر اختیار کیا گیا ہو جیسے شیاطین سے استغاثہ واستمداد یا کواکب کی تاثیر کو مستقل ماننا یا سحر کو معجزہ قرار دے کر اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا وغیرہ تو یہ سحر باجماع کفر ہے اور جس میں یہ افعالِ کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو وہ گناہِ کبیرہ ہے۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ سحر کفر اعتقادی یا عملی سے خالی نہیں تو اس کا سیکھنا اور سکھانا بھی حرام ہوا، اس پر عمل کرنا بھی حرام ہوا، البتہ اگر مسلمانوں سے دفع ضرر کے لئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے (شامی، عالمگیری)

تعویذ، گنڈے وغیرہ جو عامل کرتے ہیں ان میں بھی اگر جنات وشیاطین سے استمداد ہو تو یہ سحر کے حکم میں ہیں اور حرام ہیں اور اگر الفاظ مشتبہ ہیں معنی معلوم نہ ہوں اور شیاطین اور جنوں سے استمداد کا احتمال ہو تو بھی حرام ہے۔ اور اگر صرف مباح اور جائز امور سے کام لیا گیا ہو تو اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ اس کو کسی ناجائز مقصد کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ اور اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں۔ (فتاویٰ قاضی خان وشامی) (ماخوذ از معارف القرآن مع

اختصار: ج: اول ص: ۲۸۰، ۲۷۴)

ساحر کا حکم:۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور جمہور علماءؒ کے نزدیک ساحر کا قتل کر دینا واجب ہے، وھذا ھو الماثور عن الصحابة کعمر وابنه وعثمان وغیرھم۔ پھر ان حضرات کا اس میں اختلاف ہے کہ اس سے توبہ کرنے کو کہا جائے گا یا نہیں؟ اور کیا ارتکاب سحر سے وہ کافر ہو جائے گا یا اللہ کی زمین میں فساد برپا کرنے کے جرم میں قتل کیا جائے گا، ایک جماعت کا قول ہے کہ اگر اس نے سحر کے ذریعہ کسی کو قتل کیا ہے تو اس کو قتل کیا جائے ورنہ قتل کے علاوہ دوسری سزا دی جائے بشرطیکہ اس کے قول و عمل میں کوئی امر کفر کانہ ہو، وھذا ھو المنقول عن الشافعی وھو قول فی مذھب احمدؒ۔ (شرح العقیدة الطحاویہ: ص: ۵۶۹)

قوله: "ونریٰ الجماعة حقاً وصواباً والفرقة زیغاً وعذاباً"۔

ترجمہ: اور ہم اتحاد و اجتماعیت کو حق و صواب اور اختلاف و افتراق کو گمراہی و عذاب سمجھتے ہیں۔

تشریح: ہمارے نزدیک اجتماعیت ہی حق و صواب ہے:۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا واختلفوا من بعد ما جاء هم البينات واولئك لهم عَذَابٌ عظيمٌ"۔ (آل عمران: ۱۰۵)

(اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی اور باہم اختلاف کر لیا ان کے پاس احکامِ واضحہ پہنچنے کے بعد۔ ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی)۔

اور فرمایا: "واعتصموا بحبلِ الله جميعاً ولا تفرّقوا" (آل عمران: ۱۰۳)

(اور مضبوط پکڑے رہو اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو اور باہم نا اتفاقی مت کرو) ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"اِنَّ الذین فرّقوا دِینھم و کانوا شیعاً لست منھم فی شیٔ انما امرھم الی اللہ ثُمَّ یُنبئھم بما کانوا یفعلونَ"۔

(الانعام:۱۵۹)

(بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جُدا جُدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں بس ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے پھر وہ ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دے گا)۔

اور فرمایا: "وَلایزالونَ مختلفینَ الامن رحم ربكَ"۔(ھود:۱۱۹) (اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر آپ کے رب کی رحمت ہو)۔

اور صحیحین میں روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

"قُل ھُوَ القادرُ علیٰ ان یبعثَ علیکم عذاباً من فوقکم او من تحت ارجلکم"۔

(آپ کہیے کہ اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے یا تمہارے پاؤں تلے سے)۔

تو آپ نے فرمایا: "اعوذ بوجھك" (اے اللہ! میں تیری ذات کی پناہ میں آتا ہوں) "اویلبسکم شیعاً ویذیق بعضکم بأس بعض" (یا تم کو گروہ گروہ کر کے ایک دوسرے سے بھڑا دے اور تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھا دے) تو آپ نے فرمایا: "ھاتان اھون" (یہ دونوں ہلکے ہیں)۔

ان سب کے مجموعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اختلاف تو بہر حال ہو کر رہے گا لیکن جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور رحم ہوگا اور وہ سنت پر قائم اور جماعت کے ساتھ وابستہ ہوں گے، وہ ہلاکت سے محفوظ ہوں گے، یہی وہ لوگ ہیں جو "ما انا علیہ واصحابی" پر قائم

اور اہل سنت والجماعت کے معزز لقب سے ملقب ہیں ۔امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ جب آنحضور ﷺ کے صحابہ کرامؓ بکثرت موجود تھے اسی وقت فتنہ ظاہر ہو گیا تو تمام صحابہ کرامؓ نے اس پر اجماع کرلیا کہ ہر وہ خون یا مال یا زخم جو قرآن کی تاویل سے حاصل ہو وہ ہدر ہے،ان کو زمانہ جاہلیت کی جگہ پر رکھو۔(انزلوھم منزلۃ الجاھلیۃ)

امام مالکؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتی تھیں کہ لوگوں نے اس آیت پر عمل چھوڑ دیا ہے:

"وان طائفتٰن من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احداھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتیٰ تفیء الیٰ امر اللہ"۔(الحجرات:۹)

(اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے)۔

اس لئے کہ مسلمان جب باہم لڑ پڑے تو ان کے درمیان بموجب حکمِ خداوندی صلح کرانا واجب تھا اور جب اس پر عمل نہ ہوا تو فتنہ اور جاہلیت ہوگئی اور پھر نزاع واختلاف کا تسلسل قائم ہو گیا۔

ائمہ اور مجتہدین کا اختلاف اور ان کا طرزِ عمل:۔

اب رہا وہ اختلاف جو مجتہدین امت اور ائمہ کے درمیان واقع ہوا ہے تو درحقیقت یہ اختلاف ان امور اور احکام میں ہوا ہے جو نصوص کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ نہیں موجود ہیں اور ان وارثانِ ونائبانِ رسالت علماء پر یہ واضح طور پر ظاہر نہ ہو پایا کہ شارع علیہ السلام کا منشاء اس میں کیا ہے؟

تو اس میں انہوں نے اپنے اجتہاد کے موافق منشاء شارع معلوم کر کے اس کے حکم

کو واضح کیا، چنانچہ صحابہ کرامؓ بھی اس طرح کے اجتہادی مسائل میں باہم اختلاف فرمایا کرتے تھے، لیکن اس میں ان تمام حضرات کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ایک دوسرے پر نہ طعن وطنز کرتے اور نہ تکفیر وتفسیق اور نہ جدال وقتال، پس یہ اختلاف اگر ان حدود کی رعایت کے ساتھ ہو تو یہ اختلاف امت کے لئے باعثِ رحمت ہے، ائمہ اربعہؒ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ اسی طرح کا ہے اس لئے ان حضرات کا اختلاف واقعی امت کے لئے رحمت ہے **کمالا یخفی علی العلماء المحققین والفقهاء المدققین**، اور اگر حدود کی رعایت نہ ہو اور ایک دوسرے کی تفسیق وتضلیل اور تشدد پر آمادہ ہوں یا نصوصِ صریحہ اور دلائلِ واضحہ موجود ہونے کے باوصف اپنے اجتہادی نظریہ پر اڑے ہوئے ہوں تو یہ اختلافِ مذموم اور بدعتِ موصلہ الی النار ہے۔ اعاذنا اللہ منہا۔

قوله: "ودين الله عزّوجل فى الارض والسماء واحد وهو دين الاسلام قال الله تعالى: "اِنَّ الدِّينَ عِندَ اللهِ الاسلام" وقال الله تعالى: "وَرَضِيتُ لكم الاسلامَ ديناً" وهوبين الغلو والتقصيروبين التشبيه والتعطيل وبين الجبروالقدروبين الامن واليأس".

ترجمہ: اور اللہ کا دین زمین وآسمان میں ایک ہی ہے، اللہ تعالی نے فرمایا: بے شک دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے" اور فرمایا: اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے پسند کرلیا" اور وہ غلو اور تقصیر اور تشبیہ وتعطیل اور جبر وقدر اور بے خوفی اور ناامیدی کے درمیان ہے۔

تشریح: دین صرف ایک ہے:۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "انامعاشر الانبیاء دیننا واحدٌ" (ہم جماعتِ انبیاء کا دین ایک ہے) درحقیقت دین کے اصول

ہر نبی کے زمانہ میں ایک رہے ہیں البتہ احکام وشرائع حسب اختلافِ زمان واحوال بدلتے رہے ہیں چنانچہ ارشاد ہے: "وَلِکُلٍّ جعلنا منکم شِرعَۃً ومنھاجاً" (المائدہ:۴۸) (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی)۔

"بین الغلو والتقصیر" اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یآَھلَ الکتابِ لاتغلُوا فی دینکم غیرَ الحق" (المائدہ:۷۷) آپ فرمائیے کہ اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق کا غلومت کرو) اور فرمایا:

"یآَیھا الذین اٰمنوا لاتحرموا طیبات مآ احلَّ اللہُ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین وکلوا مما رزقکم اللہُ حلالاً طیباً واتقوا اللہَ الذی انتم بہ مؤمنونَ"۔

(المائدۃ:۸۷۔۸۸)

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور حدود سے آگے مت نکلو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب و پاکیزہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو)۔

اس آیت کے سبب نزول میں بروایت ابن جریج حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ عثمان ابن مظعونؓ اور علی بن ابی طالبؓ اور ابن مسعودؓ اور مقداد بن الاسودؓ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ نے تبتل اختیار کرلیا اور گھروں میں بیٹھ گئے اور عورتوں سے علیحدگی اختیار کرلی اور ٹاٹ پہن لئے اور عمدہ کھانوں اور اچھے لباس کو حرام کرلیا مگر اتنا ہی جتنا بنی اسرائیل کے اہل سیاحت (زاہدین) کھاتے اور پہنتے تھے اور سب نے خصی بن جانے کا ارادہ کرلیا اور راتوں کو جاگنے اور دن میں روزے رکھنے کا پختہ عزم کرلیا تو یہ آیت نازل ہوئی: "یآَیھا الذین اٰمنوا لاتحرموا طیبات مآ احلّ اللہُ لکم الآیۃ، جب یہ آیت

ان کے متعلق نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے ان کو بلوا بھیجا اور فرمایا:

"ان لانفسکم علیکم حقا وان لاعینکم علیکم حقا صوموا وافطروا وصلوا وناموا فلیس منا من ترک سنتنا فقالوا اللھم سلمنا واتبعنا ما انزلت"۔

(بے شک تمہارے نفسوں کا تمہارے اوپر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تمہارے اوپر حق ہے، روزہ رکھو اور افطار کرو اور نماز پڑھو اور سوؤ، وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارا طریقہ چھوڑ دے پس ان لوگوں نے کہا، اے اللہ! ہم نے اطاعت کی اور جو تو نے نازل کیا اس کا اتباع کیا۔)

"وبین التشبیہ والتعطیل" تشبیہ سے مشبہ کی طرف اشارہ ہے جو صفاتِ باری تعالیٰ کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور تعطیل سے معطلہ کی طرف اشارہ ہے جو صفات کا انکار کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیت: "لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر" (الشوریٰ:۱۱) سے دونوں فرقوں کا رد ہو جاتا ہے "لیس کمثلہ شیٔ" سے مشبہ کا اور "وھو السمیع البصیر" سے معطلہ کا۔ وقدمر تفصیلہ

"بین الجبر والقدر" یعنی بندہ نہ تو مجبورِ محض ہے جس کے قائل جبریہ ہیں اور نہ اپنے افعال کا خالق ہے جس کے قائل قدریہ ہیں، وقدمر فیما سبق۔

قولہ: "فھذا دیننا واعتقادنا ظاھراً وباطناً ونحن براءٌ الی اللہ تعالیٰ من کل من خالف الذی ذکرناہ وبیناہ ونسأل اللہ تعالیٰ ان یثبتنا علی الایمان ویختم لنا بہ ویعصمنا من الاھواء المختلفۃ والآراء المتفرقۃ والمذاھب الردیۃ مثل المشبھۃ والمعتزلۃ والجھمیۃ والجبریۃ والقدریۃ وغیرھم من الذین خالفوا السنۃ والجماعۃ وحالفوا الضلالۃ ونحن براءٌ منھم وھم عندنا ضلالٌ و اردیاء وباللہ

العصمة والتوفیق وصلی الله علی سیدنا محمد وعلیٰ آله واصحابه وسلم والحمد لله رب العالمین۔

ترجمہ: پس یہ ہے ہمارا دین وعقیدہ ظاہراً بھی و باطناً بھی، اور ہم اللہ تعالی کی بارگاہ میں ہر اس شخص سے برأت ظاہر کرتے ہیں جو اس کی مخالفت کرے جو ہم نے ذکر اور بیان کیا اور ہم اللہ تعالی سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کو ایمان پر قائم رکھیں اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرمائیں، اور ہمیں مختلف خواہشات، متفرق اور پراگندہ آراء وخیالات اور ردی و باطل مذاہب سے محفوظ رکھیں، مثلاً مشبہ، معتزلہ، جہمیہ، جبریہ اور قدریہ اور ان کے علاوہ ان لوگوں سے جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی اور گمراہی کو اپنا حلیف اور ساتھی بنایا اور ہم ان سے بری ہیں اور وہ ہمارے نزدیک گمراہ اور بدتر ہیں، حفاظت اور توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اللہ تعالی درود وسلام نازل فرمائیں ہمارے آقا حضرت محمد (ﷺ) پر اور ان کے آل واصحاب پر اور تمام تعریفیں اللہ کے لئے سزاوار ہیں جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

تشریح:۔ فهذا سے ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جن کو شروع کتاب سے آخر کتاب تک بیان فرمایا ہے۔

فرقوں کا تعارف:۔

المشبهة: وہ فرقہ جو اللہ تعالی کی صفات کو مخلوق کی صفات کے ساتھ تشبیہ دیتا ہے۔

المعتزلة: اس سے مراد عمرو بن عبید اور واصل بن عطاء الغزال اور ان کے اصحاب ہیں یہ حضرت حسن بصریؒ کی مجلس میں شرکت کیا کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے اصحاب سے علیحدہ ہو کر بیٹھنے لگے پھر جماعت ہی سے الگ ہو گئے تو حضرت قتادہؒ

وغیرہ کہا کرتے تھے: ''اولئك المعتزلة''۔

کہتے ہیں کہ واصل بن عطاء ہی نے مذہب معتزلہ کے اصول وضع کئے ہیں اور عمرو بن عبید جو حضرت حسن بصریؒ کا شاگرد تھا اس نے اس کی متابعت کی۔ پھر ہارون رشید کے زمانہ میں ابوالہذیل نے اس مذہب میں دو کتابیں تصنیف کیں اور مذہب اعتزال کی تشریح کی اور ''اصولِ خمسہ'' پر جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کی بنیاد رکھی۔

الجھمیة: یہ فرقہ جہم بن صفوان سمرقندی کی طرف منسوب ہے، اس نے صفات کا انکار کیا اور تعطیل کا قائل ہوا، اور اس نے اس کو جعد بن درہم سے اخذ کیا جس کی خالد بن عبداللہ القسری نے واسط میں عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کر دی تھی **وقد مر تفصيل القصة سابقاً۔**

معتزلہ بھی صفات کے منکر ہیں اور جہمیہ بھی لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اسمائے الٰہیہ کا (جن سے صفات کا ثبوت ہوتا ہے) انکار نہیں کرتے صرف صفات کے منکر ہیں، اور یہ حقیقت اسماء ہی کے منکر ہیں۔

چنانچہ جہمیہ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ یہ اہلِ قبلہ کے بہتر فرقوں میں شامل ہیں یا نہیں؟ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور یوسف بن اسباطؒ وغیرہ اسی کے قائل ہیں کہ فرقہ جہمیہ مسلمانوں کے بہتر فرقوں میں شامل نہیں ہے۔

مامون رشید کے زمانہ میں ان لوگوں کا زور بہت بڑھ گیا اور اسی زمانہ میں ان کے عقائد کی اشاعت ہوئی۔

الجبریه: یہ جہمیہ ہی کی ایک شاخ ہے، یہ بندوں کو مجبورِ محض کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بندوں کے افعال ان سے ایسے ہی غیر اختیاری طور پر ہوتے ہیں جیسے کہ وہ غیر اختیاری طور پر لمبے یا پستہ قد ہوتے ہیں۔ کبھی جبریہ کو قدریہ بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ یہ تقدیر کے ثابت کرنے میں غلو سے کام لیتے ہیں۔

القدریه: یہ فرقہ جبریہ کے بالکل برعکس ہیں، یہ تقدیر کے منکر ہیں اسی لئے ان

کو قدریہ کہتے ہیں اور بندوں کو ان کے افعال کا خالق کہتے ہیں۔قدریہ کی مذمت میں احادیث بھی وارد ہیں، چنانچہ سنن ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"القدرية مجوس هذه الامة ان مرضوا فلا تعودوهم وان ماتوا فلا تشهدوهم".

(قدریہ اس اُمت کے مجوس ہیں، یہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو اور یہ مرجائیں تو ان کے جنازہ پر نہ جاؤ)۔

ان کو مجوس کے مشابہ اس لئے فرمایا کہ مجوس دو خالق یعنی اہرمن (خالق شر) اور یزداں (خالقِ خیر) کے قائل ہیں اور یہ ان سے بھی بدتر ہیں کہ اَن گنت خالقوں کے قائل ہیں کیونکہ ان کے نزدیک ہر شخص اپنے افعال کا خالق ہے۔العیاذ باللہ تعالی

یہ تمام بدعات اور یہ سب فرقے ان فتنوں کے سبب پیدا ہوئے جن کی وجہ سے اُمت کا شیرازہ پارہ پارہ ہوگیا۔حضرت سعید بن المسیبؒ کا قول ہے کہ: پہلا فتنہ یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت کا حادثہ واقع ہوا تو اس نے اصحاب بدر میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔ پھر دوسرا فتنہ ہوا تو اس نے اصحاب حدیبیہ میں سے کسی کو نہ چھوڑا۔پھر تیسرا فتنہ ظاہر ہوا تو وہ لوگوں کو بے دست و پا ہی کر کے گیا۔(ولم ترتفع وللناس طباخ)

چنانچہ خوارج اور شیعہ فتنہ اولیٰ میں پیدا ہوئے۔اور قدریہ اور مرجئہ فتنہ ثانیہ میں ظاہر ہوئے اور جہمیہ وغیرہ فتنہ ثالثہ کے بعد نمودار ہوئے۔ان میں سے ہر ایک بدعت کا مقابلہ بدعت ہی سے کرتا ہے، شیعوں نے حضرت علیؓ کی شان میں انتہائی غلو کیا تو خوارج نے ان کے مقابلہ میں ان کی تکفیر کی، قدریہ نے وعید میں ایسا غلو کیا کہ بعض مومنین کو خلود فی النار کا مستحق گردان دیا تو مرجئہ نے ان کے مقابلہ میں بعض وعیدوں ہی کا انکار کردیا، معطلہ نے تنزیہ باری تعالی میں اس حد تک غلو کیا کہ صفات ہی کے منکر ہو گئے تو مشبہ نے صفات کے ثابت کرنے میں ایسا غلو دکھایا کہ تشبیہ کے مدعی بن بیٹھے، اور پھر ان سب نے

اپنے اپنے خودساختہ نظریات کے لئے ایسے ایسے دلائل اور مسائل اختراع کئے جن کا کتاب وسنت اور نصوص شرعیہ میں کوئی وجود ہی نہیں۔

اے اللہ! تو ہم کو تمام گمراہیوں، فتنوں بدعات وخرافات، افراط وتفریط اور زیغ وضلال سے محفوظ اور اہلِ سنت والجماعت کے جادۂ اعتدال پر قائم رکھ جو تیری پاک کتاب اور تیرے آخری رسول ﷺ کی سنت کے مطابق ہے۔

اللهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارِنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه ۔سُبحٰن رَبِّكَ رَبِّ العزةِ عما يَصِفُونَ وسلامٌ على المرسلين والحمد لله رب العالمين۔

احقر سید محمد غیاث الدین مظاہری الہ آبادی

ابن

سید عبدالصمد صاحب غفراللہ لہما بفضلہ وکرمہ

۹ر شوال المکرم ۱۴۰۹ھ

مطابق ۱۵ر مئی ۱۹۸۹ء

یوم الاثنین



ترجمہ وتسہیل

شرح شذور الذہب

لابن ہشام الانصاری

مترجم و شارح

مولانا عبد الناصر صاحب

مولانا خورشید انور صاحب

ناشر

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ ۔ کراچی ۱



احمل الحواشی

شرح اردو

اصول الشاشی

تالیف

حضرت مولانا جمیل احمد صاحب سکروڈوی

استاذ دار العلوم دیوبند

ناشر

قدیمی کتب خانہ مقابل آرام باغ کراچی

الفوز العظیم

اردو شرح

اَلفَوزُ الکَبِیر

مؤلفہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

شارح: مولانا خورشید انور قاسمی فیض آبادی

پچاس سے زائد اہم کتابوں کے منتخب علوم اور محقق اساتذۂ کرام کے فیوض وافادات سے مزیّن "اَلفَوزُ الکَبِیر" کی نہایت جامع اردو شرح

ناشر

قدیمی کتب خانہ۔ مقابل آرام باغ۔ کراچی

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

میں تو اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مثالی اخلاق

تالیف

مولانا محمد ہارون معاویہ

فاضل جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

واستاد مدرسہ عربیہ قاسم العلوم میرپور خاص

قدیمی کتب خانہ

آرام باغ کراچی

ڈاکٹر العریفی کی انتہائی دلچسپ اور مفید کتاب
اِسْتَمْتِعْ بِحَيَاتِكَ کا مکمل اردو ترجمہ

زندگی کو خوشگوار بنائیے

اُسوۂ رسول اکرم ﷺ اور اکابر ملت کے طرزِ عمل کی روشنی میں معاشرتی زندگی کو خوشگوار بنانے کے طریقے

مصنف: ڈاکٹر محمد بن عبد الرحمٰن العریفی

مترجم: معراج محمد بارق

قدیمی کتب خانہ
آرام باغ کراچی

تہذیب العقائد

اردو ترجمہ و شرح

عقائدِ نسفی

متن عقائد نسفی کا ترجمہ و شرح

مع

ضروری مباحث ورد مذاہب باطلہ

شارح

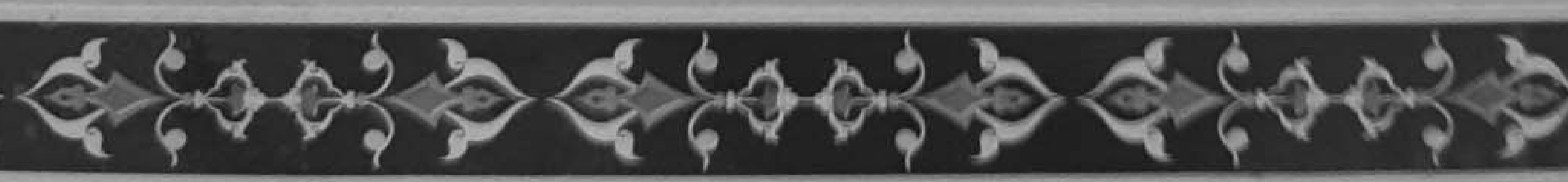
مولانا محمد نجم الغنی خان رح

ترتیب جدید و اضافہ عنوانات

مولانا شمس الحق اظہر صاحب

قدیمی کتب خانہ

مقابل آرام باغ کراچی



قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی